مُنتخبات

اُصولِ تفسیر و علومِ قرآن

اُردو ترجمہ

یتیمۃ البیان فی شیئٍ من علومِ القرآن

تالیف

مُحدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ

ترجمہ

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مکتبہ بینات

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

منتخبات

اُصولِ تفسیر و علومِ قرآن

اردو ترجمہ

یتیمۃُ البیان فی شیئٍ من علومِ القرآن

تالیف

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ

ترجمہ

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مکتبہ بینات
جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مترجم

نحمده ونصلي ونسلّم على رسوله الكريم، وبعد:

پیش نظر کتاب محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی علوم قرآن کے موضوع پر عربی تالیف "يتيمة البيان" کا اردو ترجمہ ہے، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے زمانۂ تدریس میں اپنے شیخ استاذ امام العصر محدث کبیر مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "مشكلات القرآن" کا مقدمہ ۱۳۵۶ھ میں "يتيمة البيان لمشكلات القرآن" کے نام سے تحریر فرمایا جو اس کتاب کے ساتھ "مجلس علمی" کی طرف سے اب تک شائع ہوتا رہا، اس کے چالیس سال بعد ۱۳۹۶ھ میں یہی مذکورہ بالا مقدمہ مزید علمی نکات کے اضافے اور نظر ثانی کے بعد "يتيمة البيان في شيئ من علوم القرآن" کے نام سے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کی طرف سے علیحدہ مستقل کتابی صورت میں شائع ہوا، یہ اضافات دراصل وہ محاضرات تھے جو ۱۳۷۹ھ کے ماہ رمضان میں آپ نے طلبہ کرام کے سامنے پیش کیے تھے۔

کسی ذی علم وشعور سے یہ بات مخفی نہیں کہ علوم القرآن کا موضوع انتہائی وسیع ہے اور اس کا احاطہ کسی بھی بشر کے لیے ممکن نہیں، متقدمین ومتاخرین علمائے امت واکابرین نے اس موضوع بلکہ اس کی جزئیات پر بہت کچھ لکھا، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر اہم باتوں کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں خاص طور درج ذیل امور کے متعلق سیر حاصل قیمتی جواہر پارے قلم بند فرمائے:

① تفسیر قرآن میں اہم اور معتبر ذریعہ تفسیر۔

② چند مطبوعہ مفید تفاسیر کی خصوصیات وامتیازات۔
③ مفسر کی شرائط اور تفسیر بالرأی۔
④ تفسیر قرآن میں صوفیاء کے اقوال، فرقہ باطنیہ اور صوفیاء کی تفسیری تاویلات میں فرق۔
⑤ تفسیری میدان میں اکابر علماء ہند کے کارہائے نمایاں نیز اہل باطل واہل حق کی تفاسیر کی نشاندہی۔
⑥ قرآن کریم کی وجوہ اعجاز کا تفصیلی اور تحقیقی بیان۔
⑦ قرآن کریم کے چند تفسیری نکات ولطائف امام العصر علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے فرمودات کی روشنی میں۔

جامعہ علوم اسلامیہ سے شائع ہونے والے، قرآن کریم وسنت نبویہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی تعلیمات کے علمبردار ماہ نامہ ''بینات'' میں یہ ترجمہ قسط وار شائع ہوتا رہا، اب اسے مکمل کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے، کسی بھی کتاب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا ایک مشکل کام ہے اور پھر خاص طور پر ''یتیمۃ البیان'' علوم القرآن کے ساتھ ساتھ والد ماجد حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی عربی ادب کا ایک بے مثال شاہ کار ہے، اس لیے اسے اردو قالب میں ڈھالنا آسان نہ تھا، یہ محض اللہ کے فضل اور توفیق سے ایک ابتدائی کوشش ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور اسے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے استاذ وشیخ علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے اور ہمیں اکابرین امت کے علمی ذخیروں سے استفادہ کی کامل توفیق عطا فرمائے۔

آمین بحرمة النبي الكريم

سید سلیمان یوسف بنوری

ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ

فہرست مضامین

تقــدیم

الحمدلله العلی العظیم والصلوة والسلام علی حبیبه
الکریم، محمد وآله وأصحابه أجمعین، و بعد:

یہ محض اللہ تعالی کی توفیق ہے کہ ہم اس قیمتی موتی اور عظیم خزانے کو علما وطلبا کی خدمت میں پیش کررہے ہیں جو "یتیمة البیان فی شیئ من علوم القرآن" کے نام سے موسوم ہے، پیش نظر رسالہ میرے محبوب شیخ محدث کبیر علامۃ العصر مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کا تالیف کردہ ہے، ان جیسی شخصیت آنکھوں نے نہیں دیکھی بلکہ خود انہوں نے اپنی جیسی شخصیت کہیں نہیں پائی ہوگی۔

یہ اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے، یہ وہ گرانمایہ تصنیف ہے جس میں مؤلف نے علوم قرآنی کے متعلق قابل قدر مباحث ان حضرات کے لیے جمع فرمائے ہیں جو علم کے پیاسے ہیں، گہرے سمندروں سے قیمتی جواہر اکٹھے کرکے اس کتاب میں ودیعت کیے ہیں، قاری کتاب کو چاہیے کہ وہ اس رسالہ میں ڈوب جائے تو اس کو بھی ایک سمندر پائے گا اور اس علمی مذاق کو بھی چکھ لے، اس لیے کہ جو چکھتا نہیں اس کو ذائقہ معلوم نہیں ہوسکتا، نفیس تفاصیل اور طویل مباحث کو اس رسالہ میں انتہائی خلاصہ واختصار کے ساتھ پیش کردیا گیا ہے۔

باری تعالی سے دعا ہے کہ ہمیں ان جیسی کتب سے استفادہ کرنے اور اپنی کتاب کی شب وروز تلاوت کرنے، نیز احکامات قرآن پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وهو الموفق والمیسر

وصلی الله تعالی علی خیر خلقه محمد وآله وصحبه أجمعین

ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار
خادم جامعہ علوم اسلامیہ کراچی
۱۴۱۶/۱/۲۳ھ - ۱۹۹۵/۶/۲۱ء

کلماتِ شکر

خدا تعالیٰ کا شکر واحسان کہ قلبی مشغولیت اور انتہائی قلت وقت کے باوجود میں نے اپنے اس رسالہ "یتیمة البیان فی شیئ من علوم القرآن" کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی توفیق پائی،

اور مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میرے رفیق محبوب استاذ محمد حبیب اللہ مختار کی معاونت نیز تصحیح وطباعت وغیرہ کے امور میں ان کی نگرانی نے ہی میرے ارادہ کو قوت بخشی۔

اسی طرح صاحب مطبع شاہد حسین صاحب کی طباعت کی محنت نہ ہوتی تو مجھے یہ توفیق حاصل نہ ہوتی، میں تہہ دل سے ان دونوں حضرات کا ممنون ہوں، اللہ ان کو بہترین صلہ عطا فرمائے، آمین۔

یہ کتاب میں اس امید پر پیش کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ یہ چھوٹی سی کوشش اس شخص کے لیے نفع مند بنائے جو قرآن کریم کے ساتھ فکر وتدبر کا تعلق رکھتا ہو، خداوند بزرگوار ہی احسان وانعام فرمانے والے اور ہر نیک کام کی توفیق دینے والے ہیں۔

محمد یوسف بنوری

جمعہ/۲۱ رمضان المبارک/۱۳۹۶ھ

مقدمہ طبع جدید

الحمد لله حمدا يستجلب رضى الله سبحانه وتعالى ، والصلاة والسلام على سيدنا الرسول محمد ما يكافئ منزلته العليا ، وعلى آله وصحبه وتبعه دائما أبدا، وبعد:

اب سے چالیس سال قبل میں نے امام العصر محدث کبیر حضرت علامہ کشمیریؒ (متوفی ۱۳۵۲ھ) کی کتاب "مشکلات القرآن" کے لیے ایک مقدمہ تحریر کیا تھا جو کئی اہم مباحث پر مشتمل تھا، اس مقدمہ کا مرکزی موضوع امام العصرؒ کے نظریہ کے مطابق اعجاز قرآنی کی تشریح اور قرآن کریم کے مضامین میں فہم وبصیرت کے لیے مفید بنیادی قواعد کا بیان تھا، اس کے علاوہ کچھ دیگر امور بھی اتفاقاً ذکر ہوئے تھے، کچھ عرصہ سے میں سوچ رہا تھا کہ اس مقدمہ کو ایک مستقل رسالہ کی شکل دے دوں اور جن مباحث کو قرآن کریم کے فہم سے بلاواسطہ تعلق نہ ہو ان کو حذف کردوں اور چند دیگر موضوعات کا بطور تکملہ اگرچہ مختصر طور پر ہو ذکر کردوں، مجھے معلوم ہے کہ میرا ارادہ اس رسالہ میں تمام مباحث کی تفصیل کا بیان ہرگز نہ تھا، بلکہ منتشر موضوعات کے متعلق صرف اشارات پر اکتفا میرا مقصود تھا، پھر یہ مقدمہ بھی انتہائی جلدی میں لکھا گیا ہے بلکہ گویا فی البدیہہ یکجا کیا گیا اس لیے کہ "مشکلات القرآن" کی طباعت اپنے انتہائی مراحل میں تھی اور خود مجھے بھی حج کا سفر اور چند دیگر اسفار[1] درپیش تھے، لیکن جب یہ مقدمہ طبع ہوکر منظر عام پر آیا تو

(۱) یہ سفر حج بیت اللہ اور دربار رسول ﷺ کی حاضری سے شروع ہوا تھا، پھر اس کے بعد "مجلس علمی" کی طرف سے مولانا سید احمد رضا بجنوری حفظہ اللہ [مؤلف انوار الباری شرح صحیح بخاری] کی رفاقت میں علامہ زیلعیؒ کی "نصب الراية لأحاديث الهداية" اور امام العصر علامہ کشمیریؒ کی "فيض البارى على شرح البخارى" کی طباعت کے سلسلے میں قاہرہ جانا ہوا۔

طوالت کی بنا پراس کی حیثیت کتابی مقدمہ کی نہ رہی تھی، پھر اس مقدمہ کی طباعت کے بعد حافظ برہان الدین زرکشیؒ کی "البرھان فی علوم القرآن" اور معاصر علما میں سے شیخ زرقانیؒ کی "مناھل العرفان" شائع ہوئی، اسی طرح اعجاز قرآنی کے متعلق بھی مختلف کتب منصۂ شہود پر آئیں، جو اگر مجھے اس مقدمہ کی تالیف کے وقت میسر ہو جاتی تو ان سے میں بھی استفادہ کرتا، لیکن اب جبکہ ہمت کمزور ہوگئی ہے اور قویٰ میں ضعف آچکا ہے، اسی طرح فرصت وقت بھی مہلت نہیں دیتی اور اعمال واشغال مزید سے مزید تر ہو رہے ہیں اور خوف کی حالت میں شعر گوئی کہاں ممکن ہے۔

ان تمام امور کے پیش نظر اس مقدمہ کی تطویل کے بجائے مختصر حذف وزیادت [1] کے بعد دوبارہ اشاعت کی جارہی ہے، میں نے اس مقدمہ کو اب مستقل رسالہ کی شکل دے دی ہے اور اس کا نام میں نے "یتیمۃ البیان فی شیئ من علوم القرآن" تجویز کیا ہے۔

خداوند کریم سے استدعا ہے کہ وہ اس رسالہ کو اپنے موضوع کے متعلق کارآمد بنائے اور اس کے اختصار کے باوجود قارئین طلبا کے لیے نفع بخش بنائے اور اس رسالہ کو اپنے فضل واحسان سے محض رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنائے۔

وھو ولی کل توفیق ونعمۃ ، وھو حسبنا ونعم الوکیل

محمد یوسف بن سید محمد زکریا بنوری حسینی

خادم مدرسہ عربیہ اسلامی کراچی پاکستان

جمعہ/ ۸ شعبان/ ۱۳۹۶ھ

۶/ اگست/ ۱۹۶۸ء

---

(۱) یہ اضافات وہ محاضرات تھے جو طلبہ کرام کے سامنے ماہ رمضان ۱۳۷۹ھ میں پیش کیے گئے تھے، ان محاضرات کو میں نے مختصراً قلم بند کرلیا تھا: ① اسماء قرآن اور لفظ "قرآن" کی تحقیق۔ ② قرآن کریم کی حقیقت اور مسئلہ "کلام الٰہی"۔ ③ قرآن کریم باری تعالیٰ کے لامتناہی علوم کا خزانہ اور علماء امت کی قرآن کے متعلق کاوشیں۔ ④ چند مطبوعہ اور مفید تفاسیر کی خصوصیات وامتیازات کا بیان۔

مقدمہ طبع اوّل

الحمد لله الذي أنزل على عبده الكتاب ولم يجعل له عوجا ؛ ففتح به قلوبا غلفا ، وعيونا عميا ، و آذانا صما، فأقام به حججا ، والصلاة والسلام على النبي الأمي الهاشمي القرشي ، أفصح من نطق بالضاد ، و أوتي جوامع الكلم و مصابيح الدجى ، وعلى آله وصحبه وعلماء أمته وهداة ملته ، الذين كابدوا للدين، وغاصوا لأجله لجحا فنشروا القرآن و السنة ، و أنفذوا وسعهم في أثرة العلم ودين الحق فوصلوا كتدا وثبجا ، فهدوا إلى الطيب من القول ، وأصلحوا الفساد و دفعوا الشر عن البسيط وأقاموا عوجا ، عليهم رحمة الله و بركاته ما دامت العيون تبتهج بباهر آيات الله ، والقلوب تشتفي بمعجز كتاب الله وتطمئن به ثلجا، أمّا بعد :

علوم القرآن کے متعلق یہ چند فصول میں نے انتہائی عجلت میں جمع کی ہیں تا کہ کلام وبیان کے اختصار وتلخیص کے ساتھ مختلف مدرس وجامعات سے تعلق رکھنے والے طلبا ساتھیوں کو علوم القرآن کے متعلق کچھ رہنمائی حاصل ہوجائے ، مجھے اعتراف ہے کہ علوم قرآنی ایسا نا پیدا کنار گہرا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جس کے نشیب وفراز میں امت کے چنیدہ اشخاص تک کی عقول سرگرداں وحیران اور ساحل تک پہنچنے میں قاصر ہی رہی ہیں ، اسی طرح ان علماء امت نے گذشتہ صدیوں میں بھی اس کی موجوں میں غوطے کھا کر اس اتھاہ گہرائیوں سے بیش بہا انمول موتی اکھٹے کیے ہیں۔

سمجھیے یہ بھی علم ہے کہ یہ وافر ذخیرۂ علم جو حافظ زرکشیؒ، حافظ سیوطیؒ وغیرہ ارباب علم قرآن کے قلموں کی جانفشانی سے ہمارے سامنے بھرا پڑا ہے اور علامہ جرجانیؒ، علامہ زمخشریؒ، ابن منیرؒ، تقی الدین سبکیؒ، تاج الدین سبکیؒ، بہاء الدین سبکیؒ، ابن قیمؒ، سکاکیؒ اور تفتازانیؒ وغیرہ علمائے بلاغت نے بلاغت قرآنی کے جو لطائف حاصل کیے ہیں، وہ ایسے علوم وحقائق ہیں جنہوں نے فکر ونظر کو دنگ کردیا ہے اور متأخرین صغار اہل علم تو کجا! کبار اہل علم بھی ان مذکورہ حضرات کے علمی تفوق کے سامنے دہشت زدہ ہیں، ان بہتے بادلوں کے سامنے یہ چند معمولی سے قطرے کیا وزن رکھتے ہیں؟ اور برستی بارش کے سامنے ان چھینٹوں کی کیا قدر و قیمت ہوسکتی ہے؟ لیکن مجھے اس قدر کہنا کافی ہے کہ ان علماء کی پیش کردہ کتب، سمندر کی موجیں اور بڑی نہروں کے تھپیڑے ہیں تو یہ ان کی بارشوں کی شبنم کے قطرے ہیں، جو ہم جیسے لوگوں کی ان کوتاہ عقول کو کافی ہیں جن کی کشتیاں اس وسیع وعریض علمی سمندر میں چلنے سے قاصر ہیں۔

امید ہے کہ ان مختصر قطروں کے ذریعے اللہ تعالی ہمارے نئے دور کے افراد کو نفع مند فرمائے، اسی طرح یہ بھی امید ہے کہ قارئین محترم ہمارے زمانے کے اہل علم کی پیش کردہ عمدہ مباحث بھی پائیں گے جو مباحث اللہ تعالی نے اپنے فضل وکرم سے ان متأخرین کے لیے سمجھنا فرمادیے تھے، اور یہ سب اس حدیث نبوی کا مصداق ہے جس میں آپ ﷺ کا فرمان گرامی یوں منقول ہوا کہ:

"مثل أمتي مثل المطر لا يدري أوله خير أم آخره"

میری امت کی مثال بارش کی مانند ہے معلوم نہیں کہ اس کا پہلا حصہ بہتر ہے یا پچھلا حصہ، امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل فرمائی ہے، ایک اور حدیث جو حضرت جعفر رحمہ اللہ نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے یوں نقل فرمائی ہے کہ:

"أبشروا و أبشروا، إنما مثل أمتي مثل الغيث لا يدري آخره خير أم أوله، أو كحديقة أطعم منها فوج عاما

، ثم أطعم منها فوج عاما ، لعل آخرها فوجا أن يكون
أعرضها عرضا ، وأعمقها عمقا ، وأحسنها حسنا...الخ“

خوش خبری لو! خوش خبری لو! میری امت کی مثال بارش کی مانند ہے نہ معلوم اس کا پچھلا حصہ بہتر ہو یا پہلا حصہ، یا اس باغ کی مانند ہے جس سے ایک سال ایک قوم نے کھایا پھر ایک سال دوسری قوم نے کھایا، شاید کہ بعد میں آنے والی قوم ان سے زیادہ چوڑی چکلی ہو، ان سے زیادہ گہرے بدن والی اوران سے زیادہ حسین وخوب صورت ہو، اس حدیث کو امام رزین نے روایت کیا ہے۔

اس وہاب کریم سے ذات امیدوار ہوں کہ اس مختصر رسالے کو اتنا ہی نفع بخش کر دے جتنا نفع ان بڑی بڑی کتب سے امت کو پہنچا، واللہ ذو الفضل العظیم۔

اسماء قرآن اور لفظ ''قرآن'' کی تحقیق

صاحب کتاب ''الإتقان فی علوم القرآن'' کا بیان ہے کہ ابوالمعالی شیدلہؒ نے اپنی کتاب ''البرھان'' میں قرآن کے اسماء کو شمار کیا تو تعداد پچپن کو جا پہنچی، نیز صاحب ''مناھل العرفان'' لکھتے ہیں کہ علامہ جزائریؒ نے اپنی کتاب ''التبیان'' میں اسماء قرآنی کی تعداد نوے سے زائد نقل کی ہے۔

میرے نزدیک لفظ ''القرآن'' تو قرآن کریم کا علم شخصی ہے اور دیگر اسماء قرآن کریم کی صفات ہیں جن میں مشہور صفات ''الکتاب''، ''الفرقان''، ''التنزیل'' اور ''الذکر'' ہیں، چنانچہ سورہ یوسف، سورہ شعراء، سورہ قصص اور سورۂ دخان وغیرہ میں ''الکتاب'' کو صفت ''المبین'' کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اور سورۂ حم سجدہ (سورہ فصلت) میں ''العزیز'' کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اسی طرح سورۂ فاطر میں ''المنیر'' اور سورۂ زمرہ میں ''المتشابہ'' کے ساتھ ''الکتاب'' کو متصف کیا گیا ہے، اسی طرح سورۂ فصلت میں ''فصّلت'' بھی ''الکتاب'' کی صفت بیان کی گئی ہے، نیز سورۂ ہود میں باری تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿کتاب أحکمت اٰیاته ثمّ فصّلت﴾ [ھود:۱]

اور میں سمجھتا ہوں کہ ''الفرقان'' اگرچہ اب وصف ہو چکا ہے لیکن یہ بھی لفظ ''القرآن'' کی طرح علم شخصی ہی تھا، پھر اس میں وصفیت کا غلبہ ہوا جس کی بنا پر اس کو وصف ہی شمار کیا جانے لگا، اس بات کی کچھ تائید باری تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی جس میں قرآن کے لیے لفظ ''الفرقان'' استعمال کیا گیا ہے:

﴿تبارك الذی نزّل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا﴾ [الفرقان:۱]

حاصل بحث یہ ہوا کہ قرآن کریم کا علم شخصی لفظ ''القرآن'' ہے جیسا کہ لفظ ''اللہ'' خداوند تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اور لفظ ''فرقان'' کا اطلاق قرآن کریم کے لیے ایسا ہی ہے جیسا کہ لفظ ''رحمٰن'' کا اطلاق ذات باری کے لیے ہوتا ہے، چنانچہ لفظ ''رحمٰن'' بھی اگرچہ حقیقتاً وصف ہے لیکن علم کے قائم مقام استعمال ہوا ہے جس کی تائید باری تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے:

﴿قل ادعوا الله أو ادعوا الرّحمٰن أيّا ما تدعوا فله الاسماء الحسنىٰ﴾ [بني إسرائيل: ۱۱۰]

اسی طرح لفظ ''الکتاب'' پر بھی علمیت (جیسا کہ چند آیات سے معلوم ہوتا ہے) غالب ہوگئی ہے، چنانچہ فقہاء اور اصولیین کی اصطلاح میں ''الکتاب'' کا قرآن کریم پر اطلاق بطور علم کے ہوتا ہے۔

پھر لفظ قرآن کے مشتق ہونے یا نہ ہونے کے متعلق بھی علماء کا اختلاف ہے، چنانچہ بیہقیؒ، خطیبؒ اور ایک جماعت کی روایت کے مطابق امام شافعیؒ کے ہاں مختار بات یہ ہے کہ لفظ قرآن علم شخصی غیر مشتق ہے اور اس کتاب کے ساتھ خاص ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، نیز لفظ ''القرآن'' معرفہ غیر مہموز ہے، یعنی لام کلمہ حرف ہمزہ نہیں بلکہ الف ہے اور قراء سبعہ میں سے ابن کثیرؒ نے بھی اسے یوں ہی پڑھا ہے، چنانچہ ان حضرات کے نزدیک لفظ قرآن ''القرأة'' سے ماخوذ نہیں ہے۔

امام ابوالحسن اشعریؒ اور دیگر بعض حضرات کے نزدیک لفظ قرآن دراصل مشتق ہی تھا، لیکن بعد میں علمیت کا غلبہ ہوگیا، پھر ان حضرات کا آپس میں لفظ قرآن کے مشتق منہ کی تعیین میں اختلاف واقع ہوا۔

۱- امام اشعریؒ فرماتے ہیں کہ لفظ قرآن ''قرنت الشيء بالشيء يعني إذا ضممته'' سے ماخوذ ہے، اس میں حرف نون اصلی ہے، اور وجہ تسمیہ یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں، آیات اور حروف کا باہمی ربط اور تعلق اس طور پر ہے کہ گویا ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں، اسی بناء پر اسے قرآن کہا جاتا ہے، لیکن اس قدر وجہ تسمیہ کافی نہ ہوگی اس لیے کہ اس سبب میں کوئی ایسی

زائد خاص فضیلت ثابت نہیں ہو رہی، ہاں! یوں کہا جائے کہ کلمات قرآنی کا آپس میں ربط وتعلق ایسے بلیغ اسلوب اور عجیب ترتیب وتناسق کے ساتھ ہے کہ قرآن صرف وہی ہے دیگر تمام انواع کلام کہ اس معنی میں مربوط ومتناسق نہیں ہیں، ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کا رجحان بھی اسی قول کی طرف تھا چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ فارسی میں قرآن کے معنی ''نشست'' کے ہیں، یعنی کلمات کا آپس میں عجیب فصاحت وبلاغت کے ساتھ ربط وتعلق۔

۲-مشہور لغوی امام فراءؒ فرماتے ہیں کہ قرآن ''قرائن'' سے مشتق ہے، اسکی وجہ تسمیہ وہ یوں بیان فرماتے ہیں کہ اس کی آیات آپس میں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں، مذکورہ بالا دونوں اقوال کی روشنی میں لفظ قرآن کا نون حرف اصلی ہوگا اور یہ مشتق منہ غیر مہموز ہے، اور ان صورتوں میں قرآن کا وزن ''فعاّل'' ہوگا نہ کہ ''فعلان''

۳-امام زجاجؒ نحوی کہتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ لفظ قرآن مہموز ہے، ہمزہ کو تخفیفا ترک کر دیا گیا ہے اور ہمزہ کی حرکت ماقبل ساکن حرف راء کو دے دی گئی ہے، ائمہ لغت کی ایک جماعت نے اسی قول کو اختیار کیا ہے جن میں ابوعبیدہؒ، معمر بن المثنیؒ لحیانیؒ اور قطربؒ وغیرہ حضرات سرفہرست ہیں۔

پھر ان علماء لغت کے درمیان ایک اور اختلاف واقع ہوا:

۱-امام لحیانیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن لفظ ''غفران'' کی طرح مصدر ہے اور قرآن کو ''شیئ مقروء'' کا نام دینا مفعول کو مصدر کا نام دینے کے قبیل سے ہے، اس سے ثابت ہوا کہ قرآن ''قراءۃ'' سے مشتق ہے۔

۲-بعض حضرات کے نزدیک قرآن ''قرء'' سے ہے جو بمعنی جمع کرنے کے مستعمل ہے، چونکہ قرآن کریم میں سورتوں کو آپس میں جمع کر دیا گیا ہے اس لیے قرآن کہلاتا ہے۔

۳-امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم گذشتہ انبیاء پر نازل شدہ کتب کے ثمرات وفوائد کو جمع کرتا ہے اس لیے قرآن کہلاتا ہے۔

راقم ان تمام اقوال کے پیش نظر یوں کہتا ہے کہ چونکہ قرآن کریم آخرت کے معاملات

کے بارے میں ضرورت طلب امور کو جمع کرتا ہے اسی طرح دنیوی فلاح وسعادت مندی کے ساتھ ساتھ اخروی کامیابی اور نجات کے وسائل کو بھی جمع کرتا ہے اس لیے قرآن کہلاتا ہے (اس صورت میں "قرء" سے مشتق ٹھہرایا جائیگا)۔

اور جب "قراءۃ" سے مشتق مانا جائے تو وجہ تسمیہ یہ ہوسکتی ہے کہ قرآن کریم دنیا میں ہر پل، ہر لمحہ، دن رات اور صبح شام برابر پڑھا جارہا ہے (یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ قرآن کریم کی محض تلاوت بھی مطلوب ہے اور پڑھنے والے کے لیے اجر کا باعث ہے) اس لیے قرآن کہلاتا ہے، یا پھر اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ پڑھی جانے والی کتاب تو درحقیقت قرآن ہی ہے، اس کے علاوہ دیگر کتب اس طرح نہیں پڑھی جاتیں، نیز اس لیے بھی کہ قرآن کریم اپنے حروف، کلمات، سورتوں اور آیات کے اعتبار سے جس تناسق، نظم وضبط اور معجزانہ اسلوب ومعیار پر ہے دیگر تمام کتب اس معیار اور ان اوصاف سے عاری ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ قرآن درحقیقت "قرء" یا "قراءۃ" ہر دو سے انہی عمدہ معانی کے لیے مشتق ٹھہرایا جاتا ہے، پھر اس کے وصفی معنی پر علمی معنی غالب ہوا وہ اس طرح کہ کلام اللہ جو قدیم ہے اور خاتم النبیین ﷺ پر نازل ہوا، جس کو حضرت جبرائیل علیہ السلام حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے لے کر اترے، جو مصاحف کے اوراق پر ثبت کردیا گیا، جس کی کسی بھی سمت سے باطل نہیں پھٹک سکتا اور جو حکمت ودانائی سے موصوف ومحمود ذات کی طرف سے اترا ہے اس کے لیے یہ لفظ "القرآن" علم شخصی اور ذاتی نام ہوگیا۔

رہا الف لام (تعریف) جو لفظ "القرآن" کا جزء ہے تو یہ اس لفظ قرآن کی اصل وضع کی رعایت رکھتے ہوئے داخل ہوا ہے، اس لیے کہ دراصل یہ عام وصفی معنی کے لیے وضع کیا گیا تھا، مذکورہ بالا اقوال کے مدنظر ہماری پیش کردہ رائے درمیانی راہ ہے جو تمام اقوال کی جامع بھی ہے اور موزوں بھی ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہوا کہ لفظ قرآن (علی اختلاف المذاہب) "قرن"، "قرء" یا "قراءۃ" سے مشتق ہے، ان تمام صورتوں کی وجہ تسمیہ معقول اور واضح ہے، مگر اتنی بات ہے کہ

علمیت کے غلبے کی وجہ سے معنی وصفیت جاتا رہا، لیکن اس کے باوجود لفظ قرآن اپنے اصلی وصفی معنی سے جو اس کے مناسب بھی ہے خالی نہ سمجھا جائے گا، اب اگر چہ معنی علمیت غالب ہے، لیکن اصل وجہ تسمیہ بیان کرتے وقت اس وصفی معنی ہی کو مراد لیا جائے گا، اسی علمیت کے غلبے کے نتیجے میں کبھی کبھی ان بلند پایہ معانی اور باعتبار اشتقاق کے حاصل شدہ مذکورہ بالا صفاتی معانی ومطالب سے ذہول ہو ہی جاتا ہے ایسی صورت میں معنی علمیت اول درجے پر سمجھا جانے لگتا ہے اور معنی وصفیت دوسرے درجے پر، جب فصیح وبلیغ ادباء کی تعبیرات میں ان عمدہ معانی کی رعایت ہوتی ہے اور ان کا کلام عام لوگوں کے مقابلے میں انوکھا اور ممتاز معلوم ہوتا ہے تو پھر قرآن کریم جو اعجاز کی اعلیٰ حد پر ہے اور اہل حقیقت ومجاز جس کی غایت تک پہنچنے سے قاصر ہیں، اس کی تعبیرات میں ان معانی کی رعایت رکھنا از حد ضروری ہے۔

قرآنی تعبیر میں ذرا غور کیا جائے تو خوش ذوقی کی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کو ان تمام صفات کے ساتھ متصف کیا جا سکتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں قرآن کے لیے ارشاد فرمایا ہے، چنانچہ "حکیم"، "کریم"، "عظیم"، "مبین" اور "مجید" وغیرہ تمام الفاظ قرآن کی صفت واقع ہو سکتے ہیں، اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب قرآن حکیم، قرآن کریم، قرآن مجید، قرآن عظیم اور قرآن مبین ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف سورتوں میں بیان فرمایا ہے، اور اسی طرح کئی سورتوں میں لفظ کتاب کو صفت مبین کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے، حم سجدہ کی آیت مبارکہ "وإنّه لكتابٌ عزيز" میں لفظ "عزیز" کو اسی طرح سورۂ ص کی آیت "كتاب أنزلناه إليك مبارك" میں "مبارك" کو قرآن کی صفات میں سے شمار کروایا گیا ہے، اسی طرح قرآن کریم کے تمام اسماء اور اس کی تمام صفات میں قرآنی تعبیر کی نکتہ آفرینی مدنظر رکھی جا سکتی ہے اور ان تمام اسماء وصفات کے خصائص کی رعایت بھی رکھی جا سکتی ہے، لیکن ان باریک مقامات ولطائف کی انتہا کو پہنچنا انسانی عقل کے بس میں نہیں:

رتب تقصر الأماني حسرى

دونها ماوراءهن وراء

قرآن کریم کی حقیقت اور مسئلہ "کلام الٰہی"

امت مسلمہ کے محققین کو ان دقیق مباحث کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عباسی خلیفہ مامون رشید کے زمانے میں معتزلہ کو کافی شہرت اور عزت ملی، احمد بن داود معتزلی (جوفرقہ اعتزال کے صدر واصل بن عطا کے ہم مشرب و ہم مسلک ہونے کے ساتھ ساتھ ہیاج بن العلا سلمی اور یحییٰ بن اکثم قاضی کے ساتھی اور ہم نوا تھے) خلیفہ مامون رشید کے مقرب اور معزز لوگوں میں گنے جاتے تھے، اور خلیفہ مامون بھی احمد بن داود سے بہت زیادہ متأثر تھے اور ان ہی کی وجہ سے مسئلہ خلق قرآن میں بھی معتزلہ کے عقیدے کی طرف میلان رکھتے تھے۔

احمد بن داود نے اس قربت کو غنیمت جانتے ہوئے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور خلیفہ مامون کو اس بات پر آمادہ کیا کہ مسئلہ خلق قرآن میں محدثین کرام کا امتحان لیں اور ان کی رائے معلوم کریں پھر جو معتزلہ کے موقف کی مخالفت کرے اس کو سزا دی جائے، چونکہ معتزلہ اور محدثین کے درمیان فکری اور بنیادی اصولوں پر اختلافات تھے، اسی بنا پر ان کی آپس کی شورش اور دشمنی بھی مشہور تھی اور یہ دونوں جماعتیں دو الگ الگ راہوں پر گامزن تھیں، اسی سلسلہ کی ایک کڑی امام احمد بن حنبلؒ کی آزمائش اور ان کا امتحان بھی ہے، حتی کہ کتب تاریخ میں اس تاریخی واقعہ کا عنوان ہی "محنة أحمد" (امام احمدؒ کی آزمائش) قرار پایا، جس میں اسلامی تاریخ کی ان جلیل القدر بزرگ ہستیوں کا تذکرہ ہے جن کے ساتھ ظلم وستم اور عداوت کا کھلا معاملہ کیا گیا تھا۔

یہ فتنہ اس قدر مشہور ہوا کہ عہد صدیقی کے واقعۂ ارتداد اور حضرت عثمان بن عفانؓ کے واقعہ شہادت جیسے واقعات میں اس کا شمار ہونے لگا، یہ واقعہ مامون رشید کے دور میں شروع ہوا اور

معتصم کے بعد واثق کے عہد کے خاتمے تک تقریباً تیس مہینے جاری رہا، اور متوکل کے زمانہ امارت میں اختتام پذیر ہوا، اس سارے عرصے میں امام احمدؒ قید و بند کی زندگی گذارتے رہے، شروع شروع میں امام صاحبؒ کو کوڑوں سے ایسا سخت مارا گیا کہ زخموں سے گوشت پھٹ گیا اور جب ان زخموں کے بھرنے کی کوئی امید نہ رہی تب ان بے جان گوشت کے ٹکڑوں کو جسم سے علیحدہ کر دیا گیا، مؤرخین نے اس دردناک واقعہ کو خوب تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کے لیے ابن کثیرؒ کی "البدایه والنهایة" اور ابن اثیرؒ کی "الکامل" دیکھی جا سکتی ہے، اس واقعے نے اہل حق کے دلوں میں معتزلہ کے خلاف عداوت کے بیج بو دیے اور امام احمدؒ نے برسر عام یہ اعلان کرنا شروع کر دیا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم سے صادر ہوا ہے، ساتھ ساتھ اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتے کہ قرآن کے الفاظ مخلوق ہیں اور ہمارے افعال بھی مخلوق ہیں، جیسا کہ حافظ ابن کثیر کی ''البدایہ'' میں مذکور ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے ابن ابی داود معتزلی کے ساتھ پہلے مناظرے میں قرآن پاک کی آیات سے استدلال کیا اور اس کے اعتراضات کا شافی جواب دیا لیکن معتصم کے پاس مامون کی سی ذکاوت اور فہم کی صلاحیت نہ تھی اور میرے خیال میں اگر اجل مامون کو کچھ اور مہلت دیتی اور وہ زندہ رہتا پھر اس کو امام احمدؒ کے دلائل سننے کی توفیق ملتی تو عین ممکن تھا کہ وہ معتزلی عقائد سے رجوع کر لیتا، چونکہ معتصم ان دلائل سے بے خبر تھا تو ابن ابی داود نے اس کی جہالت اور علمی کم مائیگی کا فائدہ اٹھایا اور امام احمدؒ کے بارے میں کہنا شروع کر دیا کہ یہ گمراہ کرنے والا اور بدعتی ہے لہذا اس کو قتل کر دیا جائے اور اس کا خون میری گردن پر ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ اس فتوے کے علاوہ ابن ابی داود کے پاس کوئی چارہ کار بھی نہ تھا، چنانچہ اس کی علم کلام پر دسترس اور شیریں بیانی نے اس کے نفس امارہ کو یہ سجھایا کہ وہ امت مسلمہ کی ان نیک ہستیوں کے خلاف یہ چال چلے۔

امام احمدؒ چونکہ اہل حق کے عقیدہ کے متعلق بانگ دہل اعلان کرتے تھے اس وجہ سے یہ بات پسند نہ کرتے تھے کہ اس بارے میں توریہ کرتے ہوئے کوئی یوں کہے کہ "تلفظ بالقرآن مخلوق ہے''، اس لیے کہ اگرچہ یہ کلام فی نفسہ درست ہوگا لیکن اہل باطل اس بات کو اپنے عقیدے

کی طرف کھینچ لیں گے چونکہ اس بات میں بھی ایک گونہ معتزلہ کے مذہب کا وہم پایا جاتا ہے، اگرچہ اہل سنت والجماعت کے ہاں الفاظ قرآنی مخلوق ہیں اسی لیے حسین ابن علی کرابیسیؒ پر لفظ قرآن کے مخلوق کہنے پر تنقید کی گئی ہے، اور یہی وہ وجہ تھی جس کے سبب محدثین کرام کو علم کلام سے کچھ نفرت پیدا ہوگئی، جب ان واقعات کی شہرت ہوئی تو دو فرقے معرض وجود میں آئے ایک لفظیہ اور دوسرا واقفیہ، اور جن جن لوگوں کو تکلیفیں دی گئیں اور آزمائش میں ڈالا گیا تھا ان میں صرف چار اشخاص ایسے تھے جو علی الاعلان برسرعام اہل سنت والجماعت کا عقیدہ واضح فرماتے تھے، ان کے سرخیل امام احمد بن حنبلؒ تھے، ان کے علاوہ محمد بن نوح الجند نیسابوریؒ (ان کا راستے میں انتقال ہوگیا تھا)، نعیم بن حماد الخزاعیؒ (یہ جیل میں انتقال کر گئے تھے) اور ابو یعقوب البویطیؒ (جن کا انتقال واثق کی جیل میں ہوا)، پھر ان تمام حضرات میں جتنی تکلیفیں امام احمدؒ کو دی گئیں اتنی کسی کو نہ دی گئیں، امام احمدؒ ہی اصل مرکز و مدار تھے جن کے ذریعے اللہ تعالی نے اہل حق کے عقائد کا علم بلند فرمایا، اس کی وجہ سے ان کی خوب شہرت ہوئی اور منبروں پر ان کا نام لیا جانے لگا اور اسی طرح امام احمدؒ کے شیخ اور استاذ امام شافعیؒ کا مصر میں دیکھا ہوا خواب پورا ہوا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام احمدؒ کو اہل حق کے عقیدہ پر استقامت کی اور قیامت تک ان کے جھنڈے کے بلند ہونے کی خوشخبری دی تھی، اور اسی کے متعلق خبر دینے کے لیے امام شافعیؒ نے ربیع کو امام احمدؒ کی طرف بھیجا تھا، جیسا کہ ابن کثیرؒ وغیرہ مورخین نے امام بیہقیؒ کی روایت سے بیان کیا ہے۔

حاصل بحث یہ کہ انہی شورشوں کی بناء پر اہل حق محققین و متکلمین کتاب اللہ اور سنت نبوی سے مسئلہ کلام کی توضیح وتشریح کی طرف محتاج ہوئے اور پھر ان حضرات نے عقلی، لغوی اور عرفی دلائل بھی قائم کیے، چنانچہ اس تمام بحث وتحقیق کے بعد کسی جھگڑا کرنے والے اور شورش برپا کرنے والے کے لیے کوئی راستہ نہ چھوڑا، ان تمام محققین کرام میں سب سے زیادہ تفصیلی بحث وتحقیق اس موضوع کے متعلق جنہوں نے فرمائی اور تمام باتوں کو مکمل واضح کیا وہ قاضی امام ابوبکر باقلانیؒ ہیں انہوں نے اس بارے میں ایک کافی وشافی کتاب ''الانصاف'' لکھی، اللہ رب العزت

ان کو اور دیگر تمام محققین کو ان کی مساعی جمیلہ پر اجر عظیم عطا فرمائے، آمین۔

اب ہم ذرا اس بحث کو خلاصۃً بیان کرتے ہیں واقعہ دراصل یہ ہے کہ اہل سنت اور معتزلہ کے آپس میں اختلاف کا مدار اللہ تعالی کے کلام نفسی کی تفصیل پر ہے، اہل سنت کہتے ہیں کہ اللہ تعالی کا کلام ازلی ہے اور خدا تعالی ازل سے متکلم ہیں اور کلام کی یہ صفت ازلی، لفظ کے ساتھ متصف نہیں ہے، حرف وصوت سے خالی ہے اور جس طرح دیگر صفات باری تعالی جیسے علم، ارادہ، سمع وبصر وغیرہ اللہ تعالی کے ساتھ قائم ہیں اسی طرح یہ کلام نفسی بھی قائم ہے، ادھر معتزلہ نے کلام نفسی کے وجود ہی کا انکار کر دیا اور صرف کلام لفظی ثابت کر کے کلام کو اسی میں منحصر کر دیا ہے، اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالی سے کلام لفظی کی نفی دونوں مذاہب کا متفقہ فیصلہ ہے، اس کے برخلاف کرامیہ، حشویہ اور سالمیہ اس بات کے قائل ہیں کہ حروف واصوات سے مرکب کلام، اللہ کی صفات میں سے ہے اور اگرچہ یہ کلام مرکب حادث ہے لیکن اللہ رب العزت کے ساتھ قائم ہے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی کی شان ان تمام باتوں سے بہت ہی بلند ہے۔

شیخ عبدالعزیز بخاریؒ نے شرح اصول بزدوی میں اور علامہ بیاضیؒ نے "إشارات المرام" میں جو نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ نے ایک طویل مناظرے کے بعد اتفاق رائے سے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ قرآن کے مخلوق ہونے کا قائل کافر ہے اس کا مصداق ومراد بھی یہی مذہب تھا، جس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ قرآن لفظ وصوت پر مشتمل ہے اسی بناء پر مخلوق ہے اور یہی کلام اللہ رب العزت کے ساتھ قائم ہے، اس فیصلے کا مصداق معتزلہ کا مذہب نہیں کیونکہ معتزلہ نے تو اہل سنت والجماعت کی طرح اللہ رب العزت کی لفظ قدیم، حرف قدیم اور صوت قدیم سے تنزیہ بیان کی ہے، "إشارات المرام" میں بیاضیؒ کے کلام سے اسی طرح واضح ہوتا ہے، یہ فریقین کے باہمی نزاع کا حاصل ہے جسے ہم نے تحریر کر دیا۔

اہل سنت والجماعت کے عقیدے کی وضاحت

اب اہل سنت والجماعت کے عقیدے کی توضیح وتشریح ہم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسان کے کلام لفظی کے دو معنی ہیں:

۱- کلام سے مراد مصدری معنی یعنی کسی چیز کا تکلم وتلفظ کرنا۔

۲- حاصل بالمصدر یعنی وہ الفاظ جن سے گفتگو عمل میں آئی ہے۔

اسی طرح کلام نفسی کے بھی دو معنی ہیں، یعنی جس طرح کلام لفظی پہلے معنی میں صوت ومخارج کے ربط وتعلق سے انسان کی زبان کا فعل ہے، اسی طرح کلام نفسی انسان کے قلب وضمیر کا فعل ہے جس کا اثر انسان کے ظاہری جوارح یعنی زبان، کوے، حلق یا نزخرے کسی پر ظاہر نہیں ہوتا ہے، اسی طرح دوسرے معنی کے تحت جس طرح کلام لفظی انسان کی گفتگو کا ثمرہ اور گفتگو سے حاصل شدہ شئ ہے اسی طرح کلام نفسی ہے جب اس کو مکمل طور پر تشکیل دے کر ذہن میں متصور ٹھہرا لیا جائے اسی کلام نفسی کو علماء کلام نے ان دونوں معنی کے لیے عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے جس کی تشریح وتفصیل آپ علامہ تفتازانیؒ کی "شرح المقاصد" اور "شرح العقائد" اور شرح عضدی اور اس کے حواشی میں دیکھ سکتے ہے، اسی طرح جس وضاحت کے ساتھ علامہ آلوسیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر "روح المعانی" کے مقدمہ میں اس کے متعلق کلام فرمایا ہے وہ بھی بصیرت کے لیے کافی ہے۔

پس اللہ رب العزت، کلام لفظی کے تو ہر دو معنی سے منزہ اور مبرہ ہیں اور کلام نفسی اپنے دونوں معنی میں اللہ رب العزت کے لیے ثابت ہے، علامہ آلوسیؒ کے بیان کے مطابق کلام نفسی اپنے پہلے معنی کے اعتبار سے تو خداوند تعالی کی ایسی ازلی صفت ہے جو ہر باطنی ضعف کے منافی ہے، یہ باطنی ضعف، کلام لفظی بشری میں بمنزلہ گونگے پن کے ہے یعنی جس طرح کلام لفظی کو گونگا پن منافی ہے اسی طرح کلام نفسی کے لیے بھی ایسا ضعف ہوسکتا ہے جو اس کے منافی ہو لیکن خداوند تعالی کے کلام نفسی کے لیے ایسا کوئی ضعف باطنی نہیں ہے، یہ ضعف باطنی کلام نفسی میں حروف اور الفاظ کے قبیل سے نہیں ہوگا، یہ بات واضح ہے کہ کلام نفسی خود باعتبار ذات کے تو شئ واحد ہے لیکن تعدد گفتگو کے اعتبار سے اس صفت کے متعلقات بھی متعدد ہو گئے ہیں، اور رہا کلام نفسی اپنے دوسرے معنی کے اعتبار سے تو وہ غیبی کلمات ہیں اور ازلی حکمی الفاظ ہیں لیکن مرتب ہونے کے باوجود ان کی وضع غیبی میں تقدم وتاخر (آگے پیچھے ہونا) نہیں ہے یعنی یہ اوضاع کیے بعد دیگرے

نہیں ہوئیں اس لیے کہ تعاقب ''زمانہ'' کا تقاضا کرتا ہے اور خداوند تعالی کی ذات تو زمانہ اور جو کچھ زمانہ میں ہے سب سے بلند و بالا قدر و منزلت ذات ہے، اب کوئی شئ ترتیب وار بھی ہو اور اس میں تعاقب نہ پایا جائے تو اس میں کوئی انوکھی بات نہیں بلکہ دنیا میں بھی ایسی کئی مثالیں موجود ہیں ،مثلا آپ انگوٹھی سے مہر لگائیں تو یہ مہر اور ختم مرتب ہی ہیں لیکن ان میں تعاقب نہیں بلکہ ایک ہی زمانہ میں ان دونوں کا وجود ہوتا ہے، اسی طرح ہمارے زمانے میں طباعت کی تختیاں اور اسی طرح دیکھنے والے کے سامنے نظر آنے والی صورتیں، پانی پر عکس کا پایا جانا، اسی طرح اور بھی کئی مثالیں ہیں جن میں ترتب بغیر تقدم و تاخر کے پایا جاتا ہے چنانچہ جب ترتب بدون تعاقب کا ثبوت ہمارے سامنے اسی دنیا میں ہوسکتا ہے تو پھر صفات الٰہیہ میں کیونکر نہیں ہوسکتا!۔

ماقبل میں کی گئی بحث کا خلاصہ اور حاصل یہ ہوا کہ کلام نفسی دوسرے معنی کے اعتبار سے بغیر خفاء کے باری تعالی کے لیے ثابت ہے، البتہ پہلے معنی کے اعتبار سے کچھ خفاء باقی رہا تھا جو الحمدللہ اب واضح ہو گیا، لیکن بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ یہاں معنی اول پر مدار نہیں، چنانچہ اب واضح ہو گیا کہ قرآن کی تعریف میں یوں کہنا چاہیے کہ:

قرآن کریم باری تعالی کا کلام غیر مخلوق ہے، مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور سینوں میں محفوظ ہے، زبان سے پڑھا اور کانوں سے سنا جاتا ہے، لیکن یہ ان میں سے کسی چیز کے ساتھ قائم یا کسی چیز میں حلول کیا ہوا نہیں ہے، اور ان تمام مراتب و صفات کے ساتھ شریعت میں حقیقی قرآن ہے جو بدیہی طور پر دین کی اساس ہے، چنانچہ یہ تمام صفات اگرچہ حادث ہیں لیکن کلام اللہ ہونے کی صفت ان میں جھلکتی ہے اور ان مراتب میں ظاہر ہوتی ہے، لیکن ان کے باوصف باری تعالی ہی کی طرف یہ کلام منسوب ہوتا ہے، یہ تمام صفات اسی صفت کلام کے مظاہر ہیں، یہ صفت باری تعالی کے ساتھ قائم یا ذات باری تعالی میں حلول کرنے والی نہیں ہے بایں طور کہ وہ صفت ذات سے الگ نہ ہوسکے اور ذات اس صفت سے بھی الگ نہ ہو سکے، جیسا کہ آئینہ میں کوئی صورت جھلکتی تو ہے اور اس کو کہا جاتا ہے کہ یہ دیکھنے والے کی صورت ہے لیکن یہ صورت اس آئینہ میں ڈھلتی نہیں ہے اس لیے کہ یہ صورت کوئی مادی شئ نہیں ہے بلکہ محض کیفیت سے عبارت ہے۔

وجود کے چار مراتب

ان تمام امور کے مزید سمجھنے کے لیے وجود کے چار مراتب جو علامہ تفتازانیؒ اور دیگر حضرات نے بیان کیے ہیں ذکر کیے جاتے ہیں، چنانچہ وجود کے چار مراتب ہیں یعنی ہر چیز کے لیے چار وجود ہوا کرتے ہیں:

۱-وجود خارجی ۲-وجود ذہنی

۳-وجود لفظی ۴-وجود کتابتی

ان میں سے وجود خارجی ہی وجود حقیقی ہے اور تحقیقی بات ہے کہ بقیہ وجود مجازی ہیں، جس طرح کتابت عبارت پر اور عبارت ذہنی وجود پر دال ہے اسی طرح وجود ذہنی وجود خارجی پر دال ہے، ان تمام صفات کا قرآن کی تعریف میں اتحاد باعتبار مفہوم کے نہیں ہے بلکہ محض مصداق کے اعتبار سے ہے اور یہ تمام مراتب حقیقی صفت کلام جو باری تعالی کے ساتھ قائم ہے اس کی صورتیں، خارجی مشاہد اور لفظی تعبیرات ہیں اور صفت کلام بہر حال ازلی، قدیم اور قائم بذات اللہ ہے، اب یہاں قرأت اور مقروء، تعبیر اور معبر عنہ، تلاوت اور متلو پائے جا رہے ہیں، ان میں سے قرأت، تلاوت اور تعبیر تو ہمارے افعال اور مخلوق ہیں جبکہ متلو (جو تلاوت کیا جا رہا ہے) معبر عنہ (جس سے کلام کی تعبیر کی جا رہی ہے) اور مقروء (جو کچھ پڑھا جا رہا ہے) وہ قدیم ازلی صفت ہے جو باری تعالی کے ساتھ قائم ہے، پھر جب ہم مصحف کے متعلق کہیں کہ وہ مکتوب (کاغذ پر) مقروء (زبان سے) اور مسموع (کانوں سے) ہونے کے اعتبار سے قرآن ہے، اس اعتبار سے نہ مصحف قدیم ہوگا کہ اس میں بعینہ ان نقوش کی جو بعینہ ان صفحات پر ثبت ہیں یا وہ اوراق یا الفاظ جو ہماری ذات کے ساتھ قائم ہیں وہی قدیم ہیں اس لیے کہ یہ نقوش تو اس کلام ازلی قدیم کی صرف تعبیرات ہی ہیں جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

عباراتنا شتّی و حسنك واحد

و كلّ إلی ذاك الجمال يُشير

ترجمہ: ہماری عبارتیں تیری مدح میں تو مختلف ہیں، لیکن تیرا حسن تو ایک ہی ہے

اور یہ تمام تعبیرات اس جمال پر دلالت کر رہی ہیں۔

میرے خیال میں اس مقام پر اس قدر بیان کافی ہوگا، یہ فرق درحقیقت امام احمد بن حنبلؒ ہی سے منقول ہے، جس کی تفصیل بعد میں امام بخاریؒ نے اپنے مستقل رسالہ میں (جو ''خلق افعال عباد'' کی بحث سے متعلق ہے) بیان فرمائی ہے، اسی طرح اپنی کتاب صحیح بخاری کتاب التوحید کے ذیل میں فرقہ جہمیہ پر ردوقدح کے ساتھ موصوف نے اس بحث کی تفصیل فرمائی ہے، پھر الحمدللہ امام باقلانیؒ نے اپنی کتاب ''الإنصاف'' میں اس مسئلہ کے متعلق خوب تحقیقی اور کافی و شافی بحث کی ہے جس کے بعد مزید کسی تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

نیز شیخ مہائی نے اپنی کتاب ''تبصیر الرحمن فی تفسیر القرآن'' کے مقدمے میں جو یہ بات ذکر فرمائی ہے کہ: لفظ قرآن کا اطلاق لوح محفوظ میں (ثبت کلام) اور سینوں میں محفوظ اور مصاحف میں لکھے گئے اور زبان سے پڑھے جانے والے کلام ہر ایک پر بر سبیل اشتراک کیا جاسکتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات تحقیق کے خلاف ہے بہتر یہی ہے کہ یوں کہا جائے کہ قرآن ان تمام پر حقیقت شرعیہ کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اگرچہ لغوی اعتبار سے بعض صفات پر قرآن کا اطلاق مجازی ہے، لیکن یہ بات بھی ممکن ہے کہ مہائیؒ کی عبارت کی توجیہ یوں کردی جائے کہ اشتراک سے مراد اشتراک معنوی ہے نہ کہ اشتراک لفظی، واللہ اعلم۔

پھر امام بخاریؒ نے امام احمد بن حنبلؒ کی طرح صرف اس جملہ: **''القرآن كلام الله غير مخلوق''** پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مزید ایک جملہ بڑھا کر اپنے دعوی پر مصر رہے اور یوں فرمایا کہ: **''القرآن كلام الله غير مخلوق ولفظي بالقرآن مخلوق''** اسی طرح یہ بھی کہا کہ: **''وأفعالنا مخلوقة و ألفاظنا من أفعالنا''** یعنی قرآن خداوند تعالیٰ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے جبکہ میرے ادا کیے گئے قرآن کے الفاظ مخلوق ہیں اور ہمارے افعال کے مخلوق ہونے کی وجہ سے چونکہ الفاظ بھی ہمارے افعال میں سے ہیں اس لیے وہ بھی مخلوق ہیں۔

اسی اختلاف کی بنا پر (یعنی امام احمدؒ کے دعوی پر مزید اضافہ سے جو اختلاف فرمایا) امام علام کا اپنے شیخ ذہلیؒ سے اختلاف ہوا اور برابر ان کے درمیان چپقلش جاری رہی، امام بخاریؒ

کے اس اضافہ کی وجہ یہ تھی کہ وہ فرقہ حشویہ، کرامیہ اور سالمیہ جو الفاظ یعنی حرف وصوت تک کے قدیم ہونے کے قائل تھے رد فرمانا چاہتے تھے کہ ان فرق باطلہ کو امام بخاریؒ کے کلام میں اپنے دعوی پر کوئی دلیل موید نہ مل جائے، چنانچہ جس طرح امام احمد بن حنبلؒ کا مقصد اہل سنت کے مسلک کا دفاع اور فرقہ معتزلہ پر رد تھا اسی طرح امام بخاریؒ کا مقصد اور ان کے مد نظر ان فرقہ حشویہ والوں پر رد تھا جنہوں نے امام احمدؒ کی رائے کے خلاف ان کے کلام میں مبالغہ آرائی کی تھی اور غیر صحیح مقصد پر اس کو محمول کیا تھا۔

بہر حال امام احمدؒ اور امام بخاریؒ ہر دو کا مشن اہل حق کے مسلک کا دفاع اور فرق باطلہ پر رد تھا اور ان کا اختلاف محض احوال کے پیش نظر اور حکمت ومصلحت کے تحت ہوا تھا اور چونکہ امام ذہلیؒ امام احمدؒ کا ساعذاز رکھتے تھے اس وجہ سے چاہتے تھے کہ جس قدر تعبیر پر امام احمدؒ نے اکتفا فرمایا ہے بس اسی پر اکتفا کیا جائے یا پھر امام ذہلیؒ کی ناراضگی علاقائی مصلحت کی بنا پر ہو اس لیے کہ موصوف امام ابو عبد اللہ البخاریؒ سے جو ان کے ساتھی تھے شہر کے حالات سے زیادہ واقف تھے، واللہ اعلم۔

امام احمدؒ اور امام بخاریؒ کا اختلاف بالکل اسی طرح تھا جس طرح مسئلہ ایمان میں امام ابو حنیفہؒ اور محدثین کرامؒ کے درمیان اختلاف تھا، امام ابو حنیفہؒ کی نظر خوارج اور معتزلہ پر تھی جبکہ محدثین کرام کی نظر مرجئہ پر، اور حالات وکیفیات کے اختلاف کی وجہ سے آراء کا اختلاف ہوتا رہتا ہے۔

قرآن کریم باری تعالی کے لامتناہی علوم کا خزانہ اور علماء امت کی قرآن کے متعلق کاوشیں

۱-باری تعالی کا فرمان ہے: ﴿أنزله بعلمه﴾ [النساء:۱٦٦]

ترجمہ:قرآن کو بھیجا ہے اپنے کمال علم سے۔

۲:﴿فاعلموا أنّما أنزل بعلم الله﴾ [هود:۱٤]

ترجمہ:توتم یہ یقین کرلو کہ یہ قرآن اللہ ہی کے علم سے اترا ہے۔

۳-اوراسی طرح ارشادگرامی ہے:

﴿قل لو كانَ البحر مدادًا لكلمات ربّي لنفد البحر
قبل أن تنفد كلمات ربّي ولو جئنا بمثله مددًا﴾

[الكهف:۱۰۹]

ترجمہ: آپ کہہ دیجیے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر کی روشنائی ہوتو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہوجائے اگر چہ اس سمندر کی شکل ایک اور سمندر ہم لے آئیں۔

۴-ایک اورجگہ فرمایا کہ:

﴿ولو أنّ ما في الأرض من شجرة أقلام والبحر يمدّه
من بعده سبعة أبحر ما نفدت كلمات الله﴾[لقمان:۲۷]

ترجمہ:اور جتنے درخت زمین بھر میں ہیں اگر وہ سب قلم بن جائیں اور یہ جو سمندر ہے اس کے علاوہ سات سمندر اس میں اور شامل ہوجائیں تو اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں۔

یہ وہ چار مقامات ہیں جہاں باری جل شانہ نے قرآنی علوم کی شان یوں فرمائی ہے کہ یہ قرآن ایسے علم الہی کا منبع ہے جس کا فیض کبھی بھی ختم نہ ہوگا اور اس لامتناہی علم الہی کی مثال باری

تعالی اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ اس چار اطراف پھیلی زمین کے تمام درختوں سے قلم تیار کیے جائیں اور کرۂ ارض کے تمام سمندروں کو سیاہی میں بدل دیا جائے، اب اس وسعت کے بارے میں ذرا سوچیے اور تصور کیجیے کہ صرف ایک درخت سے ہی کتنے قلم بنائے جاسکتے ہیں اور پھر اس بے پایاں سیاہی کو سوچیے جو سمندروں سے بنے اور اس کے قطرات کی مقدار کا اندازہ لگایے اور غور کیجیے کہ ہر ہر قطرے سے کیا کچھ لکھا جائے گا، صرف ایک بحر ہادی کی مسافت جغرافیائی سائنس دانوں نے ساٹھ ملین مربع میل کے بقدر اندازہ کی ہے، اب دوبارہ ذرا غور کیجیے کہ یہ اتنے ڈھیر سارے قلم اور یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی بصورت سیاہی! چنانچہ باری تعالی کے اس عظیم علم کے مکمل احصاء اور احاطہ سے قبل ہی ساری سیاہی ختم ہوجائے گی اور تمام قلم خشک ہوجائیں گے، خدا کی شان دیکھیے! قرآن کے متعلق کیا ہی بہترین مثال خود قرآن میں ذکر فرمائی اور واقعی یہ صرف اسی علیم وخبیر کا کلام ہے کسی شاعر کی سخن گوئی نہیں، جیسا کہ قرآن میں فرمان عالی شان ہے کہ:

﴿و ما علّمناه الشعر وما ينبغي له إن هو إلّا ذكر و قرآن مبين﴾ [يسين:٦٩]

ترجمہ: اور ہم نے آپ کو شاعری کا علم نہیں دیا اور وہ آپ کے شایاں بھی نہیں، وہ تو محض نصیحت اور آسمانی کتاب ہے۔

جب اللہ جل شانہ کا علم ایسا بلند اور جلیل القدر ہوا اور پھر قرآن کو اپنے اسی علم سے اتارا تو یہ بات تو مسلم ہی ہے کہ متکلم جب بھی کلام کرتا ہے اپنے علم اور مرتبے کا پاس رکھتے ہوئے کرتا ہے، اس سے واضح ہوا کہ قرآن جن حقائق اور اشارات ربانیہ کا مجموعہ ہے اس کے علوم کا احاطہ بجز اس کے اتارنے والے کے اور کوئی نہیں کرسکتا، اور یہ خداوند تعالی ہی کی شان ہے کہ ایسے خصائص وعلوم پر مشتمل قرآن نازل فرمایا اور جس نے بھی کہا ہے سچ ہی کہا کہ:

جميع العلم في القرآن لكن
تقاصر عنه أفهام الرجال

ترجمہ: قرآن کریم میں ہر علم ہے لیکن لوگوں کی عقل وفہم ان کے ادراک سے قاصر ہیں۔

قرآن کریم کے متعلق قرآنی تعبیرات کے بعد اب وہ تعبیرات ملاحظہ ہوں جو کائنات انسانی میں سب سے بڑھ کر کمال علم رکھنے والے انبیاء کے سردار، رسول عربی ہاشمی ﷺ نے اپنی حکیمانہ احادیث اور اپنے مبارک اقوال میں ارشادفرمائیں۔ ''جامع ترمذی'' میں حارث اعور حضرت علیؓ سے طویل حدیث میں نقل کرتے ہیں جن کے الفاظ یوں ہیں:

"و لا یشبع منه العلماء و لا یخلق علی کثرۃ الرد و لا تنقضی عجائبه"

ترجمہ: علماء علوم قرآنی سے کبھی سیر نہ ہوں گے اور نہ ردود وشبہات کی کثرت سے قرآن بوسیدہ ہوگا اور نہ ہی اس کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے۔

اور ایک روایت میں "و لا یملّ قار یه" بھی ہے (یعنی اس کا پڑھنے والا کبھی تنگ دل نہ ہوگا) یہ حدیث ابن ابی شیبہؒ، اسحاقؒ، دارمیؒ اور بزارؒ وغیرہ نے بھی نقل کی ہے جیسا کہ علامہ زیلعیؒ نے " تخریج احادیث الکشاف" میں جو "تلخیص الحافظ ابن حجر ذیل الکشاف" کے نام سے طبع ہو چکی ہے ذکر فرمایا ہے اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث جو ابن ابی حاتم نے نقل کی ہے جسے علامہ سیوطیؒ نے ''الاتقان'' میں ذکر کیا ہے:

"القرآن ذو شجون و ظهور و بطون ، لا تنقضی عجائبه و لا تبلغ غایته"

ان کلمات نبویہ [لا تنقضی عجائبه و لا تبلغ غایته] پر ذرا غور کیجئے کہ علوم قرآنی کے متعلق کتنی کشادگی اور گہرائی ان میں بیان کی گئی ہے، قرآن کے متعلق اس قسم کی احادیث میں حضرت علی مرتضیٰؓ بہت نمایاں رہے ہیں، انہی کے بارے میں رسول اقدس ﷺ نے فرمایا کہ: أنا مدینة العلم وعلی بابها (میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ) حضرت علیؓ کے بعد حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مرتبہ ہے جو فضل ودانش اور علوم قرآنی کے بحر بیکراں ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ ان الفاظ کے ساتھ دعادیتے ہیں کہ:

"اللّٰهمّ فقّهه فی الدین وعلّمه التأویل"

ترجمہ: اے خداوند! ان کو دین کی سمجھ اور قرآنی تاویلات وتشریحات کا علم

سکھلا دیجئے۔

پہلی حدیث کے لئے شاہد قادسیہ کے مفتی اعظم حضرت ابن مسعودؓ کی وہ حدیث بھی ہے جس کو حاکم نے اپنی مستدرک میں حضرت عبداللہؓ سے نقل کیا کہ رسول اقدس ﷺ نے فرمایا:

إنّ هذا القرآن مأدبة الله فاقبلوا من مأدبته ما استطعتم ، إنّ هذا القرآن حبل الله و نور مبين ، و الشفاء النافع ، عصمة لمن تمسّك به ، و نجاة لمن تبعه لا يزيغ فيستعتب ، و لا يعوج فيقوم ، و لا تنقضى عجائبه ، و لا يخلق من كثرة الرد ، اتلوه فإنّ الله يأجركم على تلاوته كلّ حرف عشر حسنات ، أمّا إنّى لا أقول "الم" حرف و لكن الف و لام و ميم "

ترجمہ: یہ قرآن بیشک خداوند کریم کا خوان ہے جتنی استطاعت ہو اس کی جانب بڑھ جاؤ، بلاشبہ یہ قرآن خدا کی رسی اور واضح نور ہے، نفع مند وشافی ہے، جو اس کو پکڑے رہے اس کے لئے حفاظت ہے اور جو اس کی اتباع کرے اس کے لئے نجات ہے، اس میں کوئی کجی یا ٹیڑھ پن نہیں کہ جس کو سیدھا کیا جائے، اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے اور ردود وشبہات کی کثرت سے پرانا نہ ہوگا اور اس کی تلاوت کیا کرو خدا تعالیٰ اس کی تلاوت پر تم کو اجر دیں گے ہر حرف پر دس نیکیاں ملیں گی میں یہ نہیں کہتا کہ "الم" ایک حرف ہے بلکہ الف، لام، میم (یہ تین حروف ہوئے)۔

حضرت معاذؓ جو محدث طبرانی کے نزدیک صحابہ کرام میں حلال وحرام سے متعلق سب سے زیادہ احادیث کے جاننے والے تھے ان سے مروی ہے، اس حدیث کو علامہ زیلعی نے "تخريج أحاديث الكشاف" میں اور امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کی ملاقات ہوئی تو حضرت خضر نے حضرت موسیٰ سے فرمایا: تمہارا اور میرا علم خدا کے علم کے سامنے اس چڑیا کی چونچ میں بھرے پانی کے مانند ہے جو اس نے سمندر سے لیا، علماء کرام اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ تو محض ایک مثال ہے ورنہ اللہ کے لامتناہی علم کے سامنے متناہی یعنی سمندر کی کیا حیثیت!!۔

سہل بن عبد اللہؒ کہا کرتے تھے کہ اگر کسی شخص کو قرآن کے ہر ہر حرف کے ہزار مفاہیم ومعانی بھی معلوم ہوجائیں تب بھی باری تعالیٰ کے قرآن کریم میں ودیعت کردہ اسرار کی انتہاء کو نہیں پہنچا جاسکتا اس لئے کہ یہ اللہ جل شانہ کا کلام ہے جو کہ اس کی صفت ہے، تو جس طرح اللہ رب العزت کی انتہاء نہیں اسی طرح اس کے کلام کے مفاہیم کی بھی کوئی انتہاء نہیں اور ہر شخص اس کو اتنا ہی سمجھ سکتا ہے جس قدر اللہ اس پر اس کے اسرار ورموز عیاں کرے، اور جبکہ خدا کا کلام مخلوق بھی نہیں ہے تو اس کے لامتناہی مفہوم پر حادث اور مخلوق عقول کیونکر پہنچ سکتی ہے۔

اس کے بعد اب قرآنی علوم کے متعلق صحابہ کرام سے منقول اقوال میں سے شہر علم کے دروازے حضرت علیؓ کا یہ جملہ ملاحظہ فرمائیں کہ صرف سورہ فاتحہ کی تفسیر میں اتنا کچھ لکھا جاسکتا ہے جو ستر اونٹ کا بوجھ ہو، امام سیوطیؒ نے اس قول کو بروایت محدث عارف ابن ابی جمرہؒ نقل فرمایا ہے، امام غزالیؒ نے اسی کو احیاء علوم الدین میں ذکر کیا نیز علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے تو اس کی قابل فہم شرح بھی فرمائی ہے اور راقم کے نزدیک یہ حدیث تو بالکل بدیہی طور پر واضح ہے اس میں چنداں غور وفکر کی ضرورت نہیں اس لئے کہ فاتحہ تو ام القرآن ہے اور جن باتوں سے قرآن تعرض کرتا ہے ان سب کا اجمالی بیان سورۂ فاتحہ میں موجود ہے، جیسے کہ ایک بڑے درخت کے تمام اجزاء بیج کے مرہون منت ہوتے ہیں، چنانچہ اسی سورۂ فاتحہ میں اولاً ذات، صفات واسماء باری تعالیٰ اور تمام عوالم کے متعلق کلام کیا گیا، پھر ہر ہر عالَم سے باری تعالیٰ کی ربوبیت کا رشتہ اور ان میں بکھرے عجائب وغرائب کا بیان ہوا جبکہ تمام عوالم کا اعداد وشمار اور ان میں موجود عجائبات کی تعداد کا جاننا بلکہ ایک ہی عالَم کے متعلق معلومات کا حصول ناممکن اور محال ہے، اگر دیکھا جائے تو صرف حیوانات ہی کی ہر صنف کے متعلق معلومات کے احاطے کے لئے کئی دفاتر پر مشتمل دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) درکار ہے۔

اس کے بعد روز قیامت اور اس کے عجیب وغریب حالات اور اس کی ہولناکیاں اور ہیبت انگیز احوال کا بیان ہے جس کی طرف باری تعالیٰ کے قول: ﴿مالك يوم الدين﴾ میں اشارہ کیا گیا ہے، بعد ازاں شرعی احکامات' عبادات اور جن چیزوں کی طرف انسان اپنی زندگی

میں محتاج ہوتا ہے ان کا بیان ہوا۔ نیز انبیاء ومقربین اور شہداء وصالحین کا تذکرہ ہوا اور گمراہ قوموں اور باطل فرقوں کے متعلق بتایا گیا۔ اور اگر باری تعالیٰ کسی ایک جزء ہی کے متعلق علوم و حقائق ربانیہ کسی انسان کے لئے کھول دیں تب بھی اس کی ساری زندگی ان ابحاث کے احصاء میں تمام ہوجائے گی۔ ربوبیت باری تعالیٰ کی بعض نازک اور اہم مباحث نیز آج کے سائنسدانوں کی پیش کردہ ریسرچ کے مطابق ملکیت باری تعالیٰ کی وسعت کے متعلق میں نے دوران درس بھی کچھ وضاحت کی تھی۔ مزید تفصیلات کے لئے امام سیوطیؒ کی کتاب ''الاتقان'' کی قسم نمبر ۶۵ میں جو قرآن سے مستنبط علوم کی بحث سے متعلق ہے دیکھی جاسکتی ہے۔

پھر صحابہؓ کی جماعت کے بعد سرداران امت کبار تابعینؒ کے ان اقوال کو دیکھئے جو قرآن کی شان کے متعلق انہوں نے ارشاد فرمائے اور ساتھ ہی علماء امت کی بڑی بڑی تالیفات وتصنیفات کو دیکھئے کہ ان حضرات نے قرآنی اسرار ورموز کو واضح کیا جن میں سے کچھ میں بھی آئندہ ذکر کروں گا (ان شاء اللہ)، اس موضوع پر علامہ زاہد کوثریؒ نے اپنے مجموعۂ مضامین "مقالات الکوثری" صفحہ ۴۰۳ میں جو ابحاث ذکر کی ہیں وہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، چونکہ اس رسالہ [يتيمة البيان] کی تالیف کے وقت میں علامہ کوثریؒ سے متعارف نہ تھا اور نہ ان کے مضامین منصۂ شہود پر آئے تھے اس لئے میں ان کی باتیں اس میں ذکر نہ کرسکا، ان تمام ابحاث کو میں نے بوقت درس تفصیل سے بیان کردیا تھا اور علوم قرآنی کی وسعت پر دلائل وامثال کے ساتھ میں ان محاضرات میں بحث کرچکا ہوں، اس بارے میں مزید تفصیلات کے لئے امام غزالیؒ کی کتاب "إحياء علوم الدين" کے چوتھے باب جو قرآن دانی کے بیان میں ہے اس کا پہلا حصہ دیکھا جاسکتا ہے، اسی طرح علامہ زبیدیؒ کی تحریر کردہ احیاء کی شرح "الاتحاف" بھی اس کے لئے مفید ہوگی۔ باری تعالیٰ کے ارشاد گرامی:

﴿لعلمه الذين يستنبطونه منهم﴾ [النساء:۸۳]

میں واضح اشارہ ملتا ہے کہ قرآنی علوم لامتناہی ہیں، چنانچہ قرآن میں ظاہری علوم کے متعلق صرف اصول وکلیات اور باطنی علوم کے متعلق لطیف اشارات ونکات ذکر کیے گئے ہیں جو

گرانقدر معارف وحقائق پر دلالت کرتے ہیں۔

علوم القرآن سے مراد

خلاصۂ بحث یوں ہوا کہ علوم القرآن وہ علوم کہلاتے ہیں جن کا تعلق قرآن کریم کے ان مقاصد سے ہو جو قرآن کے ظاہری مطالب اور اس میں پنہاں حقائق سے وابستہ ہوں اور ان مقاصد ومضامین کا تعلق بندوں کی رہنمائی سے ہو نیز ان کے مبدأ ومعاد کے متعلق تنبیہ ہو اور دونوں جہاں کی حقیقی سعادت مقصود ہو، یا پھر وہ اہم علوم مراد ہیں جو قرآن کریم کے خفیہ محاسن کی نقاب کشائی کرنے والے ہوں۔

صاحب "مناهل العرفان" نے علی بن ابراہیم حوفی متوفی ۳۳۰ھ سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک علوم القرآن سے متعلق جتنی تالیفات کی بابت انہیں معلوم ہو سکا وہ ذکر فرمادی ہیں، مکمل معلومات کے احاطے کے لیے وہاں رجوع کیا جائے۔

قرآنی علوم کے متعلق
علمائے امت کے قابل تحسین کارنامے

قرآن کریم اللہ کی وہ کتاب ہے جس کے متعلق خود باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿و إنه لكتابٌ عزيز لايأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد﴾ [حم سجده:٤٢]

ترجمہ:۔ ''اور وہ کتاب ہے نادر، اس پر جھوٹ کا دخل نہیں، آگے سے اور نہ پیچھے سے اتاری ہوئی ہے حکمتوں والے سب تعریفوں والے کی۔''

اور یہ واقعی ایسی کتاب ہے جس نے انسانی عقل کو حیرت میں ڈال رکھا ہے اور بڑے بڑے حکما، فصحا، عارف اور دانشوروں کو مسحور کر دیا ہے جس کے نظم میں موجود عجیب تناسق و ترتیب اور اس کے عاجز کر دینے والے بیان کے آگے بڑے بڑے فصحاء کی جبین نیاز خم ہے بلکہ قرآن کریم نے اپنی آب و تاب اور حیرت انگیز رونق سے عقول کو گویا مسخر کر لیا اور اس کی گراں مایہ حکمتوں اور دقیق اسرار نے بڑے بڑے حکماء کو چہروں کے بل گرا دیا، اس لئے کہ ان حکمتوں تک ان کی عقل و سمجھ کبھی رسائی نہ حاصل کر سکتی تھی، بلکہ ان حکمتوں کی بلندیوں تک پہنچنے سے ان کے افکار اور ان کے ادراکات عاجز تھے، بڑے بڑے اہل معرفت اس کے معارف وحقائق کے سمندر میں غوطہ زن رہے، لیکن اس کے دقیق اسرار تک پہنچنے سے اس کی تند موجوں نے ان کو تھکا دیا اور ان کو پانے سے پہلے ہی ان کی امیدیں ڈھیر ہوگئیں، علماءامت اور فقہائے ملت نے اس کی گہرائیوں میں غور وخوض کیا اور امت کے لئے عمدہ اور قیمتی مگر چھپے ہوئے موتی اور جواہرات نکالے جس کے نتیجہ میں گویا کہ یہ قرآن نظام عالم کے سر کا تاج اور ہر ہر زمانے کی تہذیب وثقافت کے ماتھے کا حسین جھومر بن گیا۔

قرآن کریم تو وہ عظیم کتاب ہے جس کو باری تعالیٰ شانہ نے اپنے علم کے ساتھ نازل فرمایا اور اس کی توصیف یوں فرمائی کہ:

﴿كتاب أنزلناه إليك مبارك ليدّبّروا آياته ليتذكّر أولو الألباب﴾ [ص:٢٩]

ترجمہ: یہ ایسی کتاب ہے جو اتاری ہم نے تیری (آپ علیہ الصلوۃ والسلام کی) طرف، برکت والی تاکہ غور وفکر کریں لوگ اس کی آیتوں میں اور تاکہ عبرت حاصل کریں عقل والے۔

اسی طرح فرمایا کہ:

﴿و إنّه لكتاب عزيز لايأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد﴾ [حم سجده:٤٢]

ترجمہ: ''اور وہ کتاب ہے نادر، اس پر جھوٹ کا دخل نہیں آگے سے اور نہ پیچھے سے، اتاری ہوئی ہے حکمتوں والے سب تعریفوں والے کی طرف سے۔''

ایک اور مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

﴿الله نزّل أحسن الحديث كتابًا متشابهًا مثاني تقشعرّ منه جلود الذين يخشون ربّهم ثمّ تلين جلودهم و قلوبهم إلى ذكر الله﴾ [زمر:٢٣]

ترجمہ: ''اللہ نے اتاری بہتر بات، کتاب آپس میں ملتی دوہرائی ہوئی، بال کھڑے ہوتے ہیں اس سے کھال پر ان لوگوں کے جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے پھر نرم ہوتی ہیں ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کی یاد کی طرف مائل ہوتے ہیں۔''

اور فرمایا کہ:

﴿وإنّه لتنزيل ربّ العالمين نزل به الروح الأمين على قلبك لتكون من المنذرين بلسان عربي مبين﴾

[الشعراء:١٩٢تا١٩٥]

ترجمہ: " یہ قرآن ہے اتارا ہوا پروردگار عالم کا، لے کر اترا ہے اس کو فرشتہ معتبر، تیرے دل پر کہ تو ہو ڈر سنا دینے والا کھلی عربی زبان میں۔"

اور فرمایا کہ:

﴿وإنّه فى أمّ الكتاب لدينا لعلىٌّ حكيم﴾ [شوریٰ:٤]

ترجمہ: اور تحقیق یہ قرآن لوح محفوظ میں ہمارے پاس ہے برتر مستحکم۔

کائنات کے فصیح وبلیغ انسان حرف ضاد کو سب سے زیادہ واضح طور پر ادا کرنے والے، جن کو حکمت وفراست اور واضح کلام وخطاب مرحمت کیا گیا، جو گذرے اور آئندہ تمام زمانوں میں آنے والے سب لوگوں پر علمی برتری وتفوق کے حامل' خدائے پاک کی سب سے زیادہ معرفت رکھنے والے اور مخلوق میں خداوند تعالیٰ کے اسرار وحکم کے متعلق سب سے زیادہ گہری بصیرت سے سرفراز' رسولوں کے سردار اور خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ نے قرآن پاک کی توصیف کچھ اس طرح بیان فرمائی کہ اس کے بعد اس کی تعریف میں کسی بڑھنے والے کے لئے کوئی انتہا نہ چھوڑی چنانچہ فرمان عالیشان ہے کہ:

"كتاب الله فيه نبأ ما قبلكم ، وخبر ما بعدكم وحكم ما بينكم ، هو الفصل ليس بالهزل ، من تركه من جبار قصمه الله ، ومن ابتغى الهدى فى غيره أضلّه الله، هو حبل الله المتين ، وهو الذكر الحكيم ، وهو الصراط المستقيم ، وهو الذى لا تزيغ به الأهواء ، و لا تلتبس به الألسنة ، ولا يشبع منه العلماء ، ولا يخلق على كثرة الرد ، ولا تنقضى عجائبه ، وهو الذى لم تنته الجن إذ سمعته حتى قالوا : ﴿إنّا سمعنا قرآنا عجبا يهدى إلى الرشد فآمنّا به﴾ من قال به صدق ، ومن عمل به أجر ، ومن حكم به عدل ، ومن دعا إليه هدى إلى صراط مستقيم"

ترجمہ: " قرآن کریم اللہ کی وہ کتاب ہے جس میں تم سے پچھلوں اور تم سے اگلوں

کے متعلق اہم خبریں ہیں، اس میں تمہارے آپس کے معاملات کے متعلق فیصلے ہیں' یہ خدا کا واضح اور فیصلہ کن کلام ہے جس میں کچھ مذاق نہیں جس متکبر نے اس کو چھوڑا خداوند تعالیٰ نے اس کو تباہ کیا، اور جس نے اس کے علاوہ کسی دوسری کتاب میں ہدایت تلاش کی اللہ نے اس کو گمراہ فرمایا' یہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی اور ذکر حکیم ہے' یہ صراط مستقیم ہے کہ اس کے مطابق عمل پیرا ہونے میں خواہشات نہ بھٹکیں گی اور زبانیں التباس نہ کھائیں گی' علماء اس سے سیر نہ ہوں گے اور کثرت سے پڑھے جانے کے باوجود یہ پرانا نہ ہوگا اور نہ اس کتاب کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے یہ ایسی کتاب ہے کہ اس کو سن کر جن بھی رک نہ سکے اور بول پڑے:

﴿إنا سمعنا قرآنا عجبا يهدي إلى الرشد فآمنا به﴾ [الجن:۱]

ترجمہ: ''ہم نے سنا ہے ایک قرآن عجیب کہ راہ نمائی کرتا ہے راہ راست کی طرف نیک راہ سو ہم اس پر ایمان لائے۔''

جس شخص نے اس کے مطابق کہا، اس نے سچ کہا۔ اور جس نے اس پر عمل کیا، ماجور ٹھہرا۔ اور جو اس کے مطابق فیصلہ کرے، اس نے انصاف کیا۔ اور جس نے اس کی طرف بلایا، سو اس نے سیدھے راستے کی طرف رہبری ورہنمائی کی۔

اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے اپنی جامع میں حارث الاعور سے جنہوں نے حضرت علیؓ سے اس روایت کو نقل کیا ہے، ذکر فرمایا ہے اور علامہ زیلعیؒ "تخريج أحاديث الكشاف" میں اس حدیث کے متعلق یوں فرماتے ہیں کہ: اس حدیث کو ابن ابی شیبہ' اسحاق' دارمی اور بزار رحمہم اللہ نے حارث سے نقل شدہ طریق پر ذکر فرمایا ہے اور اس حدیث کے لئے امام طبرانیؒ کی ذکر کردہ حضرت معاذ بن جبلؓ سے منقول روایت شاہد ہے' حاکم نے اس حدیث کو ابن مسعودؓ کے حوالے سے بھی مرفوعاً ذکر فرمایا ہے لیکن یہ تمام احادیث بہر حال سند کے ضعف سے خالی نہیں ہیں۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"القرآن ذو شجون ، وظهور وبطون ، لا تنقضي عجائبه ، ولا تبلغ غايته ، فمن أوغل فيه برفق نجا ، و

من أوغل فيه بعنف هوى ، أخبار و أمثال ، وحلال و حرام ، وناسخ ومنسوخ ، ومحكم ومتشابه ، وظهر و بطن ، فظهره التلاوة ، و بطنه التأويل ، فجالسوا به العلماء و جانبوا به الفقهاء"

ترجمہ: ''قرآن مختلف معانی کا حامل ہے، ظاہری معانی اور باطنی حقائق پر مشتمل ہے، اس کے عجائبات ختم نہ ہوں گے اور نہ اس کے مضامین کی انتہاء تک کبھی پہنچا جا سکے گا، جس شخص نے دل کی نرمی سے اس میں غور وفکر کیا، اس نے نجات حاصل کی اور جس نے سختی سے غور وخوض کیا وہ گر پڑا، اس میں خبریں اور مثالیں' حلال وحرام' ناسخ ومنسوخ' محکم ومتشابہ ہیں، نیز اس قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، ظاہر تو اس کا تلاوت وقراءت ہے اور باطن اس کی تفسیر وتاویل ہے، پس اس وعام کر علماء کی صحبت اختیار کرو اور کم عقلوں سے کنارہ کش ہو جاؤ''۔

صاحب ''اتقان'' نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو ابن ابی حاتم نے ضحاک کے طریق سے حضرت ابن عباس سے نقل فرمایا ہے۔

چنانچہ اس نایاب اور سرچشمۂ قوت خداوند کریم کی طرف سے نازل کردہ کتاب قرآن مجید نے اپنے حسن نسق وترتیب اور اپنی بلند پایہ فصاحت وبلاغت سے عرب وعجم کے خطباء اور دنیا کے بلغاء کی کھوپڑیاں اڑا دیں' ان کے گویوں کو گونگا اور ان کی چناں وچنیں کو خاموش کر چھوڑا بالآخر وہ اس کی رونق وحلاوت اور اس کے شہد کے مانند شیریں اسلوب کے سامنے حیرت زدہ رہ گئے، اس کی طمازت وتپش ان میں سرایت کر گئی جس کی وجہ سے آپ ان کو نشہ میں مدہوش پائیں گے حالانکہ وہ کچھ مدہوش نہیں، قرآن کریم کی توصیف وتعریف میں شاعر کے اس شعر کے لیے قرآن کریم کو مصداق ٹھہرایا جا سکتا ہے:

و عينان قال الله كونا فكانتا
فعولان بالألباب ما يفعل الخمر

ترجمہ: دو چشمے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہو جاؤ پس وہ چشمے آپس میں مل گئے اور عقلوں کے ساتھ شراب کا سا معاملہ کر رہے ہیں۔

اور ذرا ولید بن مغیرہ کے اس قول کو بھی مدنظر رکھیے جب اس نے رسول اللہ ﷺ سے سورہ ''حم سجدہ'' کی ابتدائی آیات سنیں تو کہنے لگا:

''والله ! إنّ له لحلاوة ، و إنّ عليه لطلاوة ، و إنّ أسفله لمعذق ، و إنّ أعلاه لمورق ، وإنّه يعلو و لا يعلى، و إنّه ليحطم ما تحته''.

''بخدا! اس قرآن میں تو ایک عجیب قسم کی حلاوت اور رونق ہے اس کا نچلا حصہ خوشہ دار اور اوپر کا حصہ سرسبز وشاداب ہے اور بیشک یہ غالب ہوگا مغلوب نہ ہوگا اور یہ اپنے نہ ماننے والوں کو ہلاک کردے گا''۔

اس کتاب کی آیات مضبوط اور حکیم وخبیر کی نازل کردہ ہیں، اس کی حکمتوں کے آگے مشرق ومغرب کے حکماء تہی دست ہیں اور فقہاء عراق وحجاز، خراسان وقرطبہ کو اس کتاب نے احکام شرعیہ فقہی جزئیات ومسائل کے استنباط میں جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، فلاسفۂ زمانہ اور دانشورانِ اقوام قرآن کریم میں بیان کردہ تہذیب انسانیت اور قوانین تربیت کو شمار کرتے کرتے ہکلانے اور تتلانے لگے ہیں، خدا بھلا کرے شیخ علامہ محدث حافظ تقی الدین سبکیؒ کا کہ انہوں نے شیخ صلاح الدین صفدیؒ کو بعض مسائل کے متعلق جواب دیتے ہوئے قرآن کے اعجاز کے بارے میں درجہ ذیل اشعار پڑھے:

لأسرار آيـات الكتاب معان تدق فلا تبدو لكل معان
وفيها لمرتاض لبيب عجائب سنا برقها يعنو له القمران
اذا بارق منها لقلبي قد بدا هممت قرير العين بالطيران
سرورا و ابهاجاوصولاعلى العلى كأنى على هام السماك سمانى
وهاتك منها قد أبحت كما ترى فشكرا لمن أولى بديع بيان
وان جنانى فى تموج ابحر من العلم فى قلبى تمد لسانى
وكم من كناس فى حماى مخدر الى أن أرى أهلا ذكى جنان
فيصطاد منى ما يطيق اقتناصه وليس له [illegible]

منای سلیم الذھن ریض ارتوی بکل علوم الخلق ذو لمعان
فذاك الذی یرجی لایضاح مشکل ویقصد للتحریر عند عیان
وکم لی فی الآیات حسن تدبر به الله ذو الفضل العظیم حبانی
بجاه رسول الله قد نلت کل ما أتی وسیأتی دائما بأمان
فصلی علیه الله ما ذر شارق وسلم ما دامت له الملوان

ترجمہ: ۱-قرآن کی آیات کے معانی وحقائق اتنے دقیق ہیں کہ ہر مشقت اٹھانے والے کے سامنے ظاہر نہیں ہوتے۔

۲-ان آیات میں عقل منداور زحمت کرنے والوں کے لیے عجائبات ہیں، ان آیات کی روشنی وانوارات کے سامنے سورج و چاند جھک جاتے ہیں۔

۳-جب ان آیات کی چمک میرے دل پہ نمودار ہوتی ہے تو خوشی کی وجہ سے میرا ہوا میں اڑنے کو جی کرتا ہے۔

۴-سرور وخوشی اور اونچے مراتب تک پہنچنے کی وجہ سے گویا میں اپنے آپ کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا ہوا سمجھتا ہوں۔

۵-قرآن کی روشنیوں سے فائدہ اٹھاؤ جیسا کہ میں نے اس بات کا اظہار کیا ہے اور تم خود بھی جانتے ہو، قابل شکر ہے وہ ذات جس نے ایسا عمدہ اور بلیغ بیان اپنے ذمے لیا ہے۔

۶-میری زندگی قرآنی علوم کے سمندر میں موج زن ہے اور ان ہی قلبی علوم کی وجہ سے میں زبان درازی کرنے کے قابل ہوا ہوں۔

۷-بہت سے صاف کرنے کی قابل چیزیں میرے باطن میں پوشیدہ ہیں یہاں تک کہ میں کسی اہل کو دیکھوں جو میرے دل کو پاک کر سکے۔

۸-جو شکار کرنے کی طاقت رکھتا ہے وہ آکر مجھ سے حاصل کرے کیونکہ ان نامانوس نکات تک پہنچنا ہر ایک کی دست قدرت میں نہیں ہے۔

۹-میری آرزو ایسا شخص ہے جو سلیم الذہن اور محنت کش ہو، مخلوق کے علوم سے سیراب ہوا ہو اور علم کی روشنی سے چمکتا رہے۔

۱۰-ایسے شخص کے بارے میں امید کی جاتی ہے کہ قرآنی مشکلات کے واضح بیان اور تفسیر کے لیے اس کی طرف رجوع کیا جائے۔

۱۱-قرآن اور اس کی آیات کے بارے میں میرے یہ اچھے افکار اللہ کی مہربانی اور فضل وعنایت کا نتیجہ ہیں۔

۱۲-جو کچھ مجھے ملا ہے رسول اللہ ﷺ کی برکت سے ہی میں نے حاصل کیا ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ میرے پاس عافیت کے ساتھ ایسے علوم آتے رہیں گے۔

۱۳-جب تک ہر روشن چیز کی روشنی باقی ہے تب تک اس پیغمبر پر اللہ کی رحمت ہو اور جب تک دن رات باقی ہیں تب تک اس پیغمبر پر اللہ کی سلامتی ہو۔

ان اشعار کی حلاوت اور شیرینی نے مجھے مجبور کیا کہ میں تمام اشعار یہاں ذکر کردوں، یہ اشعار علامہ سبکیؒ کے صاحبزادے بہاء الدین سبکیؒ نے "عروس الافراح شرح تلخیص المفتاح" میں ذکر فرمائے ہیں۔

حاصل یہ کہ باری تعالیٰ کا یہ کلام فصاحت و بلاغت کی انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور علوم ومعارف اور حقائق واسرار میں عالی شان ہونے کی وجہ سے گویا اتنا بعید المرتبت ہے جس تک پہنچنے سے خالص عربی تیز دوڑنے والا اونٹ اور مہاری اونٹ (مہرہ بن حمیۃ کا وہ تیز رفتار اونٹ جو دوڑنے میں مشہور تھا) قاصر ہے اسی طرح نظام عالم کے متعلق مختلف احکام انسانیت کی تربیت ان کے اخلاق کی تہذیب اور قلوب وارواح کی پاکیزگی سے متعلق دیگر کئی قوانین کے سلسلہ میں اتنا بلند مقام رکھتا ہے کہ نظر وفکر کی رسائی وہاں تک ممکن نہیں اور اسی طرح انوکھی معلومات، مختلف عجائبات پر مشتمل اور دیگر کئی خصائص اور امتیازات کا حامل ہے، یہی وجہ ہے ملت اسلامیہ کے فضلاء نے اپنی مبارک زندگیاں اور پاکیزہ لمحے قرآن کریم کے مختلف اسرار وحکم کی تلاش اور ان کے واضح کرنے میں گزار دیے اور الفاظ قرآنی کے محاسن سے حاصل شدہ دائمی عظمت کو بیان فرمایا، امت محمدیہ کے انہی اکابر نے اپنی کامیاب کوششوں کو قرآن کریم کے متعلق خرچ کیا اور اس کے بحر بیکراں میں غوطہ زن ہو کر لعل وجواہرات نکالے اور ان مختلف حاصل شدہ جواہرات

کو کتابوں کی صورت میں منظم ومرتب کر دیا۔

چند ضخیم تفاسیر

۱- ان مبارک ہستیوں میں سے ایک شیخ ابوعبداللہ محمد بن عبدالرحمن بخاری حنفیؒ ہیں جو "الزاھد العلاء" کے لقب سے معروف ہیں اور صاحب ہدایہ کے شیوخ کے طبقے میں شمار کئے جاتے ہیں، ۵۴۶ھ میں وفات پائی، قرآن کریم کی ایسی تفسیر مرتب فرمائی جو ہزار سے زیادہ اجزاء پر مشتمل ہے، شیخ قاسم بن قطلوبغا حنفیؒ نے "تاج التراجم" میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

۲- اور یہ شیخ ابویوسف عبدالسلام بن محمد القزوینیؒ (متوفی ۴۸۳ھ) جنہوں نے تین سو مجلدات پر مشتمل تفسیر تصنیف فرمائی، جس کا نام "حدائق ذات بهجة" رکھا اور صاحب "کشف الظنون" کے ایک قول کے مطابق یہ تفسیر پانچ سو جلدوں پر مشتمل ہے۔

۳- علامہ تاج الدین سبکیؒ کی طبقات کبریٰ سے صاحب کشف نے نقل کیا ہے کہ امام محمد بن جریر طبریؒ متوفی ۳۱۰ھ نے اولاً تیس ہزار صفحات پر مشتمل تفسیر تصنیف فرمائی، پھر اس تفسیر کا خلاصہ تین ہزار اوراق میں تحریر کیا، آج یہ ملخص تفسیر تیس جلدوں میں مطبوعہ حالت میں ہمارے سامنے موجود ہے، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اصل تفسیر جس کا اختصار تیس جلدوں میں ہوا، کم از کم تین سو جلدوں پر تو ضرور مشتمل ہوگی۔

۴- امام قاضی ابوبکر بن العربیؒ متوفی ۵۴۳ھ نے اسی ہزار اوراق پر محیط تفسیر لکھی جس کا انہوں نے اپنی کتاب "القبس" میں تذکرہ فرمایا ہے، صاحب کتاب "الديباج المذهب في معرفة أعيان المذهب" نے لکھا ہے کہ بعض علماء نے یہ تفسیر سلطان ابوعنان کی لائبریری میں اسی (۸۰) مجلدات میں دیکھی ہے۔

۵- ادھر اہل مغرب کے سب سے بڑے عالم وعارف صاحب "الفتوحات المكية" صوفیاء کے شیخ اکبر طائی اندلسیؒ متوفی ۶۲۸ھ کو لیجئے جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر میں (۶۰) ساٹھ جلدیں تحریر فرمائیں اور ان میں وہ نصف قرآن یعنی سورہ کہف تک پہنچ سکے۔

۶- صاحب کشف الظنون سے منقول ہے کہ شیخ جمال الدین ابوعبداللہ حنفی مقدسی

(متوفی ۶۹۸ھ) جو''ابن النقیب'' کی کنیت سے مشہور ہیں انہوں نے تقریباً پچاس جلدوں میں تفسیر لکھی جس کا نام "التحریر والتحبیر لأقوال أئمة التفسیر فی معانی کلام السمیع البصیر" رکھا، امام کفویؒ فرماتے ہیں کہ: یہ تفسیر اسی (۸۰) مجلدات پر مشتمل تھی اوراتنی مقدار سے آگے نہ بڑھ سکی، جبکہ علامہ عبدالحئی لکھنویؒ "الفوائد البھیة فی تراجم الحنفیة" میں نقل کرتے ہیں کہ: مجیرالدین حنبلیؒ نے اپنی کتاب "تاریخ القدس" میں لکھا ہے کہ: یہ تفسیر ننانوے جلدوں پر مشتمل تھی جس میں انہوں نے پچاس کے قریب تفاسیر سے استفادہ کرکے مواد جمع فرمایا تھا۔

۷-اسی طرح شیخ ابوالقاسم اصبہانیؒ متوفی ۵۳۵ھ نے تیس (۳۰) جلدوں میں تفسیر تالیف فرمائی۔

۸-امام شمس الدین ابومظفرؒ متوفی ۶۵۴ھ نے بھی تیس جلدوں پر حاوی تفسیر لکھی۔

۹-ابن الندیمؒ کے بیان کے مطابق شیخ مفضل بن سلمہ حنفیؒ جن کا شمار تیسری صدی ہجری کے علماء میں ہوتا ہے، انہوں نے "ضیاء القلوب فی معانی القرآن" کے نام سے تقریباً بیس جلدوں میں تفسیر لکھی۔

۱۰-اسی طرح ابن ندیم نے ذکر کیا ہے کہ: امام ابوبکر محمد بن الحسن انصاری النقاشؒ کی بھی ایک تفسیر ہے جس کا نام "التفسیر الکبیر" ہے اور یہ بارہ ہزار اوراق پر مشتمل ہے۔

۱۱-صاحب "ظہر الاسلام" صفحہ ۲۰۵ پر رقمطراز ہیں کہ: ''ابوبکرادفوی جو ابو جعفر نحاس کے شاگرد ہیں انہوں نے علوم القرآن کے متعلق ایک کتاب تالیف فرمائی جو ایک سو بیس (۱۲۰) مجلدات پر مشتمل ہے، ان کا انتقال ۳۸۸ھ میں ہوا، اور صفحہ ۲۸۰ پر تحریر کرتے ہیں کہ: (انہی نے) ایک تفسیر بھی تحریر فرمائی جو سو جلدوں پر مشتمل تھی اور لکھنے والے کی عمر اور اس کے قلم کی سیاہی کو ختم کردینے والی ہے، ابن سبکتگین نے اس کی تالیف پر علماء کو مقرر فرمایا''۔

علامہ زاہد کوثریؒ جن کا تذکرہ میں نے گذشتہ صفحات میں کیا تھا اپنے مقالات میں تحریر فرماتے ہیں ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

وأرجو القارئ الكريم أن يسمح لي أن أذكر بعض مؤلفات علماء هذه الأمّة في هذا الصدد ممّا يكون أنموذجا لمساعيهم الجبارة في مضمار تدوين المؤلفات ، فها هو تفسير الإمام أبي الحسن الأشعري المسمى "المختزن" في سبعين مجلدا على ما يذكره المقريزي فى "الخطط" ، وتفسير القاضي عبد الجبار الهمذاني المسمى "المحيط" في مائة سفر ، وتفسير أبي يوسف عبد السلام القزويني المسمى "حدائق ذات بهجة" أقل ما يقال فيه : إنّه في ثلاث مائة مجلد، و كان مؤلفه وقفه وجعل مقرّة مسجد الإمام أبي حنيفة ببغداد ، ثمّ صار في عداد الكتب التي ضاعت في أثناء استيلاء المغول على دار الخلافة ببغداد إلّا أنّي سمعتُ من أحد أدباء الهند [يريد به الأستاذ اللغوي الشيخ عبد العزيز الميمني] أنّه رأى قطعة منه في أحد فهارس الخزانات.

وللحافظ إبن شاهين تفسير في ألف جزء حديثي ، وللقاضي أبي بكر ابن العربي "أنوار الفجر" فى التفسير في نحو ثمانين ألف ورقة ، والمعروف أنه موجود في بلادنا إلّا أنّي لم أظفر به مع طول بحثي عنه ، ولابن النقيب المقدسي أحد مشايخ أبي حيان تفسير يقارب مائة مجلد يوجد بعض مجلدات منه في خزانة اصطنبول ، يوجد من تلك التفاسير بعض في بعض الخزانات فيما أعلم.

وأمّا أضخم تفسير تام يوجد اليوم - على ما نعلم - فهو تفسير "فتح المنان" المدعو بـ "التفسير العلامي" المنسوب إلى العلامة قطب الدين الشيرازي وهو في

أربعين مجلدا ، فالمجلد الأول منه موجود بدار الكتب المصرية ، و به تظهر خطته فی التفسير ، و فی مكتبتي محمد أسعد وعلی باشا -حكيم أوغلي - في اصطنبول من مجلداته ما يتم بها نسخة كاملة ، و للعلامة محمد الزاهر البخاري نحو مائة مجلد فی التفسير كما في "المنهل الصافي" و لعلماء هذه الأئمة تفاسير لا تحصی سوی ما تقدم علی اختلاف مسالكهم.

''اور میں قاری سے امید کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس بات کی اجازت دے گا کہ میں علماء امت اسلامیہ کی تفسیر قرآن کی خدمت کے سلسلے میں چند مؤلفات کا تذکرہ کروں جو تصنیف وتالیف کے میدان میں ان کی انتہائی محنتوں اور کوششوں کا ایک نمونہ ہے، چنانچہ علامہ مقریزیؒ "خطط" میں ذکر کرتے ہیں کہ امام ابوالحسن اشقریؒ نے "تفسیر المختزن" ستر جلدوں میں تحریر فرمائی، قاضی عبدالجبار ہمدانیؒ کی تفسیر "المحیط" کے نام سے سو جلدوں پر مشتمل ہے۔

شیخ ابو یوسف عبدالسلام قزوینیؒ کی تفسیر "حدائق ذات بهجة" جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ کم از کم تین سو جلدوں میں ہے، کہتے ہیں کہ مصنفؒ نے اپنی اس تفسیر کو بغداد میں واقع امام اعظم ابوحنیفہؒ کی مسجد کے لیے وقف کر دیا تھا، بعد ازاں دار الخلافہ بغداد میں مغلوں کی شورش کے دوران اس کتاب کی کچھ جلدیں ضائع ہوگئیں، لیکن میں نے ہندوستان کے ایک نامور ادیب [ماہر لغت علامہ عبدالعزیز میمنیؒ] سے سنا ہے کہ انہوں نے اسی تفسیر کا کچھ حصہ کسی کتب خانے کی فہرست میں دیکھا تھا۔

اسی طرح حافظ ابن شاہینؒ کی تفسیر بھی ہے جو آج کل کی ہزار جلدیں بنتی ہیں، اسی طرح قاضی ابوبکر ابن العربیؒ کی تفسیر "انوار الفجر" جو اسی (۸۰) ہزار اوراق پر مشتمل ہے، مشہور ہے کہ یہ ہمارے ملک میں پائی جاتی ہے، لیکن راقم بہت بحث وتفتیش کے بعد بھی اس کتاب کے ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہوسکا، ابن نقیب مقدسیؒ جو ابوحیانؒ کے مشائخ میں سے ہیں، ان کی بھی سو (۱۰۰) جلدوں پر مشتمل ایک تفسیر ہے جن میں سے بعض جلدیں استنبول کے کتب خانے میں

موجود ہیں، اور میری معلومات کے مطابق ان تفاسیر کی کچھ کچھ جلدیں مختلف کتب خانوں سے مل سکتی ہیں۔

رہی بات آج کل کی ضخیم ترین اور مکمل تفسیر کی، تو میرے علم میں ایک تفسیر "فتح المنان" ہے جو "التفسير العلامي" کے نام سے بھی مشہور ہے اور علامہ قطب الدین شیرازیؒ کی طرف منسوب ہے، یہ تفسیر چالیس جلدوں میں ہے اور اس کی پہلی جلد "دار الكتب المصرية" میں موجود ہے، جس سے ان کے تفسیری اسلوب کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، استنبول کے کتب خانہ محمد اسعد اور کتب خانہ علی پاشا (حکیم اوغلی) میں اس کی مختلف جلدیں موجود ہیں، جن سے اس تفسیر کا ایک مکمل نسخہ دستیاب ہوسکتا ہے، اسی طرح "المنهل الصافي" میں لکھا ہے کہ علامہ محمد زاہر بخاریؒ کی بھی تحریر کردہ ایک تفسیر ہے جو سو جلدوں پر مشتمل ہے، ان مذکورہ تفاسیر کے علاوہ بھی علماء امت کی ان کے اپنے اپنے منہج واسلوب کے مطابق تفاسیر ہیں جن کا شمار نا ممکن ہے۔"

بڑی تفاسیر کے متعلق جو میری محدود و ناقص معلومات تھیں وہ سپرد قلم کر دی گئیں، رہی بات ان تفاسیر کی جو دس جلد یا اس سے کم وبیش پر مشتمل ہیں تو ایسی تفاسیر بے شمار ہیں جن کا احاطہ ممکن نہیں، متقدمین ومتاخرین علمائے امت کی قرآن کریم کے اسرار ومعارف کے بیان کرنے میں اس سخت جدو جہد کی عکاس ہیں، جو انہوں نے اس میدان میں فرمائی اور ہر ایک برتن سے وہ کچھ نکلا جو اس میں تھا، ہر مفسر نے اسی نقطۂ نظر سے قرآن کریم میں غور وخوض کیا جس فن سے وہ دلی شغف اور قلبی محبت رکھتا تھا، چنانچہ ایک محدث کا طریقۂ کار روایات اور ان کے طرق کے متعلق بحث رہی جیسے کہ ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں اور علامہ سیوطیؒ نے "الدر المنثور" میں کیا، اسی طرح دیگر کئی محدثین نے یہی اسلوب اختیار کیا۔ فقیہ نے مسائل کے استنباط واستخراج کی طرف توجہ کی جیسے کہ امام قرطبیؒ وغیرہ، نحوی حضرات قرآن کریم کے اعراب، الفاظ قرآنی کی ترکیب و اسلوب اور نظم قرآن کے سمندر میں غوطہ زن ہوئے جیسے کہ ابی حیان نے اپنی تفسیر "بحر" اور "نہر" میں کیا۔ علم بلاغت سے شغف رکھنے والے مفسر نے قرآن کریم کے اطناب وایجاز میں پوشیدہ

اعجاز کو ظاہر کرنے میں اپنا شوق دکھایا، اور قرآن کریم کے مطالع ومقاطع اور اس کے عجائب وغرائب میں موجود حسن کی وضاحت کی، جیسا کہ علامہ زمخشریؒ نے اپنی کتاب ''کشاف'' اور ابو سعودؒ نے ''ارشاد'' میں یہ طریقۂ کار اپنایا۔ متکلم مفسر نے علم کلام کو اپنی جولانگاہ جانا جیسے کہ امام رازیؒ کا اپنی تفسیر ''مفاتیح'' میں یہی منہج رہا، مگر اتنی بات ضرور ہے کہ اس میں دیگر کئی مختلف مسائل کے تحت بے شمار قیمتی جواہرات ہیں، اسی طرح ایک منطقی مفسر کے مدنظر قیاس کی ترتیب اور رسوم وحدود کے متعلق بحث وتفتیش رہی جیسے: ابن سینا نے سورہ اخلاص کی تفسیر میں یہ اسلوب اپنایا۔ جدید فلسفی کے مطمح نظر کائنات میں پھیلی اللہ کی نشانیاں، عنصری عجائب اور طبعی غرائب کا بیان رہا، جیسا کہ شیخ جوہری طنطاویؒ نے اپنی تفسیر کو فلکی، عنصری اور طبعی عجائبات سے اتنا بھر دیا ہے کہ بادی النظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا قرآن اسی لیے نازل ہوا تھا۔

خلاصہ یہ کہ ہر ایک نے اپنا تھیلا اور برتن خالی کیا اور اپنی ترکش میں بھری معلومات کو سپرد قلم کر دیا، اور یہ معاملہ خدائے پاک کے تقدیری فیصلے کے مطابق ہے، تاکہ سب پر واضح ہو جائے کہ اس کلام الٰہی کے عجائب وغرائب کبھی ختم نہ ہوں گے اور جو خبر، صادق، امین، پیغمبر محمد مصطفی ﷺ نے دی ہے وہ اسی طرح سب پر عیاں ہو جائے جیسا کہ سورج کی وسطِ فلک میں رونق افروزی ہے۔

گذشتہ سطور میں مختلف تفاسیر کے مناہج ذکر ہوئے ان میں سے بعض دیگر سے اہم ہیں اور امید یہی ہے کہ بڑی تفاسیر جن کا تذکرہ ہوا، وہ تمام اہم معلومات وفوائد کی جامع ہوں اور ان مفسرین کی بصیرت وبصارت کی جس قدر رسائی ہوگی یہ بڑی تفاسیر ان تمام خصوصیات وامتیازات کی ضرور حامل ہوں گی، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ بغداد کے مفتی سید محقق حنفی آلوسیؒ کا ان کی تفسیر کی وجہ سے علماء پر بڑا احسان ہے، اس لیے کہ یہ تفسیر اہل علم کے ہاتھوں میں موجود تمام تفاسیر میں سب سے زیادہ جامع ہے، ان کی یہ تفسیر روایت ودرایت، فقہ وحدیث، فصاحت وبلاغت، ترکیب ولغت اور کلام وتصوف غرض تمام علوم کو شامل ہونے کے اعتبار سے ایک گرانقدر تفسیر ہے، جس میں الفاظ کی ترتیب اور معانی کا نظم ونسق بھی معیاری ہے، گویا یہ پوری تفسیر قیمتی لعل

د جواہرات سے مرصع ومزین ہے، اللہ رب العزت اس تفسیر کو مؤلف کے لیے بروز قیامت اچھا ذخیرہ فرمائے، آمین۔

میرے فاضل ذکی دوست حضرت مولانا لطف اللہ پشاوری نے ہمارے شیخ امام العصر رحمہ اللہ کے حوالے سے مجھے بتایا کہ انہوں نے فرمایا ''قرآن کریم کی تالیف شدہ تفاسیر کی تعداد دو لاکھ تک پہنچتی ہے''۔

واقعی جب کتاب، اللہ تعالیٰ کی کتاب ہو تو وہ اسی شان کے لائق ہے، اور جب قرآن کریم کے بارے میں علمائے امت کے علوم کا یہ حال ہے تو حضرات صحابہ کرامؓ کے علم کے بارے میں آپ کا کیا گمان ہے؟

یہ بات اس روایت سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو امام مالکؒ نے اپنی مؤطا میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نقل کی ہے کہ ''انہوں نے قرآن کریم کو یاد کرنے (سمجھنے) میں آٹھ سال کا عرصہ لگایا''۔ اور اسی طرح امام سیوطیؒ وغیرہ نے امام مجاہدؒ سے روایت کی ہے وہ فرماتے تھے کہ ''میں نے ابن عباسؓ سے قرآن کریم کو تیس بار پڑھا''۔

(یہ تو صحابہ کی بات ہوئی) پھر ان علوم کے بارے میں آپ کا کیا گمان ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس ہستی کے ساتھ خاص کیا ہے جس کو اولین اور آخرین کا علم عطا فرمایا ہے، جو روئے زمین پر اب تک جتنے لوگ آئے ہیں یا جو آئندہ آئیں گے ان میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے ہیں، وہ ذات جن کے ذریعے یہ کتاب نازل ہوئی۔ یہاں تو یہ بھی ممکن نہیں کہ پوری امت کے قلوب ان علوم کو جمع کرلیں جو اللہ نے اس امت کے پیغمبر خاتم النبیین سید المرسلین ﷺ کے سینہ اطہر میں ودیعت فرمائے ہیں۔

پھر اس سے مزید اور آگے اس کتاب کے نازل کرنے والے کی طرف ذرا توجہ مبذول کیجیے، وہ کتاب جس کی آیات کو محکم بنایا گیا اور جسے حکیم وخبیر ذات کی طرف سے خوب تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا، اس ذات کے علوم کے بارے میں آپ کا کیا گمان ہے؟ وہ علوم جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس اپنے غیب کے خزانوں میں رکھے ہیں، وہ ذات ہی ایسی ہے جس کا ذکر

بلند و بالا ہے اور جس کی دلیل بہت عظیم ہے۔

نہایت ہی دور کی بات ہے کہ جاہل مخلوق کی خالق علیم وحکیم کے ساتھ کوئی ادنی نسبت ہو، حضرت خضر علیہ السلام کی مثال اس بات کو واضح کر دیتی ہے، وہ پھر بھی ایک مثال ہے، حقیقت نہیں ہے، اس لیے کہ قطرہ اور سمندر دونوں متناہی اور ختم ہونے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بلند و بالا ہے کہ اس کے علم کی طول وعرض میں کوئی حد مقرر کی جائے، ان کا علم ساتوں آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے اور یہ کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قل لو كان البحر مدادًا لكلمات ربي لنفد البحر قبل أن تنفد كلمات ربي ولو جئنا بمثله مددا﴾

[الكهف:١٠٩]

ترجمہ: ''اے نبی کہدو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے روشنائی بن جائیں تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی بلکہ اتنی ہی روشنائی اور لے آئیں۔

اور فرمایا:

﴿ولو أنّ ما في الأرض من شجرة أقلام والبحر يمدّه من بعده سبعة أبحر ما نفدت كلمات الله إنّ الله عزيز حكيم﴾ [لقمان:٢٧]

ترجمہ: ''زمین میں جتنے درخت ہیں، اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر جیسے سات مزید سمندر، روشنائی مہیا کریں، تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی، بیشک اللہ زبردست اور حکیم ہے''۔

پس جس شخص نے بھی قرآن کریم کی تفسیر لکھی، چاہے وہ سینکڑوں جلدوں میں ہو، بلکہ ہزاروں جلدوں میں ہی کیوں نہ ہو، اس شخص نے ان تمام علوم کا احاطہ نہیں کیا جو قرآن کریم میں موجود ہیں، صاحب اتقان، امام ابن ابی الدنیا سے نقل فرماتے ہیں کہ:

''علوم القرآن وما يستنبط منه بحر لا ساحل له''

''قرآن کریم متعدد علوم اور استنباطات (وہ مسائل جو اس سے استنباط کیے جائیں)

کے لیے بحرِ ناپید کنار کی مانند ہے۔''

ہاں البتہ ہر شخص اپنے حصہ اور کوشش کے بقدر علم کا احاطہ کرسکتا ہے اور ہر شخص اپنی لمبی رسی میں لکڑیاں جمع کرتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

و ما کل من قال القریض بشاعر
و لا کل من عانی الهوی بمتیم

ترجمہ: ''اور ہر وہ شخص جس نے شعر کا ایک ٹکڑا کہہ دیا وہ شاعر نہیں ہے، اور ہر وہ شخص جو عشق کی مشقت برداشت کر لے وہ عاشق نہیں ہے''۔

اور کسی نے کہا:

وما کل مخضوب البنان بثینة
و لا کل مصقول الحدید یماني

ترجمہ: ''ہر وہ انسان جس کی انگلیوں کے پورے رنگے ہوئے ہوں وہ بثینہ نہیں، اور ہر وہ تلوار جس کے لوہے کی قلعی کی گئی ہو وہ یمنی تلوار نہیں ہے۔''

حق اور سچ بات یہ ہے کہ حقیر مخلوق، خالق بزرگ و برتر کے کلام کا حق ادا نہیں کرسکتی، پس ان کے قدم باز رہ گئے، اور ان کی حرص بہرحال پیچھے ہی رہی اور ان کی ہمتیں جواب دینے لگیں، اسی وجہ سے علوم قرآن میں سے بہت سے علوم تا حال اپنے مرکز و معدن میں چھپے رہے اور اسی طرح چھپے رہیں گے، ہاں! البتہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں پر علوم قرآنی کی موسلادھار بارش برسانے کا ارادہ ازل کی ثبت شدہ تقدیر کے مطابق فرمالیں تو معارف ربانی کے چڑھتے بادل، علوم قرآن سے امت کے سینوں کو خداوند کریم کی مشیت تک سیراب کرتے رہیں گے اور اگر قرآن کے معارف کا شوق بیدار ہوجائے تو یقیناً امید ہے کہ خداوند بنجر و خشک زمین کی مانند دلوں کو ان علوم سے سیراب فرمائیں گے، کبھی دل میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے پوشیدہ علوم کو ہر زمانے میں اس وقت ظاہر فرماتے ہیں جب اہل زمانہ اس کی طرف احتیاج کا اظہار کریں اور نفوس انسانی اس میں ذوق و شوق رکھیں۔

اور یہ بات واقعی ایک حقیقت بن کر سامنے بھی آ رہی ہے چنانچہ آپ صحابہ کے زمانے سے لے کر ہمارے زمانے تک قرآن کریم کی ہر زمانے کی تالیف کردہ تفاسیر کا بنظر غائر مشاہدہ ومطالعہ فرمالیجیے، اوراس پہلو کی طرف ایک اجمالی نظر ڈالیں تو میری ناقص رائے کی حقیقت آپ کو معلوم ہوجائے گی اور مجھے امید ہے کہ اہل فکرونظر کے قلوب اس بات کوقبول کرلیں گے، اگر مجھے مقصد سے دور ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اس موضوع پر تحقیق کا حق ادا کرتا، البتہ عقلمندوں کے لیے اشارات میں کفایت ہے۔

میں بالکل پرامید ہوں کہ اسلامی علوم کے خزانے (علماء) یہ قیمتی جواہر دنیاوالوں کے سامنے لانے کی مہربانی کریں گے، جیسا کہ ان دنوں اس کے آثار نظر آنے لگے ہیں چنانچہ بہت سارے ایسے پوشیدہ اسلامی علوم اور علمائے امت کے علمی خزانوں سے، لوگوں کے کتب خانے بھر گئے ہیں، وہ علمی خزانے جن کو زمانے نے بخل کی بنا پر چھپا رکھا تھا اور گمان تھا کہ حوادث زمانہ نے ان کو نایاب کردیا ہے، جبکہ لوگ انتہائی بے چینی کے ساتھ اس کی طرف محتاج ومشتاق تھے، یہیں سے ہمیں اس بات کا بھی پتہ مل جاتا ہے کہ خداوند کریم ہر زمانہ میں اپنی حجت کو تمام مخلوق پر تام فرمادیتے ہیں۔

تفسیر قرآن میں سب سے اہم اور معتبر ذریعۂ تفسیر؟

میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ امت کی یہ تمام مبارک کوششیں اس لائق ہیں کہ ان کی قدر ومنزلت کو قلب وجگر میں جگہ دی جائے ،اس لیے کہ انہوں نے حسب استطاعت علوم قرآن کی تشریح وتوضیح اور اس کی عظمت کی حفاظت اور دفاع میں اپنی محنتوں کو صرف کیا، اس امت میں ان حضرات مکرمین کے بعد آنے والوں کے کاندھوں پر ان کا بڑا احسان ہے۔

تفسیر قرآن بذریعہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بہرحال! قرآن کریم کی سب زیادہ اہم اور معتبر تفسیر وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی اور آپ کے بتائے ہوئے طریقے اور راستے پر غور کر کے اس کی روشنی میں لکھی گئی ہو، خواہ وہ آپ کا قول وعمل ہو یا اشارہ ودلالت، اس لیے کہ آپ کی پاکیزہ زندگی اور آپ کی مبارک ومقدس سیرت اللہ رب العزت کی کتاب کی ایسی بے مثال تشریح ہے جس کا براہ راست آنکھوں سے مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور جس تشریح وتوضیح کے بعد قرآنی غرض ومقصد کے بیان کے لیے افکار ونظریات کی گتھیاں سلجھانے کی حاجت باقی نہیں رہتی ہے ،اس بات کی وضاحت صدیقہ بنت صدیق سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول سے بخوبی ہوجاتی ہے فرماتی ہیں: ''كأنّ خلقه القرآن''

ترجمہ: قرآن کریم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت تھی

ہمارے شیخ حضرت امام العصر فرمایا کرتے تھے کہ:

''جب انسان پوری توجہ کے ساتھ حدیث شریف میں غور وفکر کرے تو بہت سی احادیث سے یہ بات واضح ہوجائیگی کہ قرآن کریم گویا بہت زیادہ بہنے والا ایک ایسا چشمہ ہے،

جس سے علوم نبوت پھوٹ رہے ہوں، یہاں تک کہ آپ بہت سی احادیث میں قرآن کریم کے معنی کی وضاحت کے لیے باریک اشارات دیکھیں گے۔ اور اس کے لیے امام جلال الدین سیوطیؒ متوفی (۹۱۱ھ) کی تفسیر "الدر المنثور فی التفسیر الماثور" جتنی مفید ہے اتنی کوئی اور تفسیر مفید نہیں۔''

راقم الحروف کہتا ہے کہ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جسے امام سیوطیؒ نے اپنی کتاب ''الاتقان'' میں نقل کیا ہے:

''امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی فیصلہ فرمایا ہے وہ حقیقت میں وہی ہے جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم سے سمجھا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إنّا أنزلنا إليك الكتاب بالحقّ لتحكم بين النّاس بما أراك الله﴾ [النساء:١٠٥]

یعنی ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل فرمائی حق کے ساتھ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز سے فیصلہ فرمائیں جو اللہ نے آپ کو سمجھائی۔''

ہمارے شیخ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم کی مراد اس وقت تک معلق رہتی ہے جب تک حدیث کی طرف رجوع نہ کیا جائے اور حدیث شریف کو قرآن کریم کے لیے شرح نہ بنایا جائے اور اسی طرح حدیث شریف کا مفہوم ومقصد معلق رہتا ہے جب تک کہ فقہ کی طرف رجوع نہ کیا جائے اور اس کے ذریعہ بات کی حقیقت کا ادراک نہ کیا جائے۔

حافظ ولی الدین العراقیؒ اور ابن مرزوقؒ کے شاگرد شیخ عبدالرحمن ثعالبی جزائریؒ (متوفی ۸۷۵ھ) نے اپنی کتاب "الجواهر الحسان في تفسير القرآن" میں نقل کیا ہے کہ حافظ ابوعمرو بن عبداللہ القرطبیؒ متوفی (۴۶۳ھ) اپنی کتاب "التقصی" میں فرماتے ہیں:

"و أولى الأمور بمن نصح نفسه وألهم رشده معرفة السنن التي هي البيان لمجمل القرآن ، بها يوصل إلى مراد الله تعالى من عباده فيما تفيدهم من

شرائع دينه الذي به الابتلاء وعليه الجزاء في دار الخلود والبقاء التي يسعى لها الألباء والعقلاء والعلماء والحكماء ؛ فمن منّ الله عليه بحفظ السنن والقرآن فقد جعل بيده لواء الإيمان ، فإن فقه وفهم واستعمل ما علم دعي في ملكوت السماوات عظيما ، ونال فضلا جسيما."

''اولی الامر (علماء) وہ ہیں جو اپنے نفس کی اصلاح کریں اور انہیں احادیث کی معرفت کا الہام ہو جو کہ قرآن کریم کے اجمال کی تشریح ہیں، اسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی اس مراد تک رسائی ممکن ہے جو وہ اپنے بندوں کو بیان کرنا چاہتا ہے، نیز ان دینی احکام تک رسائی ہوگی جو لوگوں کے لیے سودمند ہیں، جن کے ذریعے (بندوں) کی آزمائش ہوتی ہے اور جن پر ابدی گھر (جنت) کو حاصل کرنے کا دارومدار ہے، جس کے لیے اولیاء علماء، حکماء اور دانش وران قوم سب ہی کوشاں ہیں، چنانچہ جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن وسنت کی حفاظت کا احسان کیا ،گویا اس کے ہاتھ ایمان کا جھنڈا دیا گیا، اگر اس کو ساتھ ساتھ فہم فقہ عطا ہو اور اپنے علم پر بھی عمل کرے تو ایسے شخص کو آسمان والوں کے ہاں عظیم (بڑے ہونے) کا لقب مل جاتا ہے اور وہ بڑا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔''

تفسیر قرآن بذریعہ اقوال وآثار صحابہ

اس کے بعد وہ تفسیر اہمیت کی حامل ہے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی حیات مبارکہ کے انوار کی روشنی میں ہو، اس لیے کہ وہ امت کے ستارے اور دین کے راہنما ہیں اور قرآن کریم کے اولین مخاطب ہیں اور امت میں سب سے پہلے یہی لوگ ہیں جنہیں بھلائیوں کے کرنے کا حکم دیا گیا اور برائیوں سے روکا گیا، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قرآن کریم کے متشابہات اور مشکل مقامات کے متعلق پوچھا، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے مجمل اور مبہم کو کھول کھول کر بیان کیا، یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے مشکل الفاظ

کے معانی ومطالب تک رسائی حاصل کی، جنہوں نے سب سے پہلے (آیات کریمہ) کے شان نزول کا علم حاصل کیا اور ان کے نازل ہونے کے مقاصد پر مطلع ہوئے اور بیشک یہ لوگ ان صفات کے مالک ہیں جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ:

"أولئك أصحاب محمّد ﷺ أفضل هذه الأمّة ، وأبرّها قلوبًا ، وأعمقها علمًا ، وأقلّها تكلّفا ، اختارهم الله لصحبة نبيّه و لإقامة دينه ، فاعرفوا لهم فضلهم ، واتّبعوا على أثرهم ، و تمسّكوا بما استطعتم من أخلاقهم و سيرتهم ؛ فإنّهم على الهدى المستقيم.

ترجمہ: "یہ لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں، امت میں سب سے افضل ہیں، سب سے زیادہ پاکیزہ قلوب کے مالک ہیں، سب سے زیادہ علم رکھنے والے ہیں اور سب سے کم تکلف کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی صحبت اور دین قائم رکھنے کے لیے انہیں چنا ہے، آپ لوگ ان کے مرتبہ (مقام) کو پہچانیں اور ان کے نقش قدم پر چلیں اور اپنی طاقت کے مطابق انکے اخلاق اور سیرت کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں اس لیے کہ وہ صراط مستقیم پر ہیں۔"

اور جیسا کہ ان کے بارے میں امام ابوداؤدؒ نے اپنی سنن ابوداود کے "باب لزوم السنة" میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، انہوں نے فرمایا:

"فارض لنفسك ما رضي به القوم لأنفسهم ؛ فإنّهم على علم وقفوا ، وببصر نافذ قد كفوا ، وهم على كشف الأمور كانوا أقوى ، وبفضل ما كانوا فيه أولى، فإن كان الهدى ما أنتم عليه سبقتم إليه ، ولئن قلتم : إنّما أحدث بعدهم ما أحدثه إلّا من اتبع غير سبيلهم ورغب بنفسه عنهم فإنّهم هم السابقون فقد تكلّموا فيه بما يكفي ، ووصفوا منه ما يشفي ،

فما دونهم من مقصر ، وما فوقهم من محسر وقد قصر
أقوام دونهم فجفوا ، وطمح عنهم أقوام فغلوا ،
وإنّهم بين ذلك لعلى هدى مستقيم.

''تو اپنے نفس کے لیے ان چیزوں پر راضی ہو جا جس پر صحابہ اپنے نفس کے لیے راضی ہوئے ،اس لیے کہ وہ علم رکھنے والے ہیں اور انہیں گہری نظر وفکر عطا کی گئی اور وہ امور دینیہ کی حقیقت پر مطلع ہونے میں بہت قوی تھے اور وہ اس مرتبہ کے لیے جو ان کا تھا زیادہ موزوں تھے،اور اگر ہدایت کا راستہ وہی ہوتا جس پر تم ہو تو وہ لوگ تم سے پہلے اس تک پہنچ جاتے اور اگر تم کہو کہ ان کے بعد اگر کسی نے دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کی تو اس نے اس کو ایجاد نہیں کیا مگر اس نے حضرات صحابہ کرام کے علاوہ اوروں کی اتباع کی اور اس نے صحابہ سے اعراض کیا، اس لیے کہ وہی لوگ آگے بڑھنے والے ہیں، پس انہوں نے مسائل میں کافی شافی کلام کیا، ان سے کم کوئی مختصر عمل کرنے والا نہیں اور ان سے زیادہ عمل کے لیے کوئی تھکنے والا نہیں اور جن لوگوں نے ان سے زیادہ کمی کی کوشش کی تو گویا انہوں نے ظلم کیا اور جن لوگوں نے ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو انہوں نے زیادتی کی اور وہ اس بیچ (اعتدال) میں صراط مستقیم پر ہیں۔''

قرآن کریم کی تفسیر وتشریح کے علمی میدان میں سب سے سبقت پانے والے خلفاء راشدینؓ تھے اور ان میں حضرت علیؓ کا نام گرامی تو خاص طور پر سر فہرست ہے، پھر حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں، جنہیں ترجمان القرآن اور خیر الامۃ سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا تفسیری درجہ ہے جو بقول حضرت عمر فاروقؓ گویا علم سے بھرے ہوئے برتن کی طرح تھے اور ان کی وجہ سے اہل قادسیہ دیگر شہر والوں پر فضیلت دیے جانے لگے تھے، حضرت عمر فاروقؓ کے اس مدح کے الفاظ یہ تھے:

''كنيف ملئ علما، آثرت به اهل القادسية''

[طبقات ابن سعد ١٥-٢]

چنانچہ صاحب ''الجواهر الحسان'' فرماتے ہیں:

''صحابہ کرام میں صدر المفسرین اور تائید ایزدی سے سب سے زیادہ مؤید حضرت علیؓ

بن ابی طالب تھے اور ان کے بعد حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا درجہ تھا، حضرت ابن عباسؓ نے تو اسی تفسیر کے میدان میں یکسوئی اختیار کی اور اس تفسیری کام کو اپنی بساط کے مطابق مکمل فرمایا۔ کئی تابعین نے ان کی پیروی اور ان سے استفادہ کیا، جن میں حضرت مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ وغیرہ حضرات کے نام سرفہرست ہیں، اسی وجہ سے حضرت ابن عباسؓ سے منقول تفسیری روایات حضرت علیؓ سے منقول روایات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں، جب کہ حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے: ''جو تفسیری نکات وفوائد مجھے حاصل ہوئے ہیں وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا افادہ ہے''، ادھر حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ کی مدح فرماتے اور ان سے تفسیری استفادہ کی ترغیب دیا کرتے تھے، اور ابن مسعودؓ کہا کرتے تھے کہ: ''ہاں! ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں''، اور انہی حضرت ابن عباسؓ کے متعلق رسول کریم ﷺ نے یوں دعا فرمائی:

''اللّٰهم فقّهه فى الدين وعلّمه التأويل''

ترجمہ: اے اللہ! ان کو دین کی سمجھ بوجھ عطا فرمایئے اور ان کو قرآنی تاویلات کا علم نصیب فرمایئے۔

حضرت ابن عباسؓ کی قدر جاننے کے لیے ان کے حق میں رسول کریم ﷺ کی یہ دعا ہی کافی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے بعد علم تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مرتبہ ہے اور ان کے بعد حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا درجہ ہے، اور وہ تمام روایات جو صحابہ سے منقول ہیں وہ ''حسن'' اور تابعین سے منقول روایات پر مقدم شمار ہوں گی۔

تابعین کرام میں حضرت حسن ابن ابی الحسنؒ، مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ اور علقمہؒ تفسیر قرآن سے متعلق سر برآوردہ شخصیات شمار کی جاتی ہیں۔ حضرت مجاہدؒ نے تو حضرت ابن عباسؓ سے ہر آیت کے مفہوم کی واقفیت حاصل کی تھی۔ ان حضرات کے بعد حضرت عکرمہؒ اور ضحاک بن مزاحم کا رتبہ ہے، اگرچہ ضحاکؒ نے ابن عباسؓ سے استفادہ نہیں فرمایا، بلکہ ابن جبیرؒ سے علم تفسیر اخذ کیا تھا۔

امام سدیؒ کے بارے میں عامر شعبیؒ نے طعن فرمایا ہے، اسی طرح ابو صالحؒ کے بارے میں بھی امام شعبیؒ کا طعن مروی ہے، کیونکہ شعبیؒ ان دونوں حضرات کو کوتاہ نظر وفکر کا حامل

گردانتے تھے۔

مذکورہ بالا علماء کے علاوہ قرآن کریم کی تفسیری روایات کو محفوظ کرنے میں ہر زمانے کے منصفین اور اعتدال پسند علماء کی جماعت شامل رہی اور علم تفسیر پر ہر دور میں علماء نے خامہ فرسائی کی، جیسے عبدالرزاقؒ، مفضلؒ، علی بن ابی طلحہؒ اور امام بخاری رحمہم اللہ، بعد ازاں محمد بن جریر طبریؒ نے مختلف تفاسیر کو یکجا کیا اور منتشر روایات کو جمع فرما کر اسناد سے متعلق تشفی بخش خدمت سرانجام دی۔

متاخرین علماء میں علم تفسیر سے شغف رکھنے والوں میں سے ابواسحاق الزجاج اور ابوعلی الفارسیؒ کو توضیعف بتایا جاتا ہے، جبکہ ابوبکر النقاش اور ابوجعفر النحاس رحمہما اللہ کے کلام پر علماء نے استدراک فرمایا ہے، اسی طرح مکی بن ابی طالبؒ اور ابو العباس المہدویؒ کے کلام میں علماء نے غلطیوں کی نشاندہی فرمائی ہے، بہرحال یہ تمام حضرات مجتہدین تھے اور اپنے درجات کے اعتبار سے ماجور بھی، رحمہم اللہ تعالی ونضّر وجوھھم۔

اس موضوع کے متعلق مزید تفصیل کے لیے ابن ندیم کی ''الفھرست'' دیکھی جاسکتی ہے اور خاص طور پر صفحہ: ٥٠ سے ٥٩ (مطبوعہ مصر) تک انتہائی گرانقدر معلومات ملاحظہ کی جاسکتی ہیں، اسی طرح صاحب ''کشف الظنون'' نے جو علم تفسیر کے متعلق تفصیل ذکر فرمائی ہے اسی طرح امام سیوطیؒ کی ''الاتقان'' کی نوع ثمانین (باب نمبر: ٨٠) بھی اسی موضوع کے متعلق تفصیلات جاننے کے خواہش مند حضرات کے لیے فائدہ مند ہوں گی۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ امت کے وہ چنیدہ اشخاص تھے جو اپنی درست سمجھ بوجھ، صحیح علم اور عمل صالح میں ممتاز درجہ پر فائز تھے، چنانچہ وہ علم میں راسخ اور اپنی درست، دانستگی میں سب سے سبقت لے گئے اور اپنے اعمال کی طرف پوری توجہ دینے والے اور یکسو تھے اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ: ''سبق المفرّدون''.

یعنی یکسو رہنے والے لوگ سبقت لے گئے۔

علامہ سیوطیؒ نے اٹھترویں قسم (باب: ٧٨) میں ابن تیمیہؒ سے منقول یہ کلام نقل کیا ہے: کہ یہ عقیدہ رکھنا بھی واجب ہے کہ جس طرح نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے لئے قرآن

کریم کے الفاظ بیان فرمائے ،اسی طرح ان کو قرآن کریم کے معانی سے بھی روشناس کروایا، چنانچہ فرمان باری تعالیٰ: ﴿لتبيّن للناس ما نزّل إليهم﴾ الفاظ ومعانی دونوں کو شامل ہے۔

امام احمدؒ نے اپنی مسند میں نقل فرمایا ہے کہ حضرت ابوعبدالرحمن السلمیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ وغیرہ جیسے قرآن کریم پڑھنے والے حضرات نے ہمیں بتایا کہ وہ حضرات جب نبی کریم ﷺ سے دس آیات سیکھ لیا کرتے تھے تو اگلی آیات اس وقت تک نہ سیکھتے جب تک کہ ان دس آیات کے متعلق کامل علم وعمل نہ سیکھ لیتے اور کہتے تھے کہ اسی وجہ سے ہم نے قرآن، علم وعمل سب ساتھ سیکھا۔ بنابریں ایک مدت تک ایک سورت ہی یاد کیا کرتے تھے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ: ''کوئی شخص اگر سورہ بقرہ اور آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نظروں میں بڑا اعالی مرتبہ شمار ہوتا تھا''۔

امام سیوطیؒ نے نقل کیا ہے کہ عارف ابن ابی حمزہؒ حضرت علیؓ سے نقل فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ''اگر میں چاہوں کے سورہ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹوں کو بوجھل کر دوں تو میں اس طرح کرسکتا ہوں۔'' (یعنی اس کی تفسیر میں اس قدر علمی فوائد ونکات بیان کردں کہ ان کو اگر لکھا جائے تو یہ اوراق تعداد میں ستر اونٹوں کے بوجھ کے بقدر ہو جائیں) پھر حضرت علیؓ نے عوام کی دانستگی کے پست معیار کے موافق ومطابق باتیں بیان فرمائیں۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ حضرت باری تعالیٰ کا سورۂ جمعہ میں مذکور فرمان:

﴿هو الذى بعث فى الأمّيّين رسولاً منهم يتلو عليهم أياته و يزكّيهم و يعلّمهم الكتاب والحكمة و إن كانوا من قبل لفى ضلال مبين﴾ [الجمعة:۲]

اور سورۂ آل عمران میں مذکور یہ فرمان:

﴿لقد منّ الله على المؤمنين إذ بعث فيهم رسولاً من أنفسهم يتلو عليهم أياته و يزكّيهم و يعلّمهم الكتاب والحكمة وإن كانوا من قبل لفى ضلال مبين﴾ [آل عمران:١٦٤]

اور سورہ بقرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤوں کی ذیل میں یہ فرمان:

﴿ربّناو ابعث فيهم رسولا منهم يتلو عليهم اٰياتك ويعلّمهم الكتاب والحكمة ويزكّيهم إنّك أنت العزيز الحكيم﴾ [البقرة:١٢٩]

یہ فرامین مقدسہ ابن تیمیہؒ وغیرہ حضرات کے کلام پر واضح ترین دلائل وشواہد ہیں اور صحابہ کرامؓ الفاظ ومعانی کے جاننے والے کیونکر نہ ہوتے جبکہ باری تعالیٰ نے اس قرآن کو اتارا ہی اس واسطے ہے کہ اس کی آیات میں تدبر وتفکر کیا جائے۔ چنانچہ فرمان باری ہے:

﴿كتاب أنزلنه إليك مبارك ليدّبّروا اٰياته﴾ [ص:٢٩]

مزید برآں باری تعالیٰ غور وتدبر نہ کرنے والوں کی مذمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿أفلا يتدبّرون القرآن أم على قلوب أقفالها﴾ [محمد:٢٤]

ان فرامین کے پیش نظر صحابہ کرامؓ تو امت میں سب سے زیادہ اس قرآن میں تدبر کرنے والے اور اس میں موجودہ احکامات پر سب سے زیادہ عامل ہونے ہی چاہئے تھے، اس لئے کہ اگر صحابہ کرامؓ کا وطیرہ غور وتدبر نہ ہوتا تو پھر ان کے بعد اور کون ہوسکتا تھا جو اس طریقہ اور وطیرہ کا حامل ہوتا، صحابہ کرامؓ کی شان عظمت تو وہ تھی، جیسا کہ ایک عربی شاعر گویا ہوا ہے:

لهم شمس النهار إذا استقلت	و نور ما يغيبه العماء
هم حلوا من الشرف المعلى	ومن حسب العشيرة حيث شاءوا
من البيض الوجوه نجوم هدى	لو أنك تستضيئ بهم أضاءوا
فلو أن السماء دنت لمجد	و مكرمة دنت لهم السماء

ترجمہ: ١- ان کے واسطے تو دن میں روشن سورج کے مانند روشنی ہوا کرتی ہے، گوکہ سورج کی روشنی ماند پڑ جائے اور ان کے واسطے ایسا نور ہے جس کو تاریکی بھی کافور نہیں کرسکتی۔

٢- وہ خاندانی شرافت وکرامت اور حسب نسب کی بلند معیارگی میں وہ رتبہ پاگئے جو انہوں نے چاہا۔

۳-سفید چہروں والے ہدایت کے ستارے اگر تو ان سے روشنی کا طلبگار ہو تو وہ تجھ کو روشنی دیدیں۔

۴- چنانچہ اگر آسمان کسی کی بزرگی وبرتری کے قریب ہوتا تو وہ انہی حضرات کی شرافت وکرامت ہوتی۔

ان اشعار پر راقم الحروف نے یہ اضافہ کیا ہے کہ:

بحار معارف و عیون علم

بیانهم من الجهل شفاء

ترجمہ: وہ حضرات معارف وبصائر کے سمندر اور علوم کے سرچشمے تھے اور ان کا کسی چیز کو بیان کرنا مرض جہالت کے لیے سامان شفا ہے۔

یہ موضوع کافی طوالت اور وسعت رکھتا ہے جس کے ہر پہلو کو واضح کرنا ہماری بحث سے متعلق نہیں اور جو اس موضوع کے متعلق تفاصیل کے خواہاں ہوں وہ ''الاتقان'' اور علوم القرآن کے موضوع پر لکھی گئی دیگر کتب کی مراجعت فرما سکتے ہیں۔

راقم نے جو کچھ گذشتہ سطور میں قلم بند کیا اور کچھ وضاحت کی، اس کا بیشتر حصہ راقم کے کمزور تدبر وتامل اور ناقص غور وفکر کی کارفرمائی تھی، پھر میں نے اکابر علماء کرام- جو اللہ کے ہاں اپنی دینی خدمات کی وجہ سے یقیناً زیادہ ثواب وانعام کے مستحق ہیں- کی کتب کو دیکھا تو جیسا کہ محاورہ ہے کہ: ''قد یتوارد الخاطر علی الخاطر کما یقع الحافر علی الحافر'' یعنی کبھی کبھار کسی کے دل کے خیالات دوسرے کے دل میں آنے والے خیالات سے ایسے ملتے جلتے ہوتے ہیں جیسے کہ چلتے وقت اونٹ کے کھر پر کھر پڑ جائے، چنانچہ بہت سے مواضع میں میری تعبیر وتصویر ان کی تعبیر وتصویر کے بالکل موافق ہے، صرف تھوڑا سا طرز انشاء، طریق تحریر اور بعض مواضع میں تقدیم وتاخیر کا فرق ہے۔ والحمد لله علی ذلك حمداً کثیراً

اور یہ اتفاق آراء محض ان کی روحانیت کی برکات اور میرے ان کے متعلق حسن ظن کا ثمرہ ونتیجہ ہیں، اس لئے کہ بہرحال ان علمی میدانوں میں وہ سبقت کرنے والے اور بابرکات کرامات کے حامل ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے ان کے علوم ومعارف سے بہرہ ور فرمائے اور میرا ان کے

زمرے میں حشر وحساب فرمائے۔(آمین)

تفسیر قرآن میں محض لغت اور تاریخ پر اعتماد

اس بحث کے متعلق میں نے اس لیے کچھ تفصیل سے کام لیا کہ آج کل بہت سے ہم عصر اہل علم حضرات کو دیکھتا ہوں کہ جب وہ قرآن پاک کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ احادیث وآثار سے وہ بے نیاز ہیں اور محض لغت وتاریخ پر اعتماد کر کے سنت اور اجماع امت سے آنکھیں بند کر کے صرف نظر کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں، بلکہ ان کی قدر ومنزلت گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے بارے میں اپنی ہوس وخواہش کے پیش نظر جو چاہتے ہیں کہتے پھرتے ہیں۔ جہاں احادیث وآثار ان کی رائے کے خلاف ہوں وہاں ان کو پس پشت ڈال کر اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، یہی الحاد وزندیقیت کا پہلا دروازہ ہے جس کے لیے ابو الکلام آزاد دہلوی کی ''ترجمان القرآن'' ہی کو ملاحظہ کر لیجئے کہ کس طرح تاریخ (جس کی بنیاد ہی بودی اور مضطرب ہے اور انہی کمزور رائے) کو فہم قرآن اور بلند پایہ الفاظِ نصوص کے حل کے لئے مدار ومرکز ٹھہرایا ہے، ان کی تفسیر کے متعلق اگلے صفحات میں کلام کیا جائے گا ''ان شاء اللہ''! انہی کی مانند دیگر ہم عصر نے بھی یہ طرز اپنا رکھا ہے، اللہ ہی توفیق دینے والے ہیں اور وہی حق کی طرف رہبری اور ہدایت فرمانے والے ہیں۔

مفسر کی شرائط اور تفسیر بالرأی

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو شرائط میں نے تفسیر، مفسر اور تفسیر بالرأی کے متعلق متفرق و منتشر انداز میں سپرد قلم کی ہیں، انہیں کامل طور پر یکجا بیان کر دیا جائے۔ علماء کرام نے ان شرائط کے متعلق طویل ابحاث فرمائی ہیں جو ان کی ہم پر مہربانی اور احسان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے ذکر کردہ اقوال اور نقول میں سے ایسے منتخب نکات بیان کروں جو ان تمام منقول اقوال کے ہار کا ہیرا اور پروئے ہوئے موتیوں میں سے قیمتی موتی ہو۔ امید ہے کہ یہ نکات آنکھوں کے لئے بصیرت افروز اور قلوب کے لئے شفا کا سامان مہیا کریں گے اور حقیقی توفیق اور مدد دینے والا تو خدائے واحد ہی ہے۔

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ: اس بات میں علماء کرام کی دو آراء ہیں کہ آیا ہر شخص کے لئے قرآن کریم میں غور و فکر کر کے از خود تفسیر بیان کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ایک جماعت تو کہتی ہے کہ کسی شخص کو قرآن کریم کی کسی آیت و جزء کی تفسیر کرنا روا نہیں، چاہے وہ بڑا ادیب اور ادلۂ شرعیہ، علم فقہ، علم نحو، علم اخبار و آثار میں خوب رسوخ رکھتا ہو، سوائے اس کے کہ وہ تفسیر بیان کرے جو نبی اکرم ﷺ سے مروی ہو۔ اور دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کرنا ہر اس شخص کے لئے جائز ہے جو ان پندرہ علوم میں کامل رسوخ رکھتا ہو، جن کی مفسر کو احتیاج ہوا کرتی ہے، وہ پندرہ علوم یہ ہیں:

۱۔ علم لغت، ۲۔ علم نحو، ۳۔ علم صرف، ۴۔ علم اشتقاق،
۵۔ علم معانی، ۶۔ علم بیان، ۷۔ علم بدیع، ۸۔ علم قراءت،
۹۔ علم فقہ ۱۰۔ علم قصص، ۱۱۔ علم اصول فقہ
۱۲۔ علم اسباب نزول، ۱۳۔ علم اصول دین (علم کلام)

۱۴-علم ناسخ ومنسوخ، ۱۵-علم توضیح مجمل ومبہم

اوران سب سے بڑھ کر وہی علم جو اللہ رب العزت عاملین علماء کو الہام والقاء کے ذریعے مرحمت فرماتے ہیں، جس کی جانب حدیث نبوی ﷺ میں اشارہ بھی وارد ہوا ہے کہ:

"من عمل بما علم يورثه الله علم ما لم يعلم"

ترجمہ: جو شخص اپنے علم پر عمل کرے، اللہ تعالیٰ ان چیزوں کا علم اسے مرحمت فرماویں گے جن کو وہ نہیں جانتا۔

امام سیوطیؒ نے ان علوم کے احتیاج کی وجوہات بھی بیان فرمائی ہیں، لیکن یہ وجوہات چونکہ ہر سطحی فکر اور عربی زبان سے واقفیت رکھنے والا شخص بھی سمجھ سکتا ہے، اس لئے ان وجوہات کے بیان کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ امام سیوطیؒ نے ابن ابی الدنیاؒ سے نقل فرمایا ہے کہ: مندرجہ بالا پندرہ علوم مفسر کے لئے تفسیر میں ہتھیار کی مانند ہیں اور ان کو حاصل کئے بغیر کوئی شخص مفسر بن ہی نہیں سکتا، چنانچہ جو شخص ان علوم پر کامل دسترس حاصل کئے بغیر تفسیر کرتا ہے، وہ تفسیر بالرائی کا ارتکاب کرنے والا ہوگا، جس سے احادیث مبارکہ میں ممانعت وارد ہوئی ہے، اس کے مقابلے میں ان علوم میں رسوخ رکھنے والا تفسیر بالرائی کا مرتکب نہ ٹھہرے گا، جو حدیث میں ممنوع قرار دی گئی ہے۔

راقم الحروف عرض گذار ہے کہ ان دونوں فریق میں تطبیق اور پہلے قول کو دوسرے قول کے مانند ٹھہرا کر ان میں جمع وتوفیق چنداں مشکل نہیں، کیونکہ جو تفسیر صحیح سند سے آنحضرت ﷺ سے ثابت ہو اور اسی طرح کی کوئی اور حدیث اس کے معارض ومقابل نہ ہو تو وہ تفسیر ہر دو فریق کے نزدیک متعین ومقرر ہوگی اور اگر کوئی تفسیر صحیح سند سے ثابت نہ ہو اور وہ مقام تفسیر وتوضیح کا محتاج ہو اور وہ متشابہات میں سے بھی نہ ہو (جن پر اجمالی ایمان تو ضروری ہوا کرتا ہے، لیکن اس کی حقیقت اور تفصیل اللہ جل شانہ کے سپرد کردی جاتی ہے) اور نہ ہی ایسا مشکل ومبہم ہو کہ گو متشابہات میں سے نہ ہو، لیکن متشابہات کے مانند ہوگیا ہو (کہ غور وفکر سے اس کے معنی واضح نہ ہو سکتے ہوں) بلکہ اہل علم ہی اس کے صحیح معنی ومفہوم تک رسائی حاصل کر سکتے ہوں اور اہل زبان اس کے درست مصداق کو سمجھتے ہوں، تب اس جگہ کوئی کلام کرنا ایسے عالم کے لیے جائز ہوگا جو مذکورہ بالا پندرہ علوم

میں کامل رسوخ اور مہارت تامہ رکھتا ہو۔ اس لئے کہ اللہ رب العزت کی یہ مقدس کتاب جو لوگوں کے لیے نصیحت اور ان تمام امراض کے لئے جو سینوں میں چھپے ہیں، شفا کا پیام ہے وہ کیونکر آسمان وزمین کے مابین یوں معلق رہ سکتی ہے کہ اس کا معنی کسی کو سمجھ نہ آئے؟ حالانکہ باری تعالیٰ کا خود فرمانِ عالی شان ہے:

﴿لعلمه الله الذين يستنبطونه منهم﴾

جب کہ اگر اس مقام پر قول اول سے اس کا سطحی معنی لیا جائے کہ استنباط واستخراج سے کچھ علم حاصل ہو ہی نہیں سکتا ہے تو قرآن کا بیشتر حصہ غیر معلوم ٹھہرے گا۔ بہتر بات یہی ہے کہ ان دونوں اقوال کو ایک مدار میں مرتکز کر دیا جائے، اس طرح معاملہ آسان اور لچک دار ہو جائے گا اور ان دونوں فریق کے مابین یہ اختلاف پاٹنے میں مدد ملے گی۔

مذکورہ جمع وتطبیق کے بیان میں علامہ زرکشیؒ کا یوں فرمانا -واللہ اعلم- میری تائید کرتا نظر آتا ہے کہ قرآن کریم دو حصوں پر مشتمل ہے: ایک حصہ تو وہ ہے جس کی تفسیر نقلاً بیان کی جائے اور دوسرا حصہ وہ ہے جس کی تفسیر کے متعلق نقلی روایات وارد نہیں ہوئیں، پھر پہلے حصے کی تفسیر یا تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یا صحابہ کرام یا کبار تابعین سے منقول ہوگی، اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول تفسیر ہو تو اس میں سند کی صحت سے بحث کی جائے گی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے منقول تفسیر میں دیکھا جائے گا کہ اگر وہ تفسیر لغوی اعتبار سے بیان کی گئی ہے تو چونکہ وہ اہل زبان تھے، اس لئے اس تفسیر پر اعتماد کیا جائے گا یا وہ تفسیر اسباب وقرائن کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مشاہدہ کے پیش نظر ہوگی تب بھی اس تفسیر کی قبولیت میں شک نہ ہوگا۔ پھر یہ دیکھا جائے گا کہ اگر صحابہ کرام کی تفاسیر میں بظاہر اختلاف وتعارض واقع ہو رہا ہو تو اگر جمع وتطبیق ممکن ہو تو جمع وتطبیق کی صورت نکالی جائے گی اور اگر جمع وتطبیق ممکن نہ ہو تو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی بیان کردہ تفسیر مقدم کی جائے گی، اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو صحت تاویل کی خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ: "اللهم علّمه التأويل" اے اللہ! ان کو تاویل قرآنی کا علم مرحمت فرما۔

امام شافعیؒ فرائض ومیراث کے مسائل میں حضرت زیدؓ کے قول کو مقدم فرمایا کرتے

تھے، اس لئے کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے: "أفرضکم زید" تم میں میراث کے مسائل کو سب سے زیادہ جاننے والا زید ہے۔

جو تفاسیر تابعین سے منقول ہیں ان پر اعتماد کی وہی صورتیں ہوں گی جو صورتیں صحابہ کرامؓ کی تفاسیر کے متعلق ابھی پچھلی سطور میں ذکر ہوئیں اور اگر ان میں تعارض واقع ہو جائے تو اجتہاد سے کام لیا جائے گا۔

جن مقامات کے متعلق کوئی نقلی روایات وارد نہیں ہوئی وہ بہت ہی کم ہیں، ان مقامات کے درست معانی و مفاہیم تک رسائی کے لئے سب سے پہلے لغت عرب میں مفردات کی چھان بین کی جائے گی اور ان کے مدلولات پر غور و خوض کیا جاوے گا اور سیاق و سباق کے ساتھ ساتھ ان کے دیگر استعمال کی جانچ پڑتال بھی کی جائے گی، اسی طریقہ اجتہاد کو امام راغب نے اپنی کتاب "مفردات القرآن" میں اختیار فرمایا ہے۔

علامہ زرکشیؒ کا یہ تمام کا تمام بیان علامہ سیوطیؒ نے نقل فرمایا ہے، اسی طرح راقم کی تائید میں امام سیوطیؒ کا "المدخل" سے منقول یہ بیان بھی قابل غور ہے کہ جو تفسیر شارع علیہ السلام سے منقول ہو، اس کے متعلق غور و فکر کی بالکل ضرورت نہیں اور جس تفسیر کا بیان صاحب شرع سے منقول نہیں ہے، اس میں اہل علم علماء کو غور و خوض کرنے کی گنجائش ہے، تاکہ علماء کرام غیر منقول تفاسیر کو منقول تفاسیر کی روشنی میں استدلال و استنباط اور اجتہاد کو بروئے کار لا کر واضح بیان فرما سکیں۔

تفسیر بالرأی سے کیا مراد ہے؟

"من تکلم فی القرآن برأیه فأصاب فقد أخطأ"

ترجمہ: "جس نے قرآن کی تفسیر میں اپنی رائے سے کلام کیا تو باوجود صحیح تفسیر کرنے کے اس نے غلطی کی۔"

جان لینا چاہئے کہ مذکورہ بالا حدیث میں ممنوعہ تفسیر بالرأی کی تشریح و توضیح میں علماء کرام کی آراء مختلف ہیں کہ اس تفسیر بالرأی سے نبی کریم ﷺ کی مراد مبارک کیا ہے؟ یہ الفاظ

نسائی، ابوداؤد اور ترمذی کے ہیں، جبکہ ایک روایت میں "من قال" اور ایک دوسری روایت میں "من فسّر القرآن" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

"من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوّأ مقعده من النار"

ترجمہ: ''جس نے قرآن کی تفسیر میں بغیر علم کے کچھ کہا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔''

اسی طرح اس حدیث کے متعلق بھی علماء کرام کا اختلاف ہے کہ اس میں تفسیر بدون علم سے کیا مراد ہے؟ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے نقل فرمایا ہے۔ پہلی حدیث کی صحت کے متعلق علماء کرام نے بحث فرمائی ہے اور جب بعض قرائن سے اس کی صحت ثابت ہوئی، تب علامہ بیہقیؒ نے فرمایا کہ: اس رائے سے مراد - واللہ اعلم - وہ رائے ہے جو بغیر کسی دلیل کے قائم کی جائے۔ البتہ جو رائے برہان ودلیل سے مؤید ہو، وہ رائے جائز ہے اور حدیث میں مذکور اس ٹکڑے "فأصاب فقد اخطأ" (اگر درست تفسیر بھی بیان کرلے، تب بھی اس نے غلطی کی) کا مطلب امام سیوطیؒ نے "المدخل" سے یوں نقل فرمایا ہے کہ: اگر چہ اس نے تفسیر میں درست تو کہا لیکن اس صحیح رائے زنی کے لئے جو طرز وطریقہ اس نے اختیار کیا، اس میں اس سے خطا ہوئی، اس لئے کہ صحیح طرز تو یوں تھا کہ سب سے پہلے اس کے الفاظ کی تفسیر کے لئے اہل زبان کی طرف رجوع کرتا، پھر اس کے ناسخ ومنسوخ اور سبب نزول کے متعلق تأمل وتفحص کرتا اور صحابہ کرامؓ جنہوں نے قرآن کریم کی وحی کے زمانہ کا مشاہدہ کیا ہے اور ہم تک وہ سنن واحادیث نقل فرمائی ہیں جو کلام اللہ کی تفسیر وتشریح میں مدد کرتی ہیں، ان کے اقوال واخبار میں جس مقام کی وضاحت مطلوب ہو، اس کے متعلق غور وفکر کرتا یا پھر اس رائے سے مراد اس شخص کی رائے ہے جو علوم کے اصول وفروع جانے بغیر محض اپنی اٹکل سے رائے زنی کرے۔ چنانچہ اس کی درست بات سے اگر چہ موافقت بھی ہو جائے گی، لیکن چونکہ وہ اس درست اور صواب رائے سے ناواقف بھی ہے تو محض اٹکل سے رائے زنی کچھ سودمند اور قابل تعریف نہ ہوئی۔

اور دوسری حدیث کے متعلق علامہ انباریؒ کے بیان کردہ دو معانی میں سے ایک یہ ہے کہ:

"من قال فی القرآن قولًا یعلم أنّ الحقّ غیره فلیتبوّأ مقعده من النّار"

یعنی جس شخص نے قرآن کی تفسیر وتوضیح میں حق کے خلاف رائے زائی کی، باوجودیکہ حق کو جانتا ہو تو یہ شخص اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔

امام سیوطیؒ نے ''الاتقان'' میں لکھا ہے کہ: ابن نقیب حنفیؒ فرماتے ہیں کہ تفسیر بالرأی کے متعلق علماء کرام سے پانچ اقوال منقول ہیں:

۱- جو علوم تفسیر قرآن کے لئے بنیاد اور اساس کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو حاصل کئے بغیر تفسیر قرآن بیان کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ علوم تفسیر کے لئے بمنزلہ شرائط کے ہیں اور ان کے حصول اور ان میں رسوخ کے بغیر تفسیر قرآن جائز نہیں ہے۔

۲- متشابہات کی تفسیر جن کا حقیقی علم صرف خدائے واحد کو ہے۔

۳- مذہب فاسد کے مطابق تفسیر کرنا، بایں طور کہ مذہب کو اصل اور تفسیر کو تابع بنا دیا جائے کہ جس طرح ممکن ہو گو تفسیر ضعیف بھی ہو، اس کو لے کر مذہب فاسد کے موافق کر دیا جائے۔

۴- بغیر کسی دلیل کے قطعی طور پر کسی تفسیر کو خدائے قدوس کی مراد ٹھہرادینا۔

۵- اپنی خواہش، ہوس کے پیش نظر تفسیر بیان کرنا۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ اس موقع پر قول فیصل وہ ہے جو امام خازنؒ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے اور ہمارے شیخ استاذ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے بھی اس قول کو پسند فرمایا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں اپنی رائے سے تفسیر کرنے کے متعلق جو ممانعت احادیث میں وارد ہوئی ہے، یہ ممانعت اس شخص کے حق میں ہے جو اپنے جی کی مراد اور اپنی من چاہی تاویل وتفسیر بیان کرتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ شخص یا تو علم رکھتا ہوگا یا نہیں؟ اگر علم رکھتا ہے تو یہ اس شخص کی طرح ہوگا جو قرآن کی بعض آیات کو لے کر اپنی کسی بدعت درستگی اور استناد کے لئے دلیل بنا کر پیش کرتا ہے، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ آیت کی مراد کچھ اور ہے، لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنی بدعت کی تصحیح کے لئے آیت کے ذریعے اپنی دلیل کو قوی قرار دے کر مخالف فریق کو التباس و پریشانی میں مبتلا کر دے۔ جیسا کہ فرقۂ باطنیہ، خوارج اور دیگر بدعتی فرقوں نے اپنے فاسد مقاصد کی تکمیل کے لیے یہ وطیرہ استعمال کیا، تاکہ لوگوں کو دھوکہ وفریب میں مبتلا کریں، اور

اگر قرآن میں یہ رائے زنی بغیر علم کے محض جہالت سے ہو، بایں طور کہ آیت بہت سی وجوہ واسباب کا احتمال رکھتی ہو اور وہ شخص قرائن سے صرف نظر کر کے ان وجوہ محتملہ کے علاوہ آیت کی کسی اور وجہ سے تفسیر وتشریح کرے، یہ دونوں طرز، غلط اور قابل مذمت ہیں۔ اور یہ دونوں اس ممانعت اور وعید میں داخل ہیں جو قرآن میں رائے زنی کرنے کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔

علاوہ ازیں جو طرز تاویل ہے جس کی تفصیل یوں ہے کہ استنباط واجتہاد سے آیت کو اس کے مطابق معنیٰ کی طرف پھر دیا جائے۔ نیز آیت کا سیاق وسباق اس معنیٰ کا احتمال بھی رکھتا ہو۔ اسی طرح یہ معنیٰ قرآن وسنت کے مخالف بھی نہ ہو، اس کے بارے میں علماء کرام نے گنجائش فرما رکھی ہے۔ اس لئے کہ صحابہ کرامؓ نے قرآن کی تفسیر بیان فرمائی اور اپنی تفسیری روایات میں ان کے درمیان اختلاف بھی واقع ہوا، اور یہ بات بھی نہ تھی کہ تمام صحابہ کرامؓ صرف وہی تفسیر کرتے ہوں، جو انہوں نے نبی پاک ﷺ سے خود سنی ہو، بلکہ جتنا وہ سمجھتے اور لغوی معنیٰ ومفہوم کو جانتے، اس کے بقدر تفسیر بھی فرمایا کرتے تھے (اور یہی تاویل ہے) اور حضور پاک ﷺ نے حضرت ابن عباسؓ کے لئے باقاعدہ یوں دعا فرمائی: ”اللھمّ فقھه فی الدّین وعلّمه التأویل“ اسی بناء پر صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ تفسیری روایات انہی کی منقول ہوئی ہیں۔

ہمارے شیخ استاذ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے صحیح البخاری کی ''امالی'' [فیض الباری-۱۵۰/۴-] میں یوں فرمایا ہے کہ: اگر کسی شخص کی اپنی رائے کے مطابق بیان کردہ تفسیر سے کوئی متفق ومجمع علیہ مسئلہ متغیر نہ ہوتا ہو، اسی طرح سلف صالحین کے متفقہ عقائد میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوتی ہو تو ایسی تفسیر اس ممنوع تفسیر بالرأی کے ضمن میں شمار نہ ہوگی۔ البتہ اگر کسی متفقہ متواترہ مسئلہ میں تغیر آجائے یا مقررہ عقیدے میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہو، تب یہ تفسیر' ممنوعہ تفسیر بالرأی میں شمار کی جائے گی۔ نیز ایسی رائے زنی کرنے والا جہنم کا مستحق ہوگا۔ یہ بات کہ تفسیر' تفسیر بالرأی کے زمرے میں داخل نہ ہو، اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ مفسرین کرام کے طرز طریق سے خوب واقفیت حاصل نہ کرلی جائے، تب مفسرین نے اپنی بلند پایہ ذہانت اور صحیح فکر کی روشنی میں جو تفسیر بیان فرمائی، اس کے متعلق کسی قسم کا قلق وتردد نہ ہوگا، اور جو شخص بھی

کتب تفاسیر کا مطالعہ کرے گا، وہ ان کو مفسرین کی آراء سے لدا ہوا پائے گا اور کون ہے جو علماء کرام کو سیاق وسباق میں تأمل وتدبر کرکے الفاظ ونصوص کے حقائق میں غور وطلب کے ساتھ عقائد سلف صالحین کی رعایت رکھتے ہوئے قرآن کریم کی تفسیر بیان کرنے سے روکے، حالانکہ ان علماء کے لئے تو قرآن کریم کا یہی انعام واکرام ہے اور یہ علماء کرام ہی ہیں جو قرآنی عجائبات تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں، اس کی باریک وپوشیدہ وجوہات سے پردے اٹھا سکتے ہیں اور اس کے حقائق میں چھپے معارف کے خزینوں کو آشکارائے خلائق کرسکتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ تفسیر بالرائی تو علماء کرام کا تحفہ ہے اور محقق مجتہدین کا خاصہ ہے۔ علاوہ ازیں جو شخص معاون اسباب تفسیر کی رہنمائی کے بغیر تفسیر قرآن کرے کہ نہ تو وہ سلف وخلف کے عقائد کے متعلق علم رکھتا ہو، نہ عربی زبان سے اس کو کچھ ذوق ہو، بلکہ بے وقوف اور ناخلف ہو کہ اس کو قرآن کی تفسیر بیان کرنے پر اس کی رسوائی اور قلت علم، بلکہ جہالت نے برانگیختہ کیا ہو تو ایسے شخص پر سخت افسوس کرنا چاہئے اور ایسا آدمی دوزخ کا بھی مستحق ٹھہرے گا۔

علامہ ثعلبی جزاریؒ نے "الجواهر الحسان" میں پہلی حدیث کی شرح وبسط میں اچھی بحث فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

> ومعنى هذا أن يسأل الرجل عن معنى في كتاب الله فيتسور عليه برأيه دون نظر فيما قال العلماء أو اقتضته قوانين العلوم كالنحو والأصول ، وليس يدخل في هذا الحديث أن يفسّر اللغويون لغته والنحاة نحوه والفقهاء معانيه ويقول كل واحد باجتهاده المبنى على قوانين علم ونظر، فإنّ هذا القائل على هذه الصفة ليس قائلًا بمجرّد رأيه، وكان جلّة من السلف كسعيد بن المسيب وعامر الشعبي وغيرهما يعظمون تفسير القرآن ويتوقّفون عنه تورعًا واحتياطًا لأنفسهم مع إدراكهم وتقدّمهم،

وكان جلّة من السلف كثير عددهم وهم يفسّرونه
وهم أبقوا على المسلمين في ذلك ، رضي الله عنهم
أجمعين.

اس کا مطلب یہ ہے کہ "کسی شخص سے قرآنی آیت کی تفسیر کے متعلق پوچھا جائے اور وہ بے دھڑک اپنی رائے پیش کردے، نہ علماء کرام کے کلام میں غور وخوض کرے، نہ علوم کے قوانین کے مقتضیات سے واقفیت رکھتا ہو، مثلاً: نحو اور اصول سے نابلد ہو، اس حدیث میں یہ بات داخل نہیں جو نحاۃ نے اپنی نحوی تفسیر اور فقہاء نے فقیہانہ طرز پر قرآن کی تفسیر کے متعلق کلام فرمایا ہے' بایں طور کہ ہر فریق اپنے علم وفہم اور قوانین مقررہ کے پیش نظر اپنے اجتہادات سے کی گئی تفسیر قرآن میں کلام کرے، اس لئے کہ ان باتوں پر دسترس رکھنے والا محض رائے زنی نہیں کیا کرتا، کبار اسلاف جیسے سعید بن مسیبؒ عامر شعبیؒ وغیرہ حضرات گرامی تفسیر قرآن کو قابل عظمت سمجھتے تھے، لیکن تقویٰ واحتیاط برتتے ہوئے تفسیر قرآن بیان کرنے سے توقف فرمایا کرتے تھے، باوجود اس کے کہ ان کا ادراک بھی بلند پایہ تھا اور فہم وفراست میں بھی وہ اپنے بعد والوں سے سبقت رکھتے تھے، رضی اللہ عنہم اجمعین۔

مذکورہ بالا تمام اقوالِ اسلاف صاحب بصیرت شخص کے لئے کافی ہیں، واللہ الموفق۔

تفسیر قرآن میں صوفیاء کے اقوال
فرقہ باطنیہ اور صوفیاء کی تفسیری تاویلات میں فرق

مذکورہ ابحاث کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ اہل زیغ وضلال فرقہ باطنیہ کے بارے میں ایک ضروری انتباہ درج کر دیا جائے جو بعض صوفیاء کرامؒ کے اقوال سے تمسک کر کے دین سے کچھ اس طرح علیحدگی اختیار کرتے ہیں، جیسے تیر چھوٹنے کے بعد کمان سے علیحدہ ہو جایا کرتا ہے اور آیات قرآنیہ میں بغیر علم وفکر کے تحریف کرتے ہیں۔ نیز بغیر دلائل وبراہین کے مقررہ مسائل کو اپنی جگہوں سے تبدیل اور ان کے مقصودی مفاہیم کو متغیر کر دیتے ہیں۔

چنانچہ خوب جان لینا چاہئے کہ علامہ نسفیؒ نے اپنی کتاب عقائد میں لکھا ہے کہ نصوص کو ان کے ظاہر ہی کے موافق رکھا جائے اور ظاہری معانی سے صرف نظر کرتے ہوئے فرقہ باطنیہ کے بیان کردہ باطنی معانی ومفاہیم کی طرف عدول الحاد اور زندقہ ہے۔

علامہ تفتازانیؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

> ''ملاحدہ کو باطنیہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس بات کے دعوے دار ہیں کہ نصوص اپنے ظاہری معانی کے مطابق نہیں، بلکہ ان کے ایسے باطنی معانی ہیں جنہیں سوائے معلم خاص کے کوئی شخص نہیں جانتا۔ درحقیقت ان کا اصلی مقصد اس دعویٰ سے یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کی بالکلیہ نفی کر دی جائے اور اسے معدوم ٹھہرا دیا جائے''۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''و أما ما يذهب إليه بعض المحققين من أن النصوص على ظواهرها ومع ذلك فيها إشارات

خفية إلى دقائق تنكشف على أرباب السلوك يمكن التطبيق بينها وبين الظواهر المرادة فهو من كمال الإيمان ومحض العرفان."

''اس کے بالمقابل بعض محققین کا یہ فرمان کہ نصوص اگرچہ اپنے ظاہری معانی کو ہی بتلاتی ہیں، لیکن ان ظاہری نصوص میں کچھ ایسے چھپے ہوئے باطنی اشارات ہوتے ہیں جو ایسے باریک اور لطیف امور کا پتہ دیتے ہیں جو اہل سلوک و متصوفین پر واضح ہوتے ہیں۔ نیز ان دقائق و اشارات اور ظاہری مرادی معانی میں باہم تطبیق بھی ممکن ہوتی ہے، یہ بات ایمان کے کمال اور محض معرفت و بصیرت پر منحصر ہے''۔

علامہ تاج الدین بن عطاء اللہ اپنی کتاب ''لطائف المنن'' میں ارشاد فرماتے ہیں: جان لیجئے کہ ان متصوفین کرام سے اللہ اور رسول کے کلام کے بارے میں جو تفاسیر اور معانی غریبہ منقول ہیں یہ ظاہری معنی کو نص کے ظاہر سے پھیرنا نہیں کہلائے گا' بلکہ ظاہر آیت سے تو وہ معنی سمجھ آئے گا جس کے لئے ظاہر آیت ذکر کی گئی ہے اور جس مفہوم و مطلب پر اہل زبان کا عرف دلالت کرتا ہوگا، جبکہ آیت کے باطنی معنی سے مراد آیات قرآنی اور احادیث شریفہ کے وہ باطنی اور مخفی حقائق و اشارات ہیں جن کی طرف وہ شخص رہبری و رہنمائی حاصل کرتا ہے جس کے دل کو خدائے پاک نے منشرح فرمایا ہو۔

حدیث شریف میں ہی اس مضمون کا باقاعدہ ذکر وارد ہوا ہے: ''لكل آية ظهر و بطن'' ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے، چنانچہ ناقد اور معترض کا یہ کہنا کہ: ''باطنی اشارات کا بیان تحریفِ قرآن کے مترادف ہے'' آپ کو ان حضرات صوفیاء کے اقوال سے مستفید و مستفیض ہونے سے ہرگز نہ روکے' یہ ہرگز تحریف نہیں ہے، تحریف تو اس وقت ہوتی جب یہ حضرات یوں دعویٰ فرماتے کہ: ''اس آیت کے یہی معنی ہیں اس کے علاوہ اور کوئی معنی نہیں'' اور صوفیۂ کرام تو یہ دعویٰ ہی نہیں کرتے' بلکہ ظاہر کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے موضوع معانی کو مقصود جانتے ہوئے ان باتوں کا ادراک فرمالیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ ان کو سمجھاتے اور سکھاتے ہیں، انتہٰی منقول از الاتقان۔

راقم الحروف عرض گذار ہے کہ اس مضمون کے متعلق کئی احادیث وارد ہوئی ہیں جو اس بیان کردہ مفہوم کی تائید کرتی ہیں، حضور اقدس ﷺ کا یہ فرمان عالیشان "لاتنقضی عجائبه ولاتبلغ غايته" اسی طرح یہ ارشاد کہ "فيه نبأ ماقبلكم وخبر ما بعدكم" اور یہ فرمان گرامی کہ "ان القرآن ذوشجون وفنون وظهور وبطون" اور دیگر کئی مرفوع وموقوف روایات اس مضمون کی تائید کرتی ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان مقدس: "أو فهم أعطيه رجل مسلم" جسے امام بخاریؒ نے "کتاب العلم" میں نقل فرمایا ہے یہ اس باب میں واضح ترین حجت ہے اور امام شافعیؒ کا قول ماقبل میں گذر چکا اور ابن عمرؓ نیز مجاہدؒ اور دیگر حضرات کے فرامین بھی میں نے ماقبل میں ذکر کر دیئے جن کو دوبارہ دیکھ لیا جائے۔

اور اگر قرآنی علوم ومعارف صرف اس کے ظاہری الفاظ کے حصار میں منحصر ہوتے اور دقائق ولطائف کے متعلق اہل حقائق کے لئے کچھ نہ ہوتا اور مخفی اشارات اور دلالات سے جن پر قرآنی مفہوم دلالت کرتا ہے اور قرآن کریم کی بلاغت ان کا پتہ دیتی ہے، قرآن کریم میں نہ پائے جاتے تو کسی عالم کو دوسرے عالم پر، نہ کسی پیش رو کو پس رو پر اور بعض متاخرین کو بعض متقدمین پر کوئی فوقیت حاصل نہ ہوتی اور حضرات ابن مسعودؓ کے صحابہ کرامؓ کے بارے میں اس ارشاد: "وأعمقهم علمًا" کا کیا مقصد ہوتا؟ ان دلائل کے پیش نظر دعویٰ واضح طور پر ثابت ہے، معاملہ واضح ہو گیا اور ان ہر دو نوع کی تاویلات میں فرق منکشف ہو گیا اور باوجود اس کے کہ اہل حقائق ان لطائف ومعارف کو جن کو وہ باطنی مفاہیم سے سمجھتے بوجھتے ہیں، کسی ایک کے بارے میں بھی یہ منقول نہیں کہ انہوں نے ظاہری معانی پر عمل اور اعتقاد چھوڑا ہو، پھر صبح روشن کی فجر کے مانند یہ معاملہ کیونکر ان معترضین پر ملتبس ہوا؟

حالانکہ صوفیائے کرام تو علم الٰہی میں رسوخ اور کمال رکھتے ہیں اور اعمال میں سچے اور مخلص ہوتے ہیں بخلاف ان ملحد فرقۂ باطنیہ والوں کے جو شریعت اسلامیہ کے منکر، آیت کے ظاہری معانی سے تحریف کرنے والے، اپنے علم میں کج رو، گمراہ اور اپنے عمل میں جھوٹے ہیں، ان اولیاء وصوفیاء کرام کی کیا شان اور ان باطنیوں کا کیسا گرا ہوا درجہ؟ ان میں ہر ایک کو واضح علامات

سے تم پہچان لوگے۔ اللہ رب العزت نے انہی باطنیہ گروہ والوں ہی کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿و أمّا الذين في قلوبهم زيغ فيتّبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تأويله﴾ [آل عمران:۷]

تلاش حق اور فتنہ پروری میں کیا نسبت؟ اور حق طلبی کا مقابلہ باطل جوئی سے کیونکر ہو؟

﴿أفمن يمشي مكبّا على وجهه أهدى أمّن يمشي سويّا على صراط مستقيم﴾ [الملك:۲۲]

ترجمہ: کیا وہ شخص جو اپنے منہ اوندھا چلے وہ ہدایت یافتہ ہے یا وہ جو سیدھا چلتا ہے سیدھی راہ پر۔

و ليس يصح في الأفهام شيئ
إذا احتاج النهار إلى دليل

ترجمہ: یوں تو عقل وفہم میں آنے والی کوئی بات بھی درست نہیں قرار دی جاسکے گی جبکہ دن کے طلوع ہونے کا بیان بھی دلائل کا محتاج ہو۔

مزید تفصیلات کے لئے "الاتحاف شرح الاحیاء" جزء رابع کی طرف مراجعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ہی حق کی طرف رہبری کرنے والے ہیں۔

چند گراں قدر مفید تفاسیر

مقدمۂ ہذا کے اختتام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طالبین علم وحق کے واسطے چند معتمد تفاسیر کے نام درج کر دیئے جائیں جن کا مطالعہ کافی حد تک دیگر تفاسیر سے مستغنی کر دیتا ہے' لیکن بہر حال یہ حقیقت ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ہر تفسیر کی اپنی ایک امتیازی خصوصیت ہوتی ہے جس میں کوئی دوسری تفسیر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اور دوسری تفسیر کے اہم گوشوں کا احصاء ایک ہی تفسیر میں ہونا کم ہی پایا گیا ہے، اس لئے کہ ہلکی بارش کشادہ وادی میں کیونکر نفع مند ہو سکتی ہے اور گڑھے کا پانی لبالب ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے اور پھوار کو گرجتی برستی بارش سے کیا نسبت؟

ہر تفسیر ایسی امتیازی خصوصیات کی حامل ہے جو خصوصیات دیگر کسی تفسیر میں نہیں پائی جاتیں۔ اسی لئے اگرچہ متاخر عالم متقدم کی تفسیری ابحاث کو ہی کیوں نہ نقل کرے بلکہ ایک ہی تفسیر کی [illegible] میں واختصار کرے، تب بھی اصل کتاب کی طرف مراجعت کے سوا چارہ کار نہ ہوگا، اس بات پر گواہی کے لئے ہمارے پاس تفسیری تجربہ کافی ہے، جب کہ ذوق سلیم بھی یہی کہتا ہے اور [illegible] برہان بھی واضح ہے، ہاں! سوائے چند کتابوں کے کہ ان میں فاضل مؤلفین نے وہ کمالات دکھلائے کہ اختصار وبسط اور اجمال وتفصیل میں چنداں فرق نظر نہیں آتا۔

ان تفاسیر میں تفاصیل ومباحث کا اختلاف عین ممکن ہے کیونکہ اختلاف آراء کا پایا جانا اور طبائع وافکار کا آپس میں تباین وتناقض روز روشن سے زیادہ واضح ہے اور ہر شخص کی ضرورت دوسرے شخص سے مختلف ہوا کرتی ہے، اسی طرح آراء ومزاج میں کلی طور پر اتفاق کم ہی ہوا کرتا ہے، کتنی چیزیں ہیں کوئی ان کا محتاج ہوتا ہے اور دوسرے اس سے مستغنی، بہت سے کلمات والفاظ ایسے ہوتے ہیں جنہیں ایک مصنف ذکر کرتا ہے، دوسرا ان کو لائق التفات ہی نہیں جانتا، اس لئے

جو شخص قرآنی علوم کی طرف اعتناء و رغبت رکھتا ہو اور اس میں بصیرت کاملہ اور حذاقت ومہارت کا خواہاں ہو اس کو ضروری ہے کہ جو تفسیر میسر ہو اس کا مطالعہ کرے، اس لئے کہ بہر حال تفسیر کا موضوع تو عمدہ ترین موضوع ہے، خاص طور پر وہ فوائد جو اسلاف محققین اور راسخ علمائے متقدمین نے تحریر فرمائے ہیں، گو کہ وہ ایک سورت یا دو سورتوں ہی کے متعلق ہوں بلکہ ایک یا دو آیت ہی کے متعلق کیوں نہ ہوں اور اس کے لیے ان کی تفاسیر کے علاوہ دیگر علوم وفنون میں ان کی تحریر کردہ تصنیفات کا تتبع وتفحص کرے اور ان کو گم شدہ قابل قدر قیمتی شئ کے مانند ہر جگہ تلاش کرے، اس لئے کہ قرآن کریم کی کتنی ہی مشکل مباحث ایسی ہوتی ہیں جنہیں ایک محقق، کتب تفسیر کے علاوہ دیگر کتب میں ان کا حل پالیتا ہے اور جس جگہ امید بھی نہ ہو وہاں ان مشکلات کو سمجھ لیتا ہے اور اس طرح کہ بکھرے ہوئے لعل وجواہر محققین اسلاف کی کئی کتب میں پائے جاتے ہیں جن میں درج ذیل نام سرفہرست ہیں:

۱- امام حجۃ الاسلام غزالی متوفی ۵۰۵ھ۔

۲- حافظ ابن قیم متوفی ۷۵۱ھ حافظ موصوف اس موضوع کے متعلق شہسوار ہیں، شاید ہی ان کی کوئی کتاب کسی آیت کی تفسیر سے خالی ہو۔

۳- حافظ ابن تیمیہ الحرانی متوفی ۷۲۸ھ یہ حافظ ابن قیم کے استاذ اور [illegible]

۴- شیخ ابو القاسم سید شریف مرتضیٰ صاحب کتاب "امالی" متوفی [illegible]

۵- محقق ومدقق وزیر یمانی صاحب کتاب "ایثار الحق علی الخلق"، "العواصم والقواصم"، "الروض الباسم" موصوف ابن حجر عسقلانی کے [illegible] ہیں۔

۶- شیخ بہاء الدین سبکی ابن تقی الدین، موصوف ابن تیمیہ کے معاصر بزرگ ہیں، ان کی کتاب "عروس الافراح" مختلف آیات کی تفسیری مباحث کے متعلق ہے۔

۷- امیر یحییٰ بن حمزہ یمنی نے "الطراز" میں کئی فوائد تحریر فرمائے ہیں اور یہ نویں صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں، ان کے علاوہ دیگر کئی اکابرین امت وعلمائے ملت جن کے گرد امت کی چکی گھومتی ہے (گویا وہ اس کے قطب اور پاٹ ہیں) انہوں نے تفسیری فوائد بکھرے انداز

میں اپنی کئی کتب میں تحریر فرمائے ہیں۔

کچھ عرصہ سے میں سوچ رہا تھا کہ اگر خدائے پاک کی توفیق شامل حال ہوئی تو یہ بکھرے موتی مذکورہ اکابرین علماء کی کتب سے جمع کر کے ان کو ایک لڑی میں پرو دوں، اس کا اظہار میں نے اس لئے کر دیا، تا کہ اصحاب توفیق اس اہم خدمت کے متعلق غور وفکر فرماویں' واللہ الموفق۔

چار متداول تفاسیر

چونکہ یہ موہوم زندگی بہت محدود ہے اور خواہشات لمبی ہیں' ہمتیں سست اور عزائم بوجھل ہیں، خیالات وافکار کو خواہشات نے مختلف وادیوں میں بہا دیا ہے اور کوششیں خاک ہو رہی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ عزیز طلباء کو ان مطبوعہ تفاسیر میں سے جو اہل علم حضرات کے ہاں مشہور اور رائج ہیں، چند کے متعلق آگاہ کروں، جو چاہے انہی پر قناعت کرے تو اس کو کافی ہو جائیں گی اور صرف انہی نہروں اور دریاؤں سے پی لے تو سیراب ہو جائے گا اور ان شاء اللہ ان تفاسیر سے خوب سیراب ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اس کو دیگر تفاسیر سے مستغنی کر دیں گی، اور یہ تفاسیر میرے نزدیک چار ہیں:

۱: تفسیر ابن کثیر

یہ تفسیر حافظ عماد الدین ابن کثیر شافعی دمشقیؒ متوفی ۷۷۴ھ- جو علامہ ابن تیمیہؒ کے اجل تلامذہ میں سے ہیں- کی تحریر کردہ تفسیر ہے، یہ ''تفسیر ابن جریر'' سے مستفاد اور گویا اس کا مصفی وملخص ایڈیشن ہے، محدثین کی تفاسیر میں روایت ودرایت کے اعتبار سے کوئی اس تفسیر کے مقابل نہیں، ہمارے حضرت شیخ امام العصر مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے فرمایا: اگر کوئی کتاب کسی دوسری کتاب سے مستغنی کرنے والی ہے تو وہ تفسیر ابن کثیر ہے جو تفسیر ابن جریر سے مستغنی کرنے والی ہے۔

۲: مفاتیح الغیب

جو ''التفسیر الکبیر'' کے نام سے معروف ہے، یہ امام محقق فخر الدین ابن خطیب

الرازی شافعیؒ متوفی ۶۰۶ھ کی تفسیر ہے، ہمارے شیخ فرماتے تھے کہ: میں نے مشکلاتِ قرآن میں سے کوئی مشکل ایسی نہ پائی جس کا حل امام موصوف نے اس تفسیر میں ذکر نہ فرمادیا ہو، اور یوں بھی کہا کرتے تھے کہ: امام موصوف حل مشکلات کے دریا میں غوطہ زنی کرتے ہیں اگرچہ بعض مشکلات کا وہ قابل اطمینان اور موجب قناعت حل پیش کرنے میں ظفریاب نہیں بھی ہوتے ہیں ،اوراسی طرح شیخؒ یوں بھی کہا کرتے تھے کہ: جو اس تفسیر کے متعلق کہا گیا ہے کہ "فیه كلّ شیء إلا التفسير" جیسا کہ صاحب "الاتقان" امام سیوطیؒ نے نقل فرمایا ہے یہ اس تفسیر کی جلالت قدر اور علو منزلت کو گھٹانے کے واسطے ہے، شاید یہ قول اس شخص کا ہو جس کو لطائف ومعارف قرآنی سے دلچسپی نہیں اور صرف من گھڑت اقوال کی بہتات کر دینا اس پر غالب ہے۔

۳: روح المعانی

یہ تفسیر تیرھویں صدی ہجری کی عظیم القدر شخصیت مفتیٔ بغداد اور اپنے وقت کے بہت بڑے عالم سید محمود آلوسی حنفیؒ کی تحریر کردہ ہے، اس کی گرانمایہ خصوصیات اور بلند پایہ محاسن دلوں کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ میرے نزدیک مواد کی کثرت، واضح تعبیرات اور تحریر کی عمدگی میں مذکورہ تفسیر علامہ ابن حجرؒ کی "فتح الباری" کے مانند ہے، لیکن چونکہ فتح الباری کلامِ مخلوق کی تشریح وتفصیل ہے، اس لئے اس نے صحیح بخاری کی شرح کی گراں ذمہ داری سے امت مرحومہ کو آزاد کر دیا اور گویا صحیح بخاری کا حق ادا کر دیا، جب کہ خدائے کریم کا مبارک کلام اس بات سے بہت بالا وبرتر ہے کہ کوئی بشر اس کے حق کو کامل طور پر ادا کر سکے، اگرچہ اپنی ممکنہ ہمت وعنایت کلام اللہ کی شرح وتفسیر میں گذار دے۔

٤: إرشاد العقل السليم إلى مزايا القرآن الكريم

یہ حضرت شیخ ابوالسعود حنفیؒ مفتیٔ سلطنت عثمانیہ، خطیب المفسرین، قاضی القضاۃ علامہ محمد بن محمد العمادی متوفی ۹۵۱ھ کی بلند پایہ تفسیر ہے جو نظم قرآنی کے اغراض ومقاصد کو بہترین پیرائے اور عجیب طرز تصویر سے نہایت خوش اسلوبی سے آشکارا کرتی ہے نیز امام زمخشریؒ کی "الکشاف"

کی بہت سی خصوصیات سے مستغنی کرنے والی ہے۔

یہ چار کتب تفسیر ہوئیں، جن میں دو شافعی اور دو حنفی علماء کرام رحمہم اللہ کی تحریر کردہ ہیں اور جس مفسر کو فرصت نہ ہو امید ہے کہ وہ ان چاروں تفاسیر سے استفادہ کرنے کے بعد دیگر سے مستغنی ہو جائے گا۔

علامہ طنطاوی اور علامہ رشید رضا کی تفاسیر

جو شخص جدید علوم وفنون کے متعلق معلومات کا شائق ہو اور قدرت کے تخلیقی کارناموں تکوینی غرائبات اور کائنات کے چھپے نظام کی باریکیوں کو جاننے کا خواہشمند ہو، وہ ان مذکورہ تفاسیر کے ساتھ علامہ جوہری طنطاوی کی ''جواهر القرآن الكريم'' کو بھی زیر مطالعہ رکھے لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ نقد حدیث کے متعلق ان کی رائے پر اعتماد مناسب نہیں ہے، اس لئے کہ وہ محض اپنی رائے پر اعتماد رکھتے ہوئے شرائط نقد کو ملحوظ رکھے بغیر تنقید کرتے ہیں، یہ بات ہم نے اپنے شیخ حضرت شاہ انور شاہ کشمیری سے سنی ہے۔

اور جو عصری اسلوب کے مطابق قرآنی اغراض ومقاصد کی راہنمائی کا خواہاں ہو، وہ علامہ سید رشید رضا کی تفسیر ''المنار'' کو بھی مذکورہ تفاسیر میں ضم کرے مگر یہاں یہ بھی مدنظر رہے کہ ان کے تمام مزعومات وآراء پر اعتماد مناسب نہیں ہے اور بیشک یہ تفسیر بھی چند مقامات پہ جہاں مؤلف مذکور کے شیخ یا خود ان کے قلم نے مسلک حق کے متعلق بے اعتدالیاں برتی ہیں ان مقامات پر تنبیہات ذکر کی جانے کی مستحق ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ان دونوں تفاسیر ''الجواہر'' اور ''المنار'' کے قابل اعتراض مقامات کے علاوہ یہ دونوں تفاسیر اپنے فوائد کے بارے میں نفع سے خالی نہیں اور ان سے استفادہ کرنے والے کو اس وقت صاحب حماسہ ابو تمام کا یہ شعر پیش رکھنا بہت مفید ہوگا:

و لا يغرنك صفو أنت شاربه

فربما كان بالتكدير ممتزجا

ترجمہ: ''تمہیں صاف پانی کا پینا دھوکہ میں غافل نہ کردے بسا اوقات یہ صاف

پانی بھی گدلے پانی سے مخلوط ہوتا ہے۔''

اسی طرح یہ شعر بھی لائق اعتناء ہے:

قدر لرجلك قبل الخطو موضعها

فمن علا زلقًا عن غرة زلجا

ترجمہ:''اپنے پیر پڑنے کی جگہ کو قدم رکھنے سے قبل خوب اچھی طرح جانچ لو اس لئے کہ جو غفلت میں پھسلن پر پڑ گیا تو پھسل جائے گا۔''

چند مختصر اور مفید تفاسیر

جو مفسر ان مذکورہ تفاسیر سے بھی مختصر تفسیر چاہتا ہو تو وہ شیخ محقق نیسابوری کی ''غرائب الفرقان'' اور تفسیر ابوالسعود (جس کا گذشتہ سطور میں ذکر ہوا) کو دیکھے، اول الذکر تفسیر کبیر امام رازیؒ (جس کا ذکر کیا جا چکا ہے) کا بہترین خلاصہ ہے اور اس میں چند مزید فوائد کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ عدیم الفرصت شخص کے لیے قرآنی مفاہیم کو سمجھنے میں یہ دونوں تفاسیر کافی ہو جائیں گی یا پھر تفسیر ابن کثیر اور الکشاف دیکھ لے اور جو شخص صرف ایک ہی تفسیر پر قناعت کرنا چاہے تو اگر چہ وہ چھ شمار میں بھی نہ آوے گی اور گویا بہتی ہوئی نہر میں سے نہایت قلیل پانی ہے تو اگر وہ مبسوط تفسیر چاہتا ہے تو ''روح المعانی'' کا مطالعہ کرے، کیونکہ علامہ آلوسی روایات کا خلاصہ و نچوڑ بیان کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ بلاغت و درایت سے متعلق بھی ابحاث ذکر فرماتے ہیں اور اگر وہ ایک تفسیر بھی مختصر چاہتا ہے تو وہ شیخ عارف عبدالرحمن ثعلبی جزائریؒ کی ''الجواهر الحسان'' کا مطالعہ کرے، یہ تفسیر مختصر بھی ہے اور انتہائی نفع مند بھی، اور اس میں علامہؒ نے نہایت خوش اسلوبی سے ابن عطیہؒ کی تفسیر کی تلخیص فرمائی ہے اور مختلف علوم سے متعلق تقریباً سو سے زائد کتابوں سے حاصل فوائد کا اضافہ کیا ہے، یہ کل آٹھ تفاسیر ہوئیں، جو چاہے اس سے زائد کا بھی مطالعہ کر لے، اس لئے کہ یہ موضوع تو پورا ہی خیر سے بھرپور ہے۔

ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

اور جس کسی کو ہندی اردو زبان میں نظم قرآنی کی سمجھ حاصل کرنی ہو اور اردو بھی دلنشین

اسلوب اور فصیح ترین تعبیرات سے مزین ہوتو وہ ہمارے حضرت شیخ المشائخ مولانا محمود حسن دیوبندیؒ متوفی ۱۳۳۹ھ (جو شیخ الہند کے نام سے مشہور ہیں) کا ترجمہ جس پر ہمارے حضرت شیخ محقق العصر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے تحریر کردہ تفسیری فوائد ہیں کا مطالعہ کرلے، اس لئے کہ ان دونوں حضرات نے نظم قرآنی کے مقاصد واغراض کو ایسے عجیب پیرائے میں سمجھایا ہے کہ گویا سارے فوائد قیمتی لعل وجواہر اور قابل قدر ورفعت گرانمایہ موتی ہیں، اور کبھی کبھار ان ضخیم جلدوں اور اس بھرپور تفسیری مواد سے بھی وہ مشکل گرہیں نہیں کھلتیں، جس کو آپ ان فوائد کی مختصر عبارات اور لطیف اشارات میں واضح پائیں گے۔ اللہ کریم ان حضرات کو ان کی محنتوں کا صلہ عطا فرمائے، آمین۔

ان تفسیری فوائد سے فضلائے زمانہ تک مستغنی نہیں، چہ جائیکہ طلباء کرام اپنی طالب علمی کے دور میں اس سے غفلت اور کوتاہی برتیں، عربی تفاسیر میں سے بھی کوئی تفسیر ان فوائد کے قائم مقام یا ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی، میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ: بقیہ تفاسیر سے یہ تفسیری فوائد مستغنی کرتے ہیں، بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح دیگر تفاسیر سے یہ فوائد مستغنی نہیں کرسکتے، اسی طرح دیگر تفاسیر بھی ان سے مستغنی نہیں کرسکتی۔

چند مطبوعہ تفاسیر کی خصوصیات وامتیازات

مفید تفاسیر کے موضوع سے متعلق -جن کا تذکرہ چل رہا تھا- میں نے ایک محاضرہ پیش کیا، جس کا خلاصہ یوں ہے کہ میں نے مطبوعہ کتب تفسیر کو چار اقسام پر تقسیم کیا ہے:

۱-علماء وائمہ عربی کی تفاسیر

جیسا کہ "الکشاف" اور "تفسیر ابی السعود"، اسی طرح کشاف سے اختصار کردہ "البیضاوی" اور "المدارك"، امام ابوحیان کی تفسیر "البحر المحیط" اور "النهر المادمن البحر" اور "الدر اللقیط من البحر المحیط"۔

تفسیر "الکشاف" کی خصوصیات کے متعلق میں نے اپنے محاضرے میں کافی بحث کی اور اس کے فوائد بھی بتلائے، ساتھ ساتھ مسلک اعتزال سے علامہ زمخشریؒ کا تعصب، اہل سنت پر طعن درازی، ان پر جبر وحشو کے فتوے، ان کے متعلق سخت کلام، یہاں تک کہ دشنام طرازی، سب وشتم اور باوجود اپنے زہد اور پرہیز گاری کے بعض علمی جوابات میں زبان درازی کے متعلق بھی میں نے خوب وضاحت کی، اللہ کی قدرت بھی بڑی عجیب ہے کہ جس نے اس قسم کی طبائع تخلیق فرما کر تقسیم فرمائیں اور میں نے یہ بھی کہا کہ: جو شخص بھی ان کے بعد آیا، وہ ان کے قائم مقام نہ بن سکا، اور سب نے علامہ ہی کے کلام کو مختصر وملخص کیا، یا چند الفاظ کا تغیر اور بعض تعبیرات کا اضافہ کیا۔

تفسیر کشاف کے بعد عمدہ ترین تفاسیر میں سرفہرست علامہ ابوسعودؒ کی تفسیر "إرشاد العقل السلیم إلی مزایا القرآن الکریم" ہے، اس لئے کہ کچھ فوائد ومسائل علامہؒ نے ایسے بیان فرمائے ہیں جو کشاف کے فوائد سے زیادہ ہے۔ بہرحال علمائے لغت اپنی تفاسیر میں علامہ زمخشریؒ کے مرہون منت ہیں، اور ان کی تفاسیر کا تانابانا اسی سے بندھا ہے۔

مذکورہ تفاسیر کے علاوہ شیخ عبدالرحمن جزائری ثعالبی کی تفسیر "الجواھر الحسان" کے متعلق بھی میں نے اپنا مدحیانہ وتعریفی تاثر پیش کیا، اس لئے کہ اس میں ابن عطیہؒ کی تفسیر کا خلاصہ ونچوڑ پیش کیا گیا ہے، اورتقریباسو سے زائد تفاسیر کی جانچ کی گئی ہے، خلاصہ وماحصل یہ کہ مذکورہ تفاسیر علماء لغت کی بہترین تفاسیر شمار کی جاتی ہیں اور علماء وطلباء میں رائج ہیں۔

۲-محدثین کرام کی تفاسیر

۱-تفسیر ابن جریرؒ

۲-تفسیر ابن کثیرؒ۔

۳-اور "الدر المنثور فی التفسیر بالماثور"

یہ تینں تفاسیر محدثین کرام کی بقیہ تفاسیر سے مستغنی کردینے والی ہیں۔

۳-علمائے منطق وکلام کی تفاسیر

متکلمین کی تفاسیر میں سرفہرست تفسیر علامہ رازیؒ کی "مفاتیح الغیب" اور اس کا خلاصہ "غرائب الفرقان" جو علامہ نیسابوریؒ کی کاوش ہے، شمار کی جاتی ہیں اور اس موضوع کے متعلق قدیم ترین تفسیر علامہ ابومنصور ماتریدیؒ کی "التاویلات" ہے، جس کی شرح شیخ ابوبکر سمرقندیؒ نے تحریر فرمائی ہے، اس کا بہترین نسخہ مکتبہ الحرم المکی سے چھپ کر شائع ہوا ہے، یہ انتہائی عمدہ تفسیر ہے اور علم کلام کی وسیع ابحاث سے بھرپور ہے۔

۴-فقہی احکام ومذاہب پر مشتمل تفاسیر

وہ تفاسیر جن میں فقہی احکام اور مذاہب فقہیہ کی ابحاث کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے ان میں سرفہرست علامہ قرطبیؒ کی "الجامع لأحکام القرآن" ہے جس میں فقہی ابحاث سمیت لغوی ابحاث کا بھی قدرے اہتمام کیا گیا ہے۔ اسی طرح علامہ ابوبکر جصاص رازیؒ کی تفسیر بھی فقہی رنگ سے مزین ہے، جس میں علامہ موصوفؒ نے مسائل فقہیہ کو بیان فرماکر ان کے دلائل کے متعلق خوب شرح وبسط فرمائی ہے اور "الفصول فی الاصول" گویا اپنی تفسیر کے لئے مقدمہ

کے طور پر تصنیف فرمائی ہے، اس کا بہترین نسخہ قاہرہ کے مکتبۃ الحکومۃ میں موجود ہے، اسی نسخہ کی نقل ہم نے بھی لی تھی، اسی طرح ہندوستان کے صوبہ دکن کے شہر ۔ ۔ آباد کے احیاء المعارف النعمانیہ کا منقولہ نسخہ بھی بہت عمدہ ہے اور علامہ جصاصؒ تو علم اصول، علم کلام، علم فقہ، علم حدیث میں تحقیق وتفتیش کا اعلیٰ درجہ رکھتے تھے، اور ان علوم میں حذاقت ومہارت کے ساتھ ساتھ خوب معلومات رکھتے تھے۔

فقہی تفاسیر کی اس فہرست میں قاضی ابوبکر بن العربی اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تفاسیر بھی قابل ذکر ہیں، قاضی ثناء اللہؒ نے اپنی تفسیر کا نام اپنے مرشد کریم عارف باللہ شیخ مظہر جان جاناںؒ نقشبندی کے نام پر "التفسیر المظھری" رکھا، فقہی مذاہب کی تحقیق کے متعلق یہ تفسیر عمدہ ترین تفاسیر میں شمار کی جاتی ہے اور دس مجلدات میں طبع کی گئی ہے۔

علامہ احمد جونپوری ہندیؒ کی "التفسیرات الأحمدیۃ" بھی قابل ذکر ہے جو آیات احکام ہی کی مشہور تفسیر ہے۔

۸۔صوفیاء کرام کی تفاسیر

تفاسیر کی پانچویں قسم صوفیاء کرام کی تفاسیر ہیں جیسے شیخ اکبرؒ اور امام غزالیؒ کی تفسیر، انہی کے مانند مہائمی ہندیؒ کی تفسیر "تبصیر الرحمن" بھی ہے، جس میں بڑی قابل قدر ابحاث ودیعت فرمائی گئی ہیں، عراق کے مفتی سید محمود آلوسیؒ نے اپنی تفسیر "روح المعانی" میں ان پانچوں موضوعات کو اپنی مشہور تفسیر میں جمع کرنے کا ارادہ فرمایا، چنانچہ یہ سب سے جامع ترین تفسیر ہے، جو اپنے ممیزات وخصائص نیز عبارت کی عمدگی اور ضبط میں حافظ ابن حجرؒ کی فتح الباری کی طرح ہے، لیکن اس تفسیر پر بھی ادبی اور کلامی رنگ غالب ہے اور چونکہ علامہ موصوف متاخرین میں سے ہیں، اس وجہ سے عصر حاضر کے مسائل ومشکلات کے متعلق بھی خوب بحث فرمائی ہے اور بعضے مواقع پر علامہ رازیؒ کے پیش کردہ مسائل کے جوابات پر بھی کچھ نقد ونظر فرمایا ہے، لیکن ازاں بعد کبھی کبھار ان کے جوابات کے متعلق ازخود سکوت فرمایا ہے۔

علماء ہند بالخصوص علماء دیوبند کے کارہائے نمایاں
اہل باطل واہل حق کی تفاسیر کی نشاندہی

اس مقام پر پہنچنے کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ علماء ہند خاص طور پر علماء دیوبند کی قرآن وحدیث کے متعلق خدمات' شریعت اسلامی سے بدعات کی روک تھام، برطانوی سامراج سے خلاصی اور آزادی وطن کی خاطر علمی وعملی جد وجہد' حمیت اسلامی اور دینی غیرت کی تخم ریزی ، ہند کے عوام وخواص کے قلوب میں اسلامی عروج وترقی اور حریت وطن کی روح پھونکنا، اور انہیں پردیسی دھوکہ باز خائن حکومت کے شکنجے سے بچانے کے بارے میں ان علماء کی خدمات کو آشکارا کردوں، یہ تمام خدمات ان علماء کرام کے بڑے احسانات ہیں، جو روز روشن سے زیادہ نمایاں ہیں، جن کو مؤرخین ہرگز فراموش نہ کرسکیں گے۔

باشندگان ممالک عرب کی ان علماء کی خدمات سے متعلق عدم واقفیت اور بعض اہل قلم اور صحافیوں کی ان کے متعلق طعن زنی اور ان کی ان خدمات کے اخفاء کے ساتھ ساتھ انصاف اور دیانت سے قطع نظر حق جوار میں کوتاہی کرتے ہوئے ان پر اتہام طرازی نے مجھے برانگیختہ کیا کہ میں ان خدمات کی وضاحت کروں۔

ہائے افسوس! کہاں ہے انصاف!! کدھر گئی دیانت!! انصاف ودیانت کو تو دور لے جانے والا عنقا لے اڑا، اور دور افتادہ بیابانوں تک لوگوں کی رسائی بھی کم ہے۔ لیکن ان تمام خدمات کی تفصیلات اس مقام پر ممکن نہیں، لہٰذا چند خدمات کے متعلق ذیل میں ذکر ہوگا جو گویا بجلی اور چمک ہیں جو موسلا دھار بھرے بادلوں کی طرف رہبری ورہنمائی کرے گی۔

۱-علمائے ہند کے ان کارہائے نمایاں میں سے فارسی زبان میں تحریر کردہ تفسیر "البحر المواج" ہے، جو آٹھویں صدی ہجری کے علامہ شمس الدین دولت آبادی، الدہلوی کی

ہے، یہ قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی کے احباب ارادت میں سے ہیں۔

۲- شیخ علی بن احمد المہائمیؒ متوفی ۸۳۵ھ کی عربی تفسیر "تبصیر الرحمن" ہے جو چار مجلدات پر حاوی ہے، مہائم بمبئی کے قریب ساحل سمندر پر واقع ایک شہر ہے، مصر سے یہ تفسیر طبع کی گئی ہے، یہ نہایت عمدہ اور نفیس تفسیر ہے، جس میں ربط بین السور والآیات کے متعلق خصوصی فوائد ذکر کئے گئے ہیں اور دیگر کئی فوائد بھی اس تفسیر میں موجود ہیں۔

۳- شیخ محدث محقق قاضی ثناء اللہؒ پانی پتی کی "تفسیر مظہری" ہے، یہ بھی عربی تفسیر ہے، قاضی صاحب حجۃ اللہ البالغۃ کے مصنف حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تلامذہ میں سے ہیں، یہ بھی نہایت عمدہ تفسیر ہے، بالخصوص احکام ومسائل اور مختلف فقہی مذاہب کے متعلق نفیس ابحاث پر مشتمل ہے، حال ہی میں دس بڑی مجلدات پر حاوی یہ تفسیر طبع ہوئی ہے۔

۴- ابوالفیض فیضی کی تفسیر "سواطع الإلهام" ہے جو آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستانی بادشاہ جلال الدین اکبر کی سلطنت اکبریہ کے علماء میں سے ہیں، ابوالفیض نے قرآن کریم کی یہ تفسیر غیر منقوط حروف سے لکھی ہے اور اس کے متعلق خوب تکلف سے کام لیا، جس کی بناء پر یہ تفسیر فی نفسہ بے فائدہ ہوگئی، لیکن اتنی سخت محنت ومشقت سے تحریر کردہ یہ تفسیر بہرحال قابل تعریف ہے، جو مؤلف کی عربی زبان پر حذاقت ومہارت کی خبر دیتی ہے کہ اس غیر منقوط حروف کے استعمال کو اخیر تفسیر تک برقرار رکھا ہے۔

۵- نواب صدیق حسن خان قنوجیؒ کی تفسیر "فتح البيان" ہے، جو کئی مجلدات پر مشتمل ہے، ان تفاسیر کے علاوہ، دیگر کئی تفاسیر عربی اور فارسی زبان میں ہندی علماء کے شاہکار ہیں، جن کی تفصیلات بیان کرنا مشکل ہے۔

خانوادۂ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور خدمت ترجمہ قرآن

علاوہ ازیں ہندوستان میں قرآن کریم کا فارسی میں سب سے پہلا ترجمہ کرنے والے اور امت میں قرآن کریم کے ترجمہ کا رواج ڈالنے والے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ متوفی ۱۱۷۶ھ تھے جو "حجة الله البالغة"، "البدور البازغة"، "الخير الكثير"، "التفهيمات

- جب کہ قرآن کے بعض حصے کا فہم واجب ہے-تو یہ علوم بھی ہر مکلف پر واجب ہو جائیں گے، اس لئے کہ امر واجب تک پہچانے والا عمل بھی واجب ہوا کرتا ہے، جیسا کہ یہ اصول اپنے مقام پر مسلم ہے۔

یہ بات تسلیم ہے کہ قرآن فہمی ترجمہ سے حاصل کرنا عزیمت نہیں ہے ،لیکن جہاں عزیمت کے رأساً وکلیۃً فوت ہونے کا اندیشہ ہو، وہاں رخصت پر عمل کر لینا ہی عزیمت ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو قرآنی اعجاز کی معرفت کے حصول کا اور قرآن کے ایجاز واطناب کے باریک ولطیف نکات کے پہچاننے کا مکلف نہیں ٹھہرایا ہے، اس لئے کہ یہ ہر شخص کی قدرت سے بالا تر ہے، کیونکہ کچھ کو اس طرح کا جہت فہم میسر ہو جاتا ہے اور کچھ محروم رہتے ہیں، جبکہ قرآن پاک تمام لوگوں کے واسطے خدائے کریم کا پیام اور جہاں والوں کے لئے ہدایت نامہ ہے، اگر مختلف لغات میں اس کے تراجم کر کے اس کی نشر واشاعت کی جائے تو تمام انسانوں پر خدا کی حجت تمام ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مذکر﴾ یہ آسانی اور تیسیر کیونکر حاصل ہو سکے گی، اگر عجمی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ کرنا جائز ہی نہ ٹھہرے؟ حالانکہ آیت مذکورہ کے ذیل میں قرآن کریم کی یہ خاصیت آشکارا کی گئی ہے کہ ہر شخص اس قرآن سے مستفید ومستفیض ہو سکتا ہے، عالم اپنے علم کے ذریعے اور عامی جب اس کے معنی ومفہوم کو حاصل کر لے اور اغراض ومقاصد کو سمجھ لے تو اپنے فہم سے اس قرآن سے بہرہ ور ہو سکتا ہے، بیان کردہ یہ مقدمات غور واعتبار کے قابل ہیں، تاکہ زیر بحث مسئلہ واضح ہو جائے۔

جہاں تک قرآن کریم کی تفسیر بیان کرنے کا معاملہ ہے تو کبار علماء میں سے بھی چند ایک افراد ہی اس بھاری ذمہ داری کے متحمل ہو سکتے ہیں، چہ جائیکہ عام جہلاء وعوام کو اس کا اختیار دیدیا جائے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ہند وپاک کے علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ فی زمانہ قرآن کریم کا ترجمہ مختلف لغات میں جائز ہے، جب کہ مصری علماء اور مشائخ ازہر شریف اب تک اس مسئلہ کے

متعلق شش و پنج میں متبلا ہیں، اور علیحدہ رسائل صرف اسی مسئلہ کے متعلق تحریر فرمائے ہیں، لیکن مقام ہذا میں راقم ان تمام تر تفصیلات کے بیان سے قاصر ہے۔ واللہ الموفق

۲- حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعد اسی خانوادۂ ولی اللہی کے فرد حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بیٹے شاہ عبدالقادر دہلویؒ [متوفی: ۱۲۳۰ھ] اپنے والد بزرگوار کے نہج پر گامزن ہوئے اور ہندی اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ تحریر فرمایا، چنانچہ بہت بہترین اور عمدہ ترجمہ فرمایا۔ آج قرآن کے ترجمہ اور فہم میں ہندی باشندوں کا مدار اسی پر ہے۔

موصوفؒ نے اس ترجمہ کو تنقیح وتہذیب میں، اس کے اسلوب کی عمدگی اور معنوی لطافت ودقت میں ایسے بلند وبالا مرتبہ پر پہنچادیا کہ وہ اس آسان راستہ کی مانند ہوگیا جو تمام رکاوٹوں سے دور ہو اور ایسا آسان اسلوبِ بیان جس کی نظیر ونقل نہ لائی جاسکتی ہو۔

پھر اس ترجمہ کو مفید تفسیری فوائد تحریر فرما کر مزید نفع بخش بنادیا، جنہوں نے قرآن کریم کی اغراض ومقاصد کے عمدہ موتیوں پر پڑے پردوں کو کھول دیا، ان کے بعض لطائف وفوائد کی نظیر کتب تفاسیر کے موجودہ وافر وکثیر مادے میں ملنا مشکل ہے، چنانچہ ان تمام فوائد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے!!

شیخ کا ترجمہ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے حد اعجاز کے قریب ہے، اور اگر بشری کلام بھی معجز ہوا کرتا تو بعض مواضع میں علامہ موصوفؒ کے ترجمہ کو معجز کہنا بالکل برمحل ہوتا، لیکن خداوند تعالیٰ نے صفت اعجاز کے ساتھ فقط اپنے کلام کو مختص فرمادیا ہے، لیکن بہرحال یہ خصوصیت ایسی ہے کہ دیگر تراجم اس کے مقابل ومساوی نہیں ہوسکتے ہیں۔

۳- اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دوسرے بیٹے جو شاہ عبدالقادرؒ سے بڑے تھے شاہ رفیع الدین دہلویؒ [متوفی: ۱۲۳۳ھ] نے بھی قرآن کا اردو ترجمہ فرمایا، جس میں کلمات قرآن کی ترتیب کے مطابق لغوی ترجمہ کی رعایت فرمائی ہے اور عوام کے لئے یہ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ سے زیادہ بہتر ونفع بخش ہے۔

۴- اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہؒ کے سب سے بڑے بیٹے الحجۃ، عارف باللہ شاہ عبد

العزیز دہلویؒ متوفی: ۱۲۳۹ھ نے اپنے بعض احباب کو قرآن کریم کے آخری دو پاروں کی تفسیر لکھوائی، پھر پہلے پارے کی تفسیر لکھوائی اور دوسرے پارے کی تفسیر: "﴿و أن تصوموا خيراً لكم﴾ تک مکمل فرما سکے اور اس تفسیر کا نام "الفتح العزیز" رکھا، اس میں ایسے بیش بہا علوم اور گرانمایہ فوائد ہیں جو ان کے وسیع تبحر علمی، محیر العقول استحضار، باکمال حافظے اور مضبوط وعمدہ تعبیرات کے متعلق قاری کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ فوائد علامہ محترمؒ نے کتب تفاسیر کی مراجعت کے بغیر زبانی حافظہ کی مدد سے تحریر کروائے ہیں، خدائے کریم کی قدرت بھی بڑی عجیب ہے، جس کو چاہے، جیسے کمالات چاہے، نوازش فرمادے- سبحان اللہ- ہمارے شیخ امام العصرؒ فرمایا کرتے تھے کہ کاش! یہ تفسیر اسی طریق پر مکمل ہوجاتی تو مقدرت بشری کے مطابق جو قرآن پاک کی تفسیری ذمہ داری ہم انسانوں پر عائد ہے، وہ پوری ہوجاتی۔

ترجمہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

۵- بعد ازاں تقریباً نوے یا سو سال بعد قرآن کریم کا بہترین ترجمہ حضرت علامہ شاہ اشرف علی تھانوی دیوبندیؒ نے فرمایا: جو حضرت قطب عارف باللہ مولانا یعقوب نانوتویؒ (متوفی ۱۳۰۰ھ، جو اپنے زمانہ کے دار العلوم دیوبند کے مدیر وصدر تھے) کے شاگرد رشید تھے۔ حضرت تھانویؒ کو حضرت شیخ الہندؒ سے بھی تلمذ حاصل تھا، اس ترجمہ کے ساتھ حضرت تھانویؒ نے اردو میں چند مجلدات میں تفسیر بھی تحریر فرمائی ہے، جن میں بڑی مشقت اور خوب جد وجہد کے ساتھ دیگر تفاسیر کا مطالعہ فرمایا اور مفید امور کو اختصار کے ساتھ تحریر فرمایا اور مشکل مقامات کو نہایت عمدگی کے ساتھ حل فرمایا ہے، اور طلبہ کرام کے لئے عربی میں فوائد تحریر فرما کر اس کا نفع مزید بڑھا دیا۔ اس تفسیر کے لئے "بیان القرآن" کا نام تجویز فرمایا۔

۶- ان کے بعد حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی دیوبندیؒ نے قرآن کریم کا ترجمہ فرمایا اور اس ترجمہ کے ساتھ تفسیری فوائد بھی رقم فرمائے۔

ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ وتفسیری فوائد علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

۷- پھر جب حضرت شیخ الہندؒ آزادی وطن کی تحریک کے سلسلے میں مالٹا میں اسیر ہوئے تو تمام تر مشغولیات سے فارغ ہوکر قرآن کریم کے مطالعہ میں ہمہ وقت مصروف ہوئے، اس وقت حضرتؒ نے عصری رائج اردو کے اسلوب کے مطابق ترجمہ وتفسیر قرآن کی دینی ضرورت محسوس فرمائی، چنانچہ ترجمہ تحریر فرمانا شروع کیا اور اسیری ہی کے زمانہ میں مکمل فرما کر اس ترجمہ کا حق ادا کردیا، اس ترجمہ کی بنیاد حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ پر رکھی، جو اس وسیع میدان کے سب سے پہلے شہسوار تھے۔

اس ترجمہ کے متعلق حضرت شیخ الہندؒ کا خیال تھا کہ: علم وکمال کے اعتبار سے اس پر غالب آنا اور اس سے آگے بڑھنا تقریباً محال ہے، لیکن چونکہ حضرت شیخ الہند بھی خوب باریک بین اور فکری لطافت کے حامل تھے اور ان کا سینہ اور دل نور ایمان سے ایسا معمور ومنور تھا کہ ان کی منزلت پر پہنچنا تو کجا ان کی گرد پا تک پہنچنا بھی دشوار تھا، انہوں نے بعض تعبیرات کو نہایت ہی نفاست اور خوش اسلوبی سے تبدیل کیا اور تمام ان خصوصیات کی رعایت ملحوظ رکھی جو شاہ عبدالقادر کے ترجمے میں پائی جاتی تھیں، چنانچہ ترجمہ میں صفت، بدل اور عطف بیان کے درمیان فرق کی رعایت کی اور جو مقام سب کا احتمال رکھتا ہو تو وہاں لطافت معنوی دیکھ کر جو ترجمہ مقام کے لائق ہو وہ ترجمہ فرمادیا، علاوہ ازیں یہ ترجمہ دیگر کئی محاسن وخصوصیات کا حامل ہے جو دل لبھا دینے والے ہیں اور جتنا غور وتدبر کیا جائے، اس کے اچھے محاسن نمایاں ہوتے رہتے ہیں:

غراء مبسام كأن حديثها
در تحدر نظمها منثور

ترجمہ: "محبوبہ کا تبسم بہت خوشنما ہے، گویا کہ اس کی باتیں ایسے موتی ہیں جن کا نظم وشعر بھی نثر ہے"

اور جیسا کہ ابونواس کہتا ہے:

يزيدك وجهه حسنًا
إذا ما زدته نظرًا

ترجمہ: جتنا زیادہ اے مخاطب! تو محبوب کے چہرے کو دیکھے گا، اتنے محاسن اس کے تجھ پر نمایاں ہوں گے

اسی طرح ایک اور عرب شاعر کا جو عرب کے جھنڈے کا اٹھانے والا شمار کیا جاتا ہے، کا شعر ہے کہ:

ورحنا يكاد الطرف يقصر دونه
متى ما ترق العين فيء تسهل

ترجمہ: ''ہم اتنا چلے مگر پھر بھی نظریں اس کی انتہاء تک نہ پہنچ سکیں۔ جب بھی نگاہیں اس میں اوپر کو اٹھتی ہیں، تو نیچے کی طرف لوٹ آتی ہیں''۔

بعد ازاں شیخ الہند نے اس ترجمہ پر تفسیری فوائد تعلیق فرمانا شروع کئے اور سورۂ نساء کے اخیر تک پہنچ گئے، اور اس میں نص قرآنی کے فہم کے لئے ایک عام شخص کو جتنی تشریحات کی احتیاج ہوتی ہے، وہ تمام تر تشریحات فوائد کے ذیل میں عجیب طریقے سے قرآن کریم کے اغراض و مقاصد کو واضح کرتے ہوئے روشن تعبیرات کے ساتھ بیان فرمائی۔

اسیری اور قید و بند سے جب حضرت شیخ الہندؒ کو نجات ملی اور سرزمین ہند پہنچے تو ان پر مختلف امراض کا شدید حملہ ہوا، بہر حال اجل مقدر نے ان کو مہلت نہ دی اور قضا کا وقت قریب ہوا، فضاء تنگ ہوگئی اور شیخ الہندؒ ۱۳۳۹ھ میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی وفات کے پورے ایک سو سال بعد رفیق اعلیٰ کو واصل ہوئے۔

ناگاہ حوادث نے سورۂ آل عمران کے فوائد ضائع کر دیئے اور یہ تفسیر یوں ہی نامکمل رہی اور کوئی عبقری شخصیت ایسی نہ ہوئی جو حضرت شیخ الہندؒ کے ان تمام فوائد تفسیر یہ کو ان کی منشاء کے مطابق پایۂ تکمیل تک پہنچاوے تا آں کہ یہ ازلی سعادت ان کے شاگرد رشید اور خصوصی رفیق محقق العصر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ صاحب ''فتح الملهم'' کے حق میں ظاہر ہوئی، چنانچہ علامہ عثمانیؒ نے تین سال کی مدت میں تمام قرآن کریم کے فوائد شیخ الہندؒ کے اسلوب کی رعایت کرتے ہوئے مکمل فرمائے اور ایسے کلمات و تعبیرات سے فوائد کو مزین فرمایا جو سارے کے سارے گویا کہ لعل و جواہر ہیں، ان تفسیری فوائد میں زمانہ کی ضرورت کے مطابق باطل فرقوں کے

مردود، بے کار اقوال کے بطلان کو واضح فرمایا، جیسے محمد علی قادیانی لاہوری، جس نے اردو اور انگریزی میں ''بیان القرآن'' کے نام سے تفسیر لکھی، اس کے مانند دیگر اہل بدعت کی قابل تنقید تشریحات کی تردید تحریر فرمائی، ان فوائد کا کچھ تذکرہ گذشتہ صفحات میں بھی آچکا ہے۔

یہ مذکورہ تراجم اہل حق علماء کے ہیں اور مستند تراجم ہیں، جن سے خداوند کریم نے امت کو بہت بہرور فرمایا، اور اقلیم ہند کے تمام علاقوں میں ان تراجم پر قرآن فہمی کا مدار ٹھہرا اور مختلف علاقوں میں ان کی خوب نشر واشاعت ہوئی، علماء وطلباء جو شعبۂ درس وتدریس سے متعلق تھے اور ہیں، ان سے خوب نفع اٹھاتے رہے ہیں، خاص طور پر آخر الذکر ترجمۂ شیخ الہندؒ اور ان کے تفسیری فوائد خوب مقبول ہوئے، اسی اثناء میں اور اس تفسیر کے بعد بھی قرآن کریم کے تراجم اور ان پر تفسیری فوائد تحریر کئے گئے۔ جن میں بعض صحیح اہل حق کے تھے۔

۸- اسی ترجمہ وتفسیر کی طرح حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا ترجمہ قرآن وتفسیری فوائد بھی قابل تحسین ہیں۔

چند قابل گرفت اردو تراجم

۹- ان میں مولانا شیخ حسن علی پنجابیؒ کا ترجمہ قرآن بھی قابل ذکر ہے، مولانا موصوفؒ قطب زمان مولانا محدث ابو مسعود رشید احمد گنگوہی دیوبندیؒ متوفی: ۱۳۲۳ھ کے شاگرد تھے، بعد ازاں ان کے تحریر کردہ فوائد وامالی کو میں نے قابل مؤاخذہ ونقد پایا، جن میں ان کا قلم سیدھی راہ سے زلت کا شکار ہوا ہے، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا یہ ضبط کرنے والے کی طرف سے ہے یا خود صاحب تعلیق کی رائے ہے، بہرحال اس پر نظر ثانی کی گئی ہے چنانچہ بعض مواضع تفسیری کوتاہی کی بنا پر تنبیہ کے محتاج معلوم ہوتے ہیں، جن میں چند مواضع یہ ہیں:

۱- ذبح بقرہ والی آیت۔ ۲- فأتوا بسورة من مثله.

۳- لا تقولوا راعنا. ۴- تحویل قبلہ کے متعلق تفسیری فائدہ۔

۵- ومن یکفر بالطاغوت. ۶- آیت الکرسی وغیرہ یہ مواضع لائق تنبیہ ہیں۔

اور میں نے کچھ عرصہ قبل سنا کہ کسی ہندی عالم نے ان کی تفسیر وترجمہ کے رد میں باقاعدہ

ایک کتاب تالیف فرمائی ہے۔

ہندوستان کے بعض مفسرین نے درست و نادرست کی آمیزش سے بھی تفسیر مرتب کی ہے، جن میں ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور مرزا حیرت دہلوی کا ترجمہ سرفہرست ہے، انہی ہندی مفسرین میں سے بعض نے قرآن کی مراد میں تحریف بھی کی ہے اور معنوی اعتبار سے گویا قرآن کو مسخ کردیا ہے، قرآن کو اپنی خواہشات کے قالب میں ڈھال کر اپنے واسطے جہنم کا ٹھکانہ تیار کیا ہے، جیسے محمد علی قادیانی جس کے متعلق گذشتہ سطور میں کچھ اشارہ کیا گیا، اس نے اپنی تفسیر میں سرسید احمد خان دہلویؒ -بانی علی گڑھ یونیورسٹی- کی تفسیر پر اعتماد کیا، اسی طرح حکیم محمد احسن امروہی مرزائی قادیانی ہے، جس کی تفسیر کا نام جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، غالباً "غایۃ البیان" تھا جس میں موصوف نے باطل اقوال خوب ذکر کئے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی خوب سازش کی ہے۔

سرسید احمد خان اور ان کی تفسیر

چونکہ سرسید احمد خان کی تفسیر کے متعلق تذکرہ چلا، اس لئے اگر ان کی شخصیت اور ان کی تحریر کردہ تفسیر کے متعلق وضاحت نہ کی جائے تو یہ مذہبی مداہنت اور عملی نفاق ہوگا، اس لئے کہ وہ بہت سے ایسے باطل پرست روشن خیال لوگوں کے رہبر و رہنما ہیں، جن کے لیے ان کی کج روی کی بنا پر ملت اسلامیہ کی سیدھی اور ستھری راہ تاریک کردی گئی ہے، سرسید احمد خان زندیق اور ملحد شخص تھے یا پھر جاہل گمراہ، حق کی جانب راہ روی کے خواستگار تھے، لیکن سیدھی راہ ان سے خطا ہوگئی، انہوں نے شرعی معاملات اور شعائر ملت کے متعلق اپنی گمراہ اور ناکارہ عقل کو کسوٹی ٹھہرایا، جس کی بنا پر خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، ان کا طرز وطریقہ یہ تھا کہ اہل یورپ واہل مغرب، ملت اسلامیہ پر جو بیکار اعتراضات کیا کرتے تھے، موصوف ان کو قبول کرتے تھے، پھر قرآن وسنت میں تاویلات کرتے تھے، اور اسلام کو کفر کے قریب کر کے دونوں کو ایک ہی دین بتلاتے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف یہ تمام تر تاویلات اس لئے کیا کرتے تھے کہ اس طرح وہ ان کافروں کے دربار میں جن کے ہاتھ میں ہندوستانی حکومت کی باگ ڈور تھی، تقرب اور شرف

باریابی حاصل کرلیں۔

چنانچہ انہوں نے فرشتوں کا انکار کیا اور کہا کہ: ملائکہ خیر کے فطری ملکہ کا نام ہے جو انسانی فطرت وجبلت میں ودیعت ہے، یہ کوئی مستقل عالم سے عبارت نہیں جو وجود انسانی سے کوئی خارج شیٔ شمار کیا جائے، بلکہ یہ ان صفات میں سے ہے جو انسان کے اندر ہی موجود ہیں۔

اسی طرح شیطان کا بھی انکار کیا اور کہا کہ: ''شیطان اس شری ملکہ سے عبارت ہے جو فطرت انسانی کا حصہ ہے، اسی طرح حشر اور معاد جسمانی کا انکار کیا، بلکہ ملحد فلاسفہ کی طرح صرف معاد روحانی کا قائل ومعتقد ہوا اور اسی طرح آسمانوں اور ارواح کے وجود کا بھی منکر ہوا۔

موصوف شرعی نبوت - جو خدائی عطیہ ونوازش ہے - کے بھی منکر تھے، جو نبوت حضرت خاتم النبیین ﷺ پر جا کر تمام ہوئی، وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ: یہ نبوت کسبی ہوتی ہے، انہوں نے نبوت کی صفات وعلامات میں تحریف وتبدیل سے کام لیا، نبی اور کسی بھی امت کے عام مصلح کو برابر قرار دیا، چاہے وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو، اسی طرح ان معجزات کا بھی انکار کیا جو انبیاء کرام کے ہاتھوں سے خداوند کریم وقدیر کی قدرت سے ظاہر ہوئے کہتے ہیں کہ: ''خوارق کا ظہور خداوند کریم کے دست قدرت سے بالاتر ہے، گویا کہ موصوف نے تکلیف وتشریع کی بنیاد ہی کو باطل قرار دیا، بلکہ تمام قطعی ضروریات دین اور صریح صحیح قطعی نصوص کی بھی تاویلات کیں، جن کی قطعیت دلالت وثبوت کے اعتبار سے مسلم ومتفق ہے، حتی کہ میرٹھ کے ایک خطاب میں کہنے لگے کہ: دنیوی معاملات تو خود اسلام نے ہمارے سپرد کر رکھے ہیں کہ جس طرح چاہیں جیسے چاہیں ان کے متعلق تصرف کریں، اس لئے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمادیا ہے کہ: ''أنتم أعلم بأمور دنیاکم منی'' تم اپنے دنیوی معاملات کو مجھ سے بہتر جانتے ہو، جہاں تک دینی معاملہ کا تعلق ہے تو اس میں خوب وسعت وکشائش رکھی گئی ہے، فرمایا گیا کہ: ''من قال: لا إله إلّا الله دخل الجنة وإن زنی وإن سرق'' جس شخص نے کہا کہ: خدائے برحق کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ جنت میں گویا داخل ہو گیا، اگرچہ زنا یا چوری کا مرتکب ہو۔

موصوف کے نزدیک ساری شریعت اسلامی کا یہی خلاصہ اور نچوڑ ہے، چنانچہ وہ

قرامطہ باطنیہ، اسماعیلیہ، مزدکیہ، اخشونیہ جیسے ملحد زنادقہ کے گروہ میں شامل ہو گئے، جنھوں نے قطعی ضروریات دین میں دوراز کار تاویلات کر دیں، بلکہ موصوف ان کے روحانی شاگرد معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے ہی افکار کو اخذ فرما کر یہ گمان کر بیٹھے کہ خود ان نظریات کے موجد ہیں، شیطان نے انہیں ان گمراہ راستوں کو مزین دکھلایا تو انہوں نے نصوصِ قرآنی اور احادیثِ نبوی میں ایسی نکمی اور بیکار تاویلات کیں جن سے طبائع سلیمہ کراہت محسوس کرتی ہیں اور سماعت صحیحہ مسترد کر دیتی ہیں، اس طرح کی تاویلات تو ایک عقلمند شخص کے کلام کی بھی نہیں کی جاسکتیں، چہ جائیکہ خدائے پاک کے بلیغ و فصیح اور معجز کلام میں ایسی نکمی تاویلات کو راہ دی جائے یا حضور پاک ﷺ کو جنہیں جامع کلمات کی گویائی سے سرفراز فرمایا گیا، کے کلام کی ایسی بھونڈی تاویلات زیر غور لائی جائیں۔ دراصل خدائے پاک نے موصوف کی خرد و بصیرت کو اندھا فرما دیا تھا، جس کی بناء پر وہ اتنی تمیز بھی نہ کر سکے کہ آیا ان تاویلات کی من حیث العربیۃ قرآن وسنت کے کلمات میں گنجائش بھی ہے یا نہیں؟ اور یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اعدائے دین اور دشمنان ملت نے واضح جہالت کے پردے ان کی آنکھوں پر ڈال دیئے تھے اور جس کو خدا نور سے نہ نوازے، واقعۃً وہ نورِ فہم و فراست سے سرفراز ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

ستم بر آں! کہ ان تاویلات کو وہ دین کی خدمت خیال کرتے تھے اور تاویلات کے ذریعے کافروں اور مسلمانوں کو ایک مذہب کے پیرو بتلاتے تھے۔

اس طرح کی تاویلات سے موصوف نے قرآن پاک میں تحریف کی اور دین اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر دیا اور شریعت مطہرہ کے ستھرے خد و خال کو بدصورت و بدنما کر دیا، انہیں فاسد تاویلات کی بنیاد پر موصوف نے ''تفسیر القرآن'' کے نام سے اردو میں تفسیر تالیف کی، یہ تفسیر ''تفسیر القرآن'' کے بجائے ''تحریف القرآن'' کہلائے جانے کی مستحق ہے، بلکہ موصوف اپنی اس تحریف (بنام تفسیر) میں یہودی علماء سے بھی ایسی سبقت لے گئے کہ ان کو کہیں دور چھوڑ دیا، لیکن چونکہ نظمِ قرآن کی حفاظت کا خدائے پاک نے وعدہ فرما رکھا ہے، اس لئے موصوف اس نظم قرآنی میں تحریف وتغیر پر قادر نہ ہو سکے، وگرنہ ان کی شخصیت سے یہ تغیر وتحریف بھی کچھ بعید نہ تھا،

اور قریب تھا کہ ان کو اس تحریف لفظی سے کوئی چیز نہ روکتی۔ اس طرح موصوف نے اہل یورپ واہل مغرب کی دین مٹانے کی سازش کے لئے اپنا قیمتی دین فروخت کر دیا۔

پھر ان کی یہ تحریفات یہاں تک ہی منحصر نہ رہیں، بلکہ اس الحاد وزندقہ آمیز تاویلات کو انہوں نے اپنی تفسیر اور دیگر تالیفات وخطبات میں خوب پھیلایا، لیکن خدائے پاک نے قیامت تک کا اپنے دین کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور اپنے بندوں میں اس کی سنت وطریق یہ رہا ہے کہ کوئی بھی دور دینی معاملات کے محافظین اہل حق سے خالی نہیں رہا۔

مشہور ضرب المثل ہے کہ: "لکلّ فرعون موسی، ولکلّ خرق راقع" یعنی ہر فرعون کے لئے موسیٰ ہوتا ہے اور ہر پھٹن کے واسطے پیوند کار بھی ہوتا ہے، چنانچہ اس ملحد وزندیق کے کفر والحاد کو مٹانے اور اس کی باطنی خباثت ونجاست سے دین کو پاک وصاف کرنے کے لئے خدائے پاک نے مولانا ابو محمد عبد الحق کو منتخب فرمایا، جو دہلی کے رہنے والے اور دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے، حقانی کے لقب سے معروف تھے، چنانچہ انہوں نے قلم اور زبان سے ان کی خوب تردید کی، اور جلتا انگارہ اس ملحد کے پہلو اور پسلیوں میں رکھدیا اور اس کی روداد زندگانی وبد باطنی سے لوگوں کو آشنا کر دیا۔

اسی طرح خدائے پاک! گمراہ فرقوں کی سرکوبی کے لئے ایسے قابلِ قدر افراد امت کو چنتے ہیں جو تجربہ کار بھی ہوتے ہیں اور زمانہ کی فتنہ انگیزیوں اور نیرنگیوں سے خوب واقف بھی، جو ایسے ملحدین وزنادقہ کی خفیہ اسکیموں اور پروگراموں کو خوب پرکھ لیتے ہیں اور ان کے خسائس ورذائل اور بد باطنی پر مطلع ہوتے ہیں، جس کے باعث وہ ان کی مکروہ اسکیموں کو صاف ستھری دینی تعلیمات سے الگ کرنے کے فن میں کمال رکھتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ محترم مولانا عبد الحق نے "فتح المنان" کے نام سے سرسید کی تفسیر پر رد تحریر فرمایا اور امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس تفسیر کو خوب نفع مند فرمایا۔ انہی فاضل مؤلف کی ایک مبسوط کتاب بھی ہے جو گویا ان کی تفسیر کے لئے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں فاضل مؤلفؒ نے سرسید کے الحاد کی بنیاد کو آشکارائے عالم کیا ہے اور اس کے فاسد وباطل اصول کی خوب

تنقید وتردید کی ہے۔اس کتاب کا نام "البيان فى علوم القرآن" ہے،اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا،جس کو مشرقی ومغربی ممالک میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی،سرسید کے کردار کے متعلق یہ چند نمونے ہیں،اس کے مطابق اے ہوشمند و باخبر مخاطب !انصاف فرمایئے۔ انصاف بہترین صفت ہے۔ میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر آپ سے سوال کرتا ہوں کہ دینی معاملات یا حمیتِ وطنی اور حریتِ وطن میں سے کوئی معاملہ ایسا ہے جس کو تباہ وبرباد کرنے کی اس ملحد وزندیق نے کوشش نہ کی ہو، کاش !کہ اس کے یہ کفریہ نظریات وافکار لوگوں میں نہ پھیلتے !!!ورنہ موصوف نے تو یہ ارادہ کرلیا تھا کہ لوگوں کو اپنے دین کے تابع بنادیں اور لوگ ان کے منہ سے بکے ہفوات کو تسلیم کریں اور ان پر کاربند رہیں۔

اپنی بعض کتابوں میں موصوف نے حجۃ الاسلام امام غزالیؒ تک کے افکار کا استہزاء کیا ہے،اندازہ لگایئے کہ اس بیوقوف ملحد وزندیق کی بیوقوفی کہاں تک پہنچ گئی اور اس کا یہ اندھاپن اسے کن راہوں پر گامزن کر گیا کہ اپنی باطل تاویلات وتحریفات کو دقائق واسرار شمار کرنے لگا، یہاں تک کہ اپنی تفسیر میں صحابہ کرامؓ کے متعلق یوں کہہ گیا کہ:

> ''اونٹ چرانے والے' چرواہوں کو ان حقائق کی کیا خبر اور کیا سمجھ ہوسکتی ہے،اسی واسطے شریعت اسلامی نے ان کے لئے باریک مثالوں کے بجائے ان کی فہم ودانست کے مطابق ادنیٰ سی مثالیں بیان فرمائیں''

افسوس صد افسوس !غور کیجیے اس کی شرانگیزی کتنی فتنہ انگیز اور خطرناک ثابت ہوسکتی تھی، ان کے افکار تو بمثل اس مقولہ کے ہیں کہ :"تفاقم الشر و بلغ السكين العظم"یعنی شر حد ود پھلانگنے لگا اور چھری سرایت کرتے کرتے ہڈی تک پہنچ گئی''۔

مزید تعجب مجھے مشہور مورخ ''سیرۃ النبی'' اور''الفاروق'' وغیرہ جیسی گرانمایہ کتابوں کے مصنف علامہ شبلی نعمانیؒ پر ہوتا ہے کہ موصوف سرسید کے متعلق کیسی عجیب عقیدت رکھتے تھے، مجھے تو اس پر اس قدر افسوس ہوا جو نا قابل برداشت وبیان ہے، جب موصوف اپنے مکاتیب میں

سرسید کو یوں کہتے ہوئے مخاطب ہوئے ''سیدی ومولائی'' اور جب سرسید کا انتقال ہوا تو اسکے کسی معتقد کو موصوف علامہ شبلی نعمانیؒ یوں لکھتے ہیں کہ:

> ''ملت اسلامی کے ستون اس حادثہ سے ہلنے لگ گئے، میری مراد سرسید احمد خانؒ کا رب ذوالجلال کی رحمت کی طرف انتقال ہے، یہ حادثہ بروز اتوار ۲۷ / مارچ کو پیش آیا، ہماری جمعیت بکھر گئی اور میں کچھ دیر تو بالکل ناکارہ بے حواس ہو رہا۔ والسلام شبلی نعمانیؒ ۲۹ / مارچ ۱۸۹۸ء۔'' (مکاتیب شبلی)

یہ اس خط کے عربی الفاظ ہیں، راقم یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ آیا چند مشترکہ مصالح کے پیش نظر یہ دینی مداہنت تھی یا پھر ان دونوں شخصیات کی ارواح کی آپس میں مناسبت تھی اور فہم ودانائی میں دونوں کے مقاصد کا اشتراک تھا کہ ان کے علم کو یہاں تک رسائی حاصل ہوئی۔

ان تمام باتوں کی وضاحت اعلانیہ طور پر اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ کافر سے چشم پوشی برتنا بھی دین نہیں ہے، جس طرح اَب مسلمان کو کافر گردانا دین نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں لوگ دو بالکل مخالف اطراف میں چلے ہیں: بعضوں نے افراط کیا ہے اور بعضوں نے تفریط۔ جس کی وضاحت ہمارے حضرت علامۃ العصر مولانا شاہ محمد انور کشمیریؒ نے ''إکفار الملحدین'' میں بیان فرمائی ہے، بلکہ درحقیقت کافر سے چشم پوشی، تکفیر مسلم سے زیادہ اسلام کے لئے ضرر رساں ہے، لیکن چونکہ یہ مقام اس مسئلہ کی تفصیلات کا متحمل نہیں، اس لئے ہم ان تفصیلات سے اعراض کرتے ہیں۔

بہر حال اس مذکورہ مکتوب کو خوب پڑھئے۔ اگر سرسید احمد خان جیسا شخص ملت اسلامی کے ارکان میں سے شمار کیا جاوے گا تو ملت اسلامی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ حالانکہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس نے ملت اسلامیہ کے بنیادی ارکان میں سے کسی بھی رکن کو متزلزل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اگرچہ وہ اس کی ناکام ونامراد کوششوں سے متزلزل نہیں ہو سکتے؟؟

لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ ایک شخص قرآن اور دین اسلامی کی تحریف کرتا ہے اور

دین کو ایک امر عقلی گردانتا ہے، برطانوی سامراج کے جال کو مضبوط کرنے کے لئے ان کی امداد واعانت میں کوشاں ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ، نیز وطن اور باشندگانِ وطن کے ساتھ خیانت، ملعون حکومت کی مساعدت ومعاونت کر کے بددیانتی کا مرتکب ہوتا ہے، پھر بھی اس کو ملت اسلامی کا ستون کہا جائے؟ اگر ملت اسلامی وہ ہے جو اس زندیق نے بیان کی ہے تو ایسی گمراہ وباطل ملت سے میں خداوند کریم کے حضور میں برأت کا اعلان کرتا ہوں۔

افسوس صد افسوس! ان لوگوں کے حال پر جن کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جاتا ہے، یہ ان لوگوں کے ظاہری وباطنی عیوب ہیں اور یہ ان کے ظاہر وباطن میں فرق ہے، انہی فاضل مؤرخ علامہ شبلیؒ ہی کو لے لیجئے جنہوں نے اپنی کتابوں میں ایسے مسائل واصول ذکر کئے ہیں، جن کو ایک ایسا شخص جو خود خدا اور رسول پر ایمان رکھتا ہو اور اس کا دل اس ایمان سے ٹھنڈا اور پُر سکون ہو، نیز خدائے پاک نے اس کے سینے کو اسلامی تعلیمات کے فہم کے واسطے منشرح کر دیا ہو، وہ ان اصول ومسائل کو ہرگز قبول نہ کر سکے گا۔

موصوف اپنے بہت سے نظریات میں اسی ملحد سرسید کے افکار کے متبع نظر آتے ہیں، اس مؤرخ کے عذر کو قبول کرتے ہوئے آخری حد یہ ہے کہ ہم اس کو غالی معتزلی شمار کریں (ورنہ ان کا معاملہ بھی نازک اور افکار خطرناک ہیں)۔

دراصل فی زمانہ امت میں شرانگیزی اور فتنہ وفساد کا سیل رواں جاری ہے اور دینی مداہنت اور عملی نفاق کا دور دورا ہے، ہاں جو شخص خدائے پاک کے حضور سالم صحیح دل کے ساتھ حاضر ہو جائے یا جس شخص کو خداوند کریم محفوظ رکھیں، وہی شخص فوز وفلاح سے ہمکنار ہوگا۔

پھر جب اس شخص کا یہ حال ہے تو اس کے متبعین واحباب کا کیا حال ہوگا، بیشک توفیقِ خیر، تو الٰہی کارفرمائی ہے، اور سیدھی راہ کی طرف ہدایت، خداوند کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ کے متبعین علماء پر بھی تعجب ہے کہ موصوف مؤرخ نے جہاں اسلام کے اجماعی عقیدہ کی مخالفت کی ہے اور صریح احادیث کے مخالف ومقابل تاویلات فرمائی ہیں، وہ ان تمام اغلاط پر پردہ ڈالتے ہیں۔

درحقیقت انسانی ارواح جب عالم ارواح میں مختلف گروہوں کی صورت میں جمع تھیں، تب جو روحیں آپس میں مناسبت رکھتی تھیں، وہ دنیا میں بھی باطنی طور پر آپس میں متعارف رہیں اور جن ارواح میں مناسبت نہ تھی، وہ دنیا میں بھی آپس میں اوپری اور اجنبی رہیں، انہی حضرات کی طرح ان کے متبعین علماء کی بھی قرآن وحدیث اور تاریخ کے متعلق کئی ہفوات ہیں، جن پر تنبیہ ضروری ہے، لیکن اس مختصر رسالہ میں ان تمام تر تفاصیل کا بیان کر دینا ممکن نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ امت محمدیہ کو راہ راست بتلائے اور ہمیں بھی الحاد وزندقہ کی فضاء سے محفوظ فرمائے اور تمہیں بھی، اللہ واقعی اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ہمیں درست دین اسلام اور ستھری شریعت محمدی کی اتباع کرتے ہوئے دنیا سے اٹھائے اور سیدھی راہ کی ہدایت خدا کے ہاتھ میں ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلویؒ اور ان کی

تفسیر ترجمان القرآن

الخير أبقى وإن طال الزمان به
والشر أخبث ما أوعيت من زاد

ترجمہ:۔''بہتری اور اچھائی باقی رہتی ہے اگرچہ اس پر بہت زمانہ گذر جائے، اور برائی خباثت سے بھرپور رہتی ہے چاہے کتنا ہی عرصہ تم اسے توشہ میں محفوظ رکھو۔''

''ترجمان القرآن'' اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ ہے جس پر ابوالکلام احمد دہلوی کے مختصر اور مبسوط فوائد تحریر ہیں۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے متعلق اور اس میں موجود مخالف سنت واجماع امت، مباحث سے متعلق کچھ وضاحت بیان کر دوں، اس وضاحت پر مجھے بعض معاصرین کے ان تعریفی کلمات نے برانگیختہ کیا جو قاہرہ کے رسالہ "الفتح" کے عدد: ۵۶۲ میں شائع ہوئے، ان کے کلمات بجا طور پر اس محاورہ کے مصداق ہیں: "يداك اوكتا وفوك نفخ" یعنی اپنے ہاتھ سے مشکیزہ کو بند کر رہے ہو اور منہ کی پھونک سے ہوا بھر رہے ہو''، انہوں نے ایسے تعریفی

کلمات کہے جو اس تفسیر کے لائق نہیں ہیں، نیز اس تفسیر کے باطل ہفوات سے یا تو چشم پوشی کی یا پھر ان کو سمجھا ہی نہیں۔

لیکن ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم مصری علما کو دھوکے میں رکھیں اور ان کو ہندوستان کے کسی باشندے کی جھوٹی تعریف پر بھڑکائیں، اس لیے کہ اللہ اور رسول کی خاطر درست بات کرنا ہمارے لیے کسی ہندی کی جھوٹی تعریف کے بہ نسبت زیادہ اہم ہے، ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ہم مخلوق کی رضامندی کے بدلے خالق کی ناراضگی کا سودا کر بیٹھیں، خدا و رسول کی رضا کا حصول ایسے شخص کی رضا سے کہیں زیادہ اہم ہے جو کہ کسی بھی ایسی وادی میں زیادہ دیر نہیں رہتا جس کی جانب اس کا قلم اور زبان اس کی رہنمائی کرے۔

موصوف ابوالکلام کے بعض مزلات وہفوات کی جانب محض رضائے خداوندی کے حصول اور ہندی طلباء وعلماء اور عام عوام تک حق و درست اور واضح بات پہنچانے کے لیے اس سے قبل میں اپنے رسالہ "نفحة العنبر" میں بھی اشارات تحریر کر چکا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس تنقید وتبصرہ پر بعض لوگ مجھ پر طعن درازی کے لیے میری قلمی ولسانی مزاحمت کریں گے اور مجھے تعصب اور جمود کا طعنہ دیں گے، لیکن یہ سنت جاریہ تو قرآن کریم کے بارے میں بھی ہے (کہ حق گوئی کے مقابلہ میں ایک جماعت ضرور مخالفت کرتی ہے) عرب شاعر اسی مضمون کو بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہوا ہے کہ:

أ عيّرتنا ألبانها و لحومها
و ذالك عار يا ابن ريطة ظاهر

ترجمہ: کیا تو ہمیں اپنی اونٹنیوں کے دودھ اور گوشت پر بخل کرنے کی بناء پر عار دلائے گا اور ملامت کرے گا؟ اے ابن ریطہ! یہ مخالفت از خود بے حیثیت و بے قدر ہے (کیونکہ تجھ کو کیا معلوم ہم انہیں کن مصارف میں خرچ کرتے ہیں جن سے تو بے خبر ہے)۔

اسی طرح ایک دوسرے شاعر نے یوں کہا اور خوب کہا:

وعيرها الواشون إنّي أحبّها
وتلك شكاة ظاهر عنك عارها

ترجمہ:۔میرے رقیب چغل خوروں نے محبوبہ کو میری اس سے محبت کرنے پر عار دلائی (کہ یہ نکما شخص تجھ سے محبت کا دعویدار ہے) حالانکہ یہ شکوہ ہی تجھ سے اے محبوبہ! اپنی عار کو معدوم کر رہا ہے (کیونکہ مجھ جیسا عاشق لائق قدر تجھ سے محبت کرے تو یہ تیرے لئے باعث صد افتخار ومباہات ہے نہ کہ ملامت وعار کا سبب)۔

مذکورہ مقالہ نگار کہتا ہے:

''ہندی زبان میں تصنیف کردہ تفاسیر میں امام ابوالکلام کی تفسیر بھی قابل ذکر ہے، جس کے مقابل ومشابہ امام حجۃ الخلف سید رشید رضا کی تفسیر کے سوا کوئی تفسیر سارے عالم اسلام میں نہیں''۔

مجھے نہیں معلوم کہ ان کلمات سے موصوف نے جودل کی گہرائیوں سے تعریف کی کہ یہ مفسر کے نظریات وافکار سے مناسبت ہے یا پھر عصری تقاضوں کے مدنظر رکھتے ہوئے مداہنت سے کام لیا ہے۔

بہرحال کچھ بھی ہو، میں اس بارے میں کسی مصلحت وتقاضے کی رورعایت کئے بغیر کہتا ہوں کہ:

ابوالکلام آزاد دہلوی طبعی طور پر ایک جذباتی شخص تھے جوملکی وسیاسی معاملات کی خوب اطلاع رکھتے تھے، ساتھ ساتھ اردو تقریر وتحریر میں ملکہ رکھتے تھے، شاید وہ اپنے اس طرز انشاء وخطابت میں اپنے زمانے کے یکتا فرد تھے،، بلکہ انہوں نے ایک نیا اسلوب ایجاد کیا، ان کی بیس سالہ قبل کی زندگی اب کی زندگی سے قوم کے لئے زیادہ نفع بخش اور فائدہ مند تھی، برطانوی سامراج اور مخالف اسلام حکومت کے پنجے سے وطن کو حریت وآزادی دلانے میں ان کا بہت تعاون اور امداد کارفرما رہا اور اس جدوجہد اور تحریک میں حکومت کے خوف اور اس کے حملے کے خطرہ نے ان کو متاثر نہیں کیا اور ان کی اسی جدوجہد کی وجہ سے بہت سے علمائے حق نے ان کے متعلق سکوت فرمایا۔

موصوف کی ان قابل قدر مساعی اور حصول وطن کے لئے جدوجہد کی بناء پر میرے دل

میں بھی ان کی خاصی قدر و منزلت ہے، اس لئے کہ انہوں نے ہی ان تحریکات کے ابتدائی دور میں کمزور ہمت افراد کو حوصلہ اور ولولہ بخشا، اور آزادی کی خاطر جدو جہد پر خوابیدہ عوام وخواص کو اپنے رسالے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے اجراء سے خواب غفلت سے بیدار کیا، اسی طرح سیاسی مجالس میں اپنے جاذب قلب تقاریر سے غفلت کوشوں کو جگایا۔

ان تمام خصوصیات کے باوجود موصوف کی طبیعت میں اپنی آراء وافکار کے متعلق اعجابی کیفیت بہر حال پائی جاتی تھی جس کی بناء پر وہ کئی علمائے حقہ بلکہ ان اکابر ملت پر جو ان کی آراء کی مخالفت کیا کرتے تھے خوب تنقید کرتے، اسی وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ ان میں کسی قدر اپنی خواہشات آمیز افکار ونظریات پر گھمنڈ اور خود رائی کی کیفیت ہے بلکہ بعض مواضع میں آپ موصوف کو درست مسلک ومذہب اور ستھرے عقائد وعلوم سے نکلتا ہوا محسوس کریں گے۔

ابتدائی طور پر جہاں تک ہماری معلومات تھیں، وہ صحیح العقیدہ شخص تھے مختلف رسائل واخبارات میں شائع شدہ مقالات ومضامین بھی ان کے صحیح العقیدہ ہونے کی ترجمانی کرتے ہیں، لیکن فروعی مسائل میں وہ کسی کے مقلد نہ تھے، جیسا کہ قاضی شوکانیؒ اور نواب صدیق حسن خان صاحبؒ اور دیگر اہل حدیث حضرات ائمہ کرام کی تقلید نہیں کیا کرتے تھے، لیکن اسی عدم تقلید پر بس نہیں بلکہ علمائے احناف، خصوصاً امام الائمہ امام ابوحنیفہؒ پر بھی انہوں نے اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں خوب ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے، اکابر امت کے حق میں خوب بدتمیزی کی ہے اور اس بات کی سعی کی ہے کہ ہندوستان میں وہ ایسے امام بن جائیں، جن کی امامت پر اتفاق ہو، اور مسلمانوں کے دین ودنیا کے امیر بن جائیں، اور ان کے امام الہند ہونے پر علماء کا اتفاق رائے ہوجائے، لیکن ہندوستان میں تو بہت سے صحیح علم ودانش اور تقویٰ ودیانت کے حامل علمائے امت تھے اور جیسا کہ راقم نے عرض کیا کہ: دینی معاملات میں گویا وہ بے مہر وبے لگام تھے، جب کہ علم وعمل میں اکابر ہند سے کوسوں دور تھے۔

چنانچہ علمائے دیوبند نے اس موقع پر بھی جرأت واستقلال کے ساتھ حق کو بے باکی سے بیان کیا اور اعلان کردیا کہ موصوف اس امامت کے جس کے وہ دعویدار ہیں ہرگز حقدار نہیں

ہیں، اس لئے کہ علمائے دیوبند نے اپنی فراست صحیحہ سے قبل از وقت ہی ان مفاسد کو پرکھ لیا تھا، جو ان کی امامت کو تسلیم کر لینے میں آئندہ پیش آسکتے تھے، جن کی بعد ازاں روک تھام نہایت مشکل تھی، چنانچہ ابوالکلام آزاد جو خواہش اور تمنا رکھتے تھے، اس کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکے۔

خلاصہ یہ کہ انہی افکار و نظریات کے متعلق موصوف جدو جہد کر رہے تھے، دریں اثناء انہوں نے اعلان کیا کہ وہ تفسیر لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، جس کی بنا پر اس تفسیر کی جانب گردنیں اٹھنے لگیں اور لوگ اس تفسیر کا اسی شدت سے انتظار کرنے لگے، جیسا کہ ایک پیاسے شخص کو ٹھنڈے میٹھے شفاف پانی کی طلب و انتظار رہتا ہے، چنانچہ ایک دو کتابیں تفسیر کے متعلق شائع ہوئیں، پھر صرف ان کا ترجمہ قرآن جس پر چند مختصر و مفصل فوائد درج کیے گئے تھے، شائع ہوئی جس کا نام موصوف نے ''ترجمان القرآن'' تجویز فرمایا۔

سورۂ فاتحہ کے متعلق ان کی تفسیر خوب مفصل و مبسوط شائع ہوئی، میں نے بھی اس کو خوب شوق سے لیا اور پڑھنا شروع کیا اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر مکمل پڑھی اور پھر مختلف آیات کی تفسیر دیکھی، تب اس شدت اشتیاق کی لو جو میرے دل میں جل رہی تھی وہ بجھ گئی اور میں انگشت بدنداں رہ گیا اور افسوس کرتا یہ سوچنے لگا کہ اگر یہ تفسیر نہ طبع ہوتی تو زیادہ بہتر تھا، اس لئے کہ اس کے مطالعے سے قبل ان کی قدر منزلت میرے قلب میں جاگزیں تھی، اس مطالعہ سے میں نے بھانپ لیا کہ خواہشات اور محض عقل کی کارفرمائی ان کو مختلف وادیوں میں لے گئی ہے اور اس اوہام پرستی نے موصوف کو کہیں کا نہیں چھوڑا، اور میں نے جانچ لیا کہ اس خودرائی اور اعجاب نے موصوف کو تقلید سے بے بہرہ کیا اور اخیراً صراط مستقیم سے ورے ورے شاہراہ باطل پر گامزن کر دیا۔

و کل یدّعی حبّا بلیلی
و لیلی لا تقرّ لھم بذاکا

ترجمہ: ہر شخص لیلیٰ کی محبت کا دعویدار ہے، لیکن لیلیٰ ان کے لیے محبت کا اقرار نہیں کرتی۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تفسیر کے
چند قابل گرفت مضامین

سورۂ فاتحہ کی آیت: ﴿اهدنا الصّراط المستقيم﴾ کی تفسیر میں موصوف اپنی تحقیقات یوں واشگاف کرتے ہیں:

''دنیا میں رائج مختلف مذاہب و ادیان، چاہے نصرانیت ہو، یہودیت ہو یا صائبیت، اگر کوئی شخص اسی ہیئت پر اس دین کی تعلیمات پر عمل پیرا رہے جو ہیئت اس دین کے لانے والے نبی بتلا کر گئے ہیں تو یہ عمل روز قیامت اس کی نجات کے لئے کافی ہوگا۔ اس لئے کہ ان تمام ادیان کی اصل واساس ایک ہی ہے اور وہ خداوند پر ایمان اور اعمال صالحہ ہیں، ہر دین کے شارع نبی توحید لے کر مبعوث ہوئے اور اعمال صالحہ کی راہنمائی کی۔ بعد ازاں شرک اور برے اعمال کی آمیزش، پیروکاران ملت کی تفرقہ بازی اور تشتت افکار سے پیدا ہوئی''۔

اپنے اس نظریہ کو موصوف بار بار اپنی تفسیر میں مختلف عنوانات وعبارات کے تحت لاتے ہیں اور اس پر خوب جرأت و استقلال دکھلاتے ہوئے متفرق اسالیب سے اپنے موقف کو درست باور کراتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

''قرآن بھی اسی نظریہ و موقف کا بر روز اعلان کرتا ہے''

مزید برآں موصوف یہ خیال کرتے ہیں کہ جو بات ان کی سمجھ میں آئی ہے وہی قرآن کا مقصود و مطلوب ہے۔ اپنے اس موقف کی تائید کے لئے قرآن پاک کی درج ذیل آیت بطور استدلال پیش کرتے ہیں:

﴿إنّ الذين آمنوا والذين هادوا والنّصارىٰ والصّابئين من آمن بالله واليوم الآخر وعمل صالحًا فلهم أجرهم عند ربّهم ولا خوف عليهم ولا هم يحزنون﴾

اعمال صالحہ ان کے نزدیک احکام تکلیفیہ میں سے ہی نہیں اور نہ شریعتِ اسلامی میں

کوئی قدر ومنزلت رکھتے ہیں' بلکہ موصوف کے نزدیک ان اعمال صالحہ پر کسی جزاء کا مدار ہی نہیں ہے۔ایک مقام پر یوں گویا ہیں:

''یہ عبادات اور مشروع اعمال تو محض ظاہر داری کی رسمیں ہیں اور گویا صورتیں اور اجسام ہیں، نہ ان اعمال کو حقیقتِ دین سے کوئی تعلق ہے، نہ دین کی روح سے کچھ رشتہ''۔

معلوم ہوا کہ ان اعمال مشروعہ اور احکام عبادت کا اگر کوئی شخص اعتقادی طور پر بھی منکر ہو تو بھی وہ ضرور مسلم ہی شمار ہوگا۔آیت: ﴿إنّ الدين عند الله الإسلام﴾ اور آیت: ﴿ومن يبتغ غير الإسلام دينا فلن يقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرين﴾ کے ذیل میں یوں فرماتے ہیں کہ:

''اسلام' عمومی دینی اتحاد کا نام ہے اور کسی خاص شریعت کے ساتھ اسلام خاص نہیں، اس لئے کہ یہ تمام ملل وادیان اسی اتحاد و یگانگت کے داعی اور مکمل سچائی کی طرف بلاتے ہیں، اس دعوت میں تمام ادیان برابر ہیں''۔

یعنی موصوف کے نزدیک ملتِ اسلامیہ مخصوص اعتقادات وعبادات کی حامل جماعت نہیں ہے، اور محترم تحریر کرتے ہیں:

''اب جو ظاہری رسوم وعبادات کا ان شرائع ومذاہب میں اختلاف پایا جاتا ہے اور عبادت کے ظاہری طرز وطریق میں یہ فرق جو عیاں نظر آتا ہے، اس سے تو چھٹکارا حاصل نہیں ہوسکتا ہے، چنانچہ یہ اختلاف کوئی اوپری چیز نہیں ہے اور نہ کسی ملامت کا مستحق ہے۔لہذا اپنے تنگ سینوں کو اس فرق واختلاف کے لئے کشادہ رکھو اور جو تنگی وممانعت تم لوگوں نے گڑھ رکھی ہے، اس کو چھوڑ دو''۔

آج جبکہ دین اسلام اپنی مکمل آب وتاب کے ساتھ پھیل چکا ہے اور مزید پھیل رہا

ہے اگر ایک شخص موسوی شریعت کا اتباع کرتا ہے، اس کے مطابق حلال کو حلال اور حرام کو حرام ٹھہراتا ہے، موصوف کے وضع کردہ اصول کے مطابق وہ بھی نجات دہندہ مسلمان شمار ہوگا۔ انہی افکار کے مانند دیگر کئی ایسے نظریات ہیں جنہیں موصوف نے خوب مزین کر کے اپنے تعجب خیز طرز تحریر وانشاء سے چمکا دمکا کر پیش کیا ہے اور بمطابق محاورے :" وغر الناس بخضراء دمنته" (اپنے کوزے کو سبز دکھلا کر لوگوں کو دھوکہ دیا) کے خوب بے باکی اور بے خوفی سے ان نظریات کو بیان تو کیا لیکن اس کے درے ورے ان کی تفصیلات سے ان کا پیمانہ علم بھی خالی ہے اور ان نظریات کے متعلق چیں وچنیں کی تو خوب آواز آتی ہے، لیکن سب کے سب غبار بے قدر کے مانند ہے۔

مذکورہ بالا ابحاث جو میں نے عربی میں نقل کیں، یہ ان کی تحریر کردہ صریح عبارت کا خلاصہ وماحصل ہے، جن میں کسی طرح تاویل نہیں کی جاسکتی، سوائے اس کے کہ صریح اور ستھری عبارات کی غیر مناسب تاویلات کی جائیں۔ حالانکہ ان نظریات کو ایسی صریح عبارات سے موصوف نے بیان کیا ہے کہ یہ افکار روز روشن میں واضح نظر آنے والے شگاف کی طرف واضح ہو چکے ہیں اور بقول کسے :" ولم یترك لشفرة محزا" (چھری رکھنے کے واسطے کوئی جگہ ہی خالی نہ چھوڑی) اور فطری قانون ہے کہ صریح باتوں میں تاویلات کی گنجائش ہی نہیں ہوا کرتی ہے اور کیا ایسا فصیح شخص جو اپنے اغراض ومقاصد کو فصیح وبلیغ انداز میں بلاکم وکاست ایسی عبارات کی مدد سے کہ ان عبارات میں کسی قدر غموض واخفاء یا لکنت وقلق باقی نہ رہے، بیان کر دینے پر قادر ہو، ایسے شخص کا قلم اپنی غرض کو درست بیان کر دینے سے قاصر رہے۔ اور وہ کیونکر ایسی تعبیرات استعمال کریگا جن سے ان کے متبادر معنیٰ اس نے خود مراد نہ لئے ہوں؟ اور سیاق وسباق اور کلام کی کیفیات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو معنی دیکھنے والے کی فکر میں پیدا ہوتا ہے، اس معنی ومراد سے یہ شخص اس دیکھنے والے کی فکر کی تبدیلی کا محتاج ہو؟ اور اگر ان تاویلات کو راہ دی جائے تو کیا تاویلات معترض کو شافی وکافی جواب مہیا کر سکیں گی؟ اور وہ مزید قیل وقال سے مستغنی کر دیں گی؟

موصوف کہتے ہیں:

''اسلام تمام اہلِ ادیان کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ اپنے
حقیقی دین کو ان باطل اعمال اور خواہشات کی اتباع میں وضع کردہ ان
احکام سے صاف ستھرا اور پاک کردیں اور اپنے اسی دین کی بنیادی
تعلیمات سے بہرہ ور ہوں، اسلام ان سے یہ تقاضا کرتا ہی نہیں کہ وہ
اپنے ادیان ومذاہب کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرلیں''۔

انہی تلبیسات وتدلیسات کے مانند دیگر کئی ایسی قابلِ گرفت نظریات موصوف نے اختیار کیے ہیں جو ہلاکت کے گڑھے میں پہنچانے والے اور دینی تباہی وبربادی کے منتہیٰ تک لے جانے والے ہیں۔

ألا تسئلان المرأ ما ذا يحاول
أ نحب فيقضى أم ضلال و باطل
وكل امرئ يوما سيعلم حاله
إذا كشفت عند الإله الحضائل

ترجمہ:۔''خبردار! اے دو مخاطبوں! کیا اس شخص سے تم نے پوچھ لیا کہ کیا چاہتا ہے؟ اگر چیخ وپکار چاہتا ہے تو کرلے یا پھر محض گمراہی اور باطل بات کا دعویدار ہے۔ایک نہ ایک دن ہر شخص اپنے حال سے باخبر ہوجائے گا، جب خداوند کریم کے دربار میں باطنی خصائل وطبائع ظاہر کردیئے جائیں گے''۔

رسالہ ''المعارف'' کی کمیٹی نے موصوف کی اس تفسیر پر ردوتبصرہ کا ایک مفصل مضمون شائع کیا تھا اور وہ ''ترجمان القرآن'' میں کیے گئے موصوف کے بعض آیات کے ترجمے لے کر، بیس سال قبل رسالہ ''الہلال'' میں کیے گئے انہی آیات کے ترجمہ کا تقابل دکھلایا گیا تھا اور ان میں فرق واختلاف کی نشاندہی نمایاں طور پر تحریر کی گئی تھی۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا یہ تفسیر ایسی ہے جس تفسیر کے مساوی ومقابل سارے عالم میں کوئی تفسیر نہیں ہے؟ بلکہ ہاں! درست فرمایا: کوئی تفسیر اس تفسیر کے متقابل ومساوی نہیں ہوسکتی ہے۔

ایسے اختراع کردہ نظریات وافکار پر مشتمل ہونے میں اس تفسیر کے مساوی واقعی عالم

اسلام میں کوئی تفسیر ہے ہی نہیں جن کی صحت کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے اور جس میں ایسی قابل گرفت آراء ہوں جن پر کوئی برہان وسلطان نہ قائم کیا جاسکے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ رسالہ ''الفتح'' کے مذکورہ مقالہ نگار جنہوں نے محترم مذکور کی تفسیر کی اس قدر تعریف فرمائی اور خوب مبالغہ آرائی برتی وہ رسالہ "المعارف" کی کمیٹی کے ارکان کے رفقاء ومعاونین میں سے ہیں اور ان کو ضرور رسالہ "المعارف" کے اس مضمون کے متعلق بھی خوب معلوم ہوگا، اس کے باوجود بھی یہ تمام تعریفات کیسے کر گئے؟ معاملہ بڑا ہی سخت اور نازک ہے، چھری ذبح میں ہڈی تک پہنچ گئی ہے، آج کوئی بچانے والا نہیں، سوائے اس کے جس پر خدائے پاک رحم فرمادیں وہ تو بچ سکتا ہے، وگرنہ معاملہ خطرناک ہے۔

میں نے جو چند باتیں ان کی تفسیر سے ذکر کیں، یہ محترم کے وہ اصول وقواعد ہیں جن پر ان کی اس تفسیر کی اساس اور بنیاد ہے۔

علاوہ ازیں آیات کو اپنے منشا ومقصد سے اپنی خواہش کے مطابق اختراعی منشا کی طرف پھیر دینا اور ان آیات میں ایسے ذرائع بروئے کار لاکر تشریح وتفسیر کرنا جو خداوند کو نہ محبوب ہیں، نہ ان سے خداوند راضی ہیں اور نہ اس کے متعلق صاحب وحی سے کوئی تائید منقول ہو، اور نہ اول مخاطبین صحابہ کرامؓ سے مروی کوئی توجیہ پیش کی جاسکے، بلکہ موصوف کی پیش کردہ تاویل کے مخالف کوئی تاویل منقول ہو، اس قسم کے بہت سے مواضع ان کی تفسیر کا حصہ ہیں، جن کی تمام تر تفصیلات اس مقام پر بیان کرنا ممکن ہے اور نہ اس رسالہ میں ان پر ردوقدح کی گنجائش۔ لہذا بعض غفلت خوردہ اشخاص کو بیدار کرنے کے لئے اور دھوکہ میں مبتلا افراد کو تنبیہ کے واسطے ہم بعض آیات کی بیان کردہ ان کی تفسیر مختصر ردوقدح کے ساتھ ذیل میں ذکر کئے دیتے ہیں:

''کونوا قردۃً خاسئین'' کے ذیل میں فرماتے ہیں:

> '' مطلب یوں ہے کہ ''ہوجاؤ ذلت خوردہ، کمتر، مانند بندر کے، انسانیت کے رتبے سے گرے ہوئے تا آنکہ مروت اور انسانیت کی علامات میں سے کچھ بھی تم میں پائی جاویں۔''

صفحہ:۲۶۱ پر "فقال لهم الله موتوا" کے تحت یوں رقم فرماتے ہیں:

"یعنی تمہاری بزدلی کی وجہ سے تو تم مرنے ہی کے لائق ہو یعنی تم پر دشمن غلبہ پالے گا اور تم اپنے دشمن پر فتح اور ظفر یابی کی زندگی نہ پاسکو گے۔"

"ثم أحياهم" یعنی پھر خدائے پاک نے ان میں عزم واستقلال کی روح بپافرمائی کہ قتال کے لئے آمادہ ہوگئے، جس کی بناء پر ان کو دشمن پر مدد اور ظفر یابی عطا ہوئی۔"

صفحہ:۲۶۹ آیت "أو كالذى مرّ على قرية" اس آیت کے بھی ظاہری معنی سے خوب کاٹ چھانٹ کرنا چاہی، لیکن موصوف اس آیت کے سوائے ایک لفظ کے بقیہ تمام الفاظ کو ظاہری معانی ومفاہیم کے مطابق برقرار رکھنے پر مجبور ہو گئے۔

"فخذ اربعة من الطير" اس آیت کی تفسیر ابومسلم اصفہانی معتزلی کی تفسیر کے مطابق فرمائی، ابومسلم اصفہانی معتزلی کی اس تفسیر کو جو جمہور کے خلاف تھی امام رازیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں نقل فرمایا ہے، مزید برآں مولانا ابوالکلام صاحب نے اس تفسیر کے منہیہ میں جمہور کے قول کی خوب تردید وتنقید بھی کی ہے، ملاحظہ ہو: ص:۲۷۰ تا ۲۷۱۔

"ورفعنا فوقهم الطور" ص:۲۰۰، اس آیت کے بھی معنی میں موصوف تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں، ان کے علاوہ دیگر کئی آیات کی ایسی باطل تاویلات ذکر کی ہیں جو اہل سنت والجماعت اور اکابرین امت کی رائے کے صریح مخالف ہیں۔ ان کی تفسیر کا کل سرمایہ بھی یہ کمزور، بے ڈھنگ، بے ہنگم تاویلات ہیں جن کی آیات میں ذرہ بھر گنجائش نہیں ہے۔

موصوف کا خصوصی دطیرہ یہ رہا ہے کہ مختلف آیات کی تفسیر میں انہوں نے احادیث وآثار کی مراجعت نہیں فرمائی ہے، بلکہ یونانی اور فرانسیسی مورخین کی مختلف تواریخ پر چاہے ان کا مدار محض تخمینی وقیاسی آراء وافکار ہی ہوں، معاملہ کی بنیاد رکھی ہے، اور بہتیرے ان مقامات کے متعلق قوی الاسناد احادیث جو ان تاریخی روایات اوران قدیم کتبوں سے جن پر کوئی دلیل صحت

دثبوت نہیں ہے، کہیں اونچا مرتبہ ومقام رکھتی ہیں۔موجود ہوتی ہیں تب بھی ان سے صرف نظر فرمایا ہے، ایسے ہی لوگوں کے متعلق باری جل شانہ کا فرمان مقدس ہے کہ: "ماهم بذالك من علم إن هم إلّا يخرصون"

اسی طرح یہ بھی ان کا خصوصی طرز رہا ہے کہ جب بھی کسی تاویل کے متعلق موصوف کوئی رائے قائم فرمالیتے ہیں تو اس کو امر قطعی شمار کرتے ہیں، جس کے مقابل نہ ان کے نزدیک حدیث مرفوع کی کوئی حیثیت ہے، نہ اثر صحیح کی اور نہ ہی درست فکر وتدبر سے حاصل شدہ نتیجہ اس کے بالمقابل کوئی مقام رکھتا ہے۔

یہ بھی ان کا خاص طریق رہا ہے کہ کسی آیت کے متعلق کمزور قول کی مفسرین کی طرف نسبت فرمادیتے ہیں، حالانکہ اس کے علاوہ دیگر کئی صحیح اقوال موجود ہوتے ہیں، پھر اس ضعیف قول پر رد فرماتے ہیں اور ان مفسرین ہی کے اقوال میں سے کوئی قول ذکر فرما کر یہ باور کراتے ہیں کہ یہ ان کا اختراع کردہ ہے اور وہی اس کے اول پیش کرنے والے ہیں جبکہ تمام مفسرین کو اس کے متعلق کچھ خبر نہ تھی اور کبھی کبھی ان مفسرین پر تمسخرانہ طنز بھی فرمادیتے ہیں، اپنے تمام طرز وطریق میں وہ عرب شاعر کے اس شعر کی مجسم تصویر ہیں کہ:

نزلوا بمكة فى قبائل نوفل
ونزلت بالبيداء أبعد منزل

ترجمہ: مخالفین مکہ میں قبائل نوفل کے ہاں پناہ گزیں ہو گئے اور میں میدان میں ان سے کہیں دور مقام پر اترا ہوں۔

یہ مفسر کا طور طریق رہا ہے، ان کی تفسیر "ترجمان القرآن" میں!!

وذى خطل فى القول يحسب أنه
مصيب فيما يلمم به فهو قائله

ترجمہ: لغو اور مہمل باتیں کرنے والا اپنے آپ کو درست خیال کرتا ہے، اسی بناء پر جو خیال اس کے دل میں اترتا ہے، اسکو کہہ ڈالتا ہے۔

بعض اردو رسائل میں ان کا یہ مضمون شائع ہوا، جس میں موصوف نے برملا یہ اعلان کیا

ہے کہ:

''وہ امور واحکام جن پر نجات اخروی کا دار ومدار ہے جس طرح نماز کے باب میں "أقیموا الصلوٰۃ" کو مصرح بیان فرمایا گیا ہے، ان امور واحکام کو بھی اسی تصریح کے ساتھ بیان کیا جانا چاہئے تھا، بلکہ اس سے بڑھ کر تصریح فرمانی چاہئے تھی اور یہ ضروری تھا کہ قرآن ہی میں ان پر ایمان وتصدیق کی تصریح کی جانی چاہئے تھی، چنانچہ وہ امور جن پر نجات اخروی کا دار ومدار نہیں ہے، وہ اگرچہ ان میں مذکور ہیں اور قرآن نے ان سے بھرپور تعرض کیا ہے، لیکن وہ عقائد کے زمرہ میں داخل نہیں ہیں، تب ان کا قبول کرنا اور ان کے متعلق عقیدہ رکھنا، کسی شخص پر ضروری نہیں ہے''۔

اسی طرح یوں رقمطراز ہیں:

''میرے اعتقاد کے متعلق تو حضرت مسیح ابن مریم کا قرب قیامت کے زمانہ میں نزول بھی نہ ہوگا۔''

اس پر میں نے موصوف کو لکھ بھیجا کہ ہم یہ عقیدہ کیسے اپنا سکتے ہیں، اس لئے کہ نزول مسیح کے متعلق کئی صحیح متواتر احادیث موجود ہیں، آپ اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ تو یوں جواب دینے لگے:

''ان کے نزول کا ذکر تو علاماتِ قیامت میں سے شمار کیا گیا ہے، اس لئے ان کا یہ نزول عقائد میں سے شمار نہیں ہوگا۔''

وائے تعجب! جن احکامات ومسائل کو ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ لے کر آئے، ان تمام کی تصدیق کرنا عقائد میں سے نہیں ہے؟ جب حضور پاک ﷺ نے ایک بات ارشاد فرمائی اور اس کے وقوع کی خبر دی پھر اس حدیث کی سند صحت اور اس کا اتصال ثابت ہو گیا اور مشرق ومغرب میں وہ حدیث تواتر کے ساتھ نقل کی جانے لگی، اس کے بعد بھی اس بات پر

ایمان لانے اور اس کی تصدیق کرنے کے لئے کیا کسی اور چیز کا انتظار کیا جاسکتا ہے؟ کہ ہمیں نبی کریم ﷺ یوں صریح حکم ارشاد فرمائیں کہ عیسیٰ ابن مریم کے نزول پر ایمان لاؤ، یہی نہیں، موصوف کے نزدیک یہ تصریح نہ صرف حدیث میں ضروری ہے' بلکہ قرآن میں بھی یوں تصریح کی جانی چاہئے کہ عیسیٰ ابن مریم کے نزول پر ایمان لے آؤ! کیا حضور پاک ﷺ کا یہ پاک ارشاد "و کیف أنتم إذا نزل فیکم ابن مریم" یعنی تمہاری کیا حالت ہوگی جبکہ عیسیٰ ابن مریم تمہارے درمیان اتریں گے؟ کافی نہیں ہے؟! کیا اتنی صراحت سے بھی بڑھ کر صراحت ہوسکتی ہے؟ اور واقعی اس سے بڑھ کر تصریح کیا ہوگی؟ اس تصریح کے ساتھ ساتھ اس کا تواتر معنوی ایسا معروف ہے کہ جیسا سورج کا طلوع ہونا زحل سیارے کی رفعت سے مستغنی کردیتا ہے، اگر موصوف کے وضع کردہ اس کلیہ کہ:

> "وہ حکم جس کو صراحتاً عقائد میں شمار کیا گیا ہوگا، اس کا عقیدہ رکھنا تو ضروری ہے، وگرنہ دیگر احکام جو صراحتاً عقائد میں شمار نہ کئے گئے ہوں گے، ان کا عقیدہ رکھنا بھی کسی شخص پر ضروری نہ ہوگا"

کو اگر تسلیم کرلیا جائے تو پانچ نمازوں کا ذکر صراحتاً کہاں وارد ہوا ہے؟
اسی طرح مقادیر زکوٰۃ' کفارہ صوم کے مسائل کہاں صراحتاً ارشاد فرمائے گئے ہیں؟
اسی طرح دیگر کئی احکام جن کا احصاء بھی دشوار ہے، وہ کہاں صراحتاً ذکر کئے گئے ہیں،
اب کیا ان امور کی فرضیت کا اعتقاد رکھنا ان امور میں سے شمار نہ ہوگا جن پر نجات اخروی کا دار و مدار ہے؟ کیا ایسا شخص کافر نہ ٹھہرے گا جو ان امور کی فرضیت کا انکار کرے؟ ہمارے شیخ حضرت امام العصرؒ اپنے رسالہ "إکفار الملحدین فی ضروریات الدین" میں فرماتے ہیں:

> "جب اتنی بات جان لی گئی تب ہم کہتے ہیں کہ: نماز ایک فریضہ ہے، اس کی فرضیت کا اعتقاد بھی فرض ہے اور اس کا جاننا، سیکھنا بھی فرض ہے اور اس کا انکار کفر ہے۔ اسی طرح اس سے بے خبر رہنا اور نہ جاننا اور نہ سیکھنا کفر ہے۔ اسی طرح مسواک کرنا سنت، اور اس کی سنیت

کا اعتقاد فرض اور اس کا جاننا، سیکھنا بھی سنت ہے، اور اس کا انکار کفر ہے،
اس سے بے خبری محرومی ہے اور اس کا ترک کرنا خدائے پاک کا عتاب
ہے یا پھر خدائے پاک کی جانب سے دنیوی عقوبت۔''

باوجود اس کے کہ اس رسالہ کے شروع ہی سے میں تفصیل واطناب سے کام نہیں لے رہا تھا، اس مقام پر میں نے خوب تفصیل کی، یہ صرف اس وجہ سے کہ موصوف کی تفسیر میں مجھے اس قسم کے واضح داغ اور خوب دھوکہ وفریب نظر آیا اور میں اس قسم کے اعتراضات سے چشم پوشی اور تسامح بڑی بددیانتی سمجھتا ہوں، اس لئے کہ الحاد وزندقہ کی زہریلی ہوائیں اس وقت سارے ہند میں چل رہی ہیں اور اس قطعۂ زمین کو ان مہلک ہواؤں نے خوب بھر دیا ہے اور قرآن کے سمجھنے کا دار ومدار ایسی تفاسیر پر رکھا جانے لگا، جن میں عصری تقاضوں کے مطابق لچکدار تعبیرات ہوں۔ ان مہلک عقائد ونظریات سے صرف وہی شخص بچ سکتا ہے جس کو خداوند کریم صحیح فہم عطا فرمائیں یا وہ شخص جن کا نفس ان بزرگانِ دین کی صحبت میں پاک سے پاک تر ہوتا چلا گیا ہو جن کی صحبت میں قلوب کی حیرت انگیز اصلاح ہوتی ہے۔ چنانچہ ان تمام شرائع واحکامات پر جنہیں حضور اکرم ﷺ لے کر آئے اس کا سینہ ٹھنڈا اور دل مطمئن رہتا ہے اور ان احکامات میں وہ اپنی کمزور رائے سے رائے زنی نہیں کرتا۔

پنجاب کے ایک اہل حدیث عالم محترم ابراہیم سیالکوٹی نے اس ''ترجمان القرآن'' کے رد میں ایک تفسیر تالیف فرمانا شروع کی تھی اور اس کی ایک جلد بھی طبع ہو چکی ہے، لیکن میں اب تک اس کا مطالعہ نہیں کر سکا ہوں، میرا خیال ہے کہ فاضل مذکور نے اپنے اس رد میں خوب سیر حاصل ابحاث تحریر کی ہوں گی، کاش! کہ ابوالکلام صحیح علم رکھتے اور دین محمدی کے صحیح چاہنے والے ہوتے تو کچھ بعید نہ تھا کہ ان کو دور حاضر کی ان عظیم ہستیوں میں شمار کیا جاتا جن کے ذریعے فخر کیا جاتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی خوب قدر ومنزلت ہوتی۔ لیکن دین کی محبت مومن کے دل میں ابوالکلام کی محبت سے کہیں زیادہ جگہ رکھتی ہے، چنانچہ ضروری ہے کہ شریعت اسلامیہ کو ان ناپاک نظریات کی خلط سے محفوظ کر دیا جائے جو قابل قدر بصیرت رکھنے والے اشخاص جنہیں

درست علم کے ساتھ ساتھ عقول سلیمہ سے بھی سرفراز فرمایا گیا ہے کی بصیرت انگیز نظروں میں شریعت کی ساکھ کو کمزور اور اس کی قدر و منزلت کو گھٹاتے ہیں۔اللہ رب العزت ساری امت کو درستگی کی ہدایت نصیب فرمائے اور شاہراہ مستقیم پر گامزن فرمائے۔

عنایت اللہ مشرقی اور ان کی

تفسیر ''التذکرۃ''

انہی باطل پرستوں کی تفاسیر میں سے ایک تفسیر عنایت اللہ مشرقی امرتسری کی بھی ہے، جس کا نام موصوف نے "التذکرۃ" رکھا ہے، اس شخص کے احوال تو اونچے پہاڑ پر جلتی آگ سے بھی زیادہ واضح ہیں، یہ شخص اس سرسید احمد خان کے راستے پر گامزن ہے، جس کا مختصر تذکرہ اصول اسلام کے منہدم کرنے کے بیان میں گذرا ہے، موصوف کی رائے مکمل طور پر سرسید دہلوی کے وضع کردہ باطل اصول کے موافق تھی، جب ان کی تفسیر "التذکرۃ" شائع ہوئی اور علمائے حق نے اس کو دیکھا تو بالاجماع ان کے کفر کا فتویٰ دیا، اہل حق علماء میں سے کوئی بھی اس فتویٰ کی تائید میں پیچھے نہیں رہا، اس ملحد نے تو سرسید سے بھی زیادہ باطل نظریات قائم کئے، کہتے ہیں کہ:

> ''اسلام اور صراط مستقیم تو یہ ہے کہ خدائے پاک کی کائنات میں ان بکھری نعمتوں سے نفع مند ہوا جائے جو شخص ان نعمتوں سے متنفع ہوا، وہ مسلمان ہے اور جو ان نعمتوں سے محروم رہا، وہ کافر ہے''۔

اصحاب الجنۃ اور اصحاب النعیم (جنت والے اور نعمتوں میں رہنے والوں) کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ:

> ''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو یہود و نصاریٰ کہتے ہیں''۔

اور اس کے بالمقابل اصحاب النار و اصحاب الجحیم (دوزخ والوں) کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ:

> ''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں''۔

ان باتوں پر استدلال وہ اس آیت سے کرتے ہیں: ﴿إنّ الأرض یرثها عبادي الصالحون﴾ لکھتے ہیں کہ:

''اہل حکومت وسلطنت نصاریٰ ہیں اور وہ نیکوکار ہیں، اس لئے کہ زمین کی وراثت وسلطنت انہی لوگوں کہ قبضہ میں ہے''۔

اس ملحد وزندیق کے نزدیک پل صراط، حساب وکتاب، حشر ومعاد، جنت ودوزخ کسی چیز کا کوئی تصور نہیں، بلکہ الٹا جنت، اس کے ذکر کردہ احوال، سمندر، نہریں اور محلات وغیرہ کا مذاق اڑاتا ہے۔

اور ''الذین أنعمت علیهم'' سے مراد اس کے نزدیک اہل حکومت ہیں اور ''صراط الذین أنعمت علیهم'' میں بھی منعم علیہم، اس کے نزدیک یہی اہل حکومت ہیں، اور جس قوم کو فرماں روائی اور سلطنت حاصل نہ ہو، اس شخص کے نزدیک وہ ''ضالون'' یعنی گمراہ ہیں اور وہی لوگ ''مغضوب علیهم'' یعنی خداوند کریم کے غضب کے مستحق ہیں، یہاں تک کہ اس زندیق نے یوں بھی کہہ ڈالا کہ:

''نصاریٰ باوجود عقیدۂ تثلیث کے مسلمان ہیں''

اس زندیق کے نزدیک کفر واسلام کا تعلق عقائد واقوال سے نہیں، صرف اعمال سے ہے، اور نہ ہی اس کے نزدیک اسلام کی بنیاد ان پانچ اصولوں پر ہے جن کا ذکر حضور پاک ﷺ کہ ارشاد گرامی ''بنی الإسلام علی خمس'' میں آیا ہے، بلکہ اس کے نفس وشیطان نے اس کو وسوسہ میں ڈالا، جس کی بنیاد پر اس نے از خود دس اصول بنا لئے۔

نمازیں اور دیگر شرعی اعمال واحکام پر اس زندیق کے نزدیک نجات کا دار ومدار نہیں ہے، ہاں! اتنا ضرور ہے کہ کبھی کبھی جنت ودوزخ کا ذکر کر کے قاری کو التباس میں ڈالتا ہے، لیکن یہ بھی محض دھوکہ اور فریب ہے، جن پر وہ قلبی طور پر ایمان نہیں لایا ہے، اس لئے کہ جنت ودوزخ کے مخالف عقائد ونظریات کا وہ برملا اعلان کرتا ہے، انہی باطل عقائد ونظریات کی طرح یہ شخص اور بھی کئی بدتر افکار کا حامل ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس ملحد کے کفر کے اسباب بے شمار ہیں، جن کو اس مقام پر بیان نہیں کیا جاسکتا، اس ملحد نے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس کا نام ''خاکساران'' رکھا تھا اور لوگوں کو اس کی امداد اور اس میں شمولیت کی دعوت دیتا تھا اور اس اکیڈمی کا مقصد بھی وہ خفیہ سازشیں تھیں جنہیں اس مقام پر بیان نہیں کیا جاسکتا ہے۔ واللہ الهادی إلی الحق۔

چند جدید تفاسیر

میرے اس مقدمہ ''یتیمة البیان'' کے طبع ہونے کے بعد، ان چالیس سالوں میں دیگر کئی تفاسیر منظر عام پر آئیں، میرا مطلب ہے کہ وہ تفاسیر جو عصر حاضر میں بھی لکھی گئی ہیں، نہ کہ وہ قدیم تالیف کردہ تفاسیر جو حال میں طبع ہوئیں، جن میں ''تفسیر القرطبی'' یا ''تفسیر القاسمی'' جو دمشق وغیرہ سے حال ہی میں طبع ہوئی ہیں، ان جیسی تفاسیر پر تبصرہ مقصود نہیں ہے، بلکہ اس ذیلی نوٹ میں مقصود معاصر مصنفین کی تفاسیر پر نقد وتبصرہ ہے، ان تفاسیر میں سے بعض تفاسیر اہل علم ودانش اور ارباب تقویٰ کی تالیف کردہ ہیں اور بعض ان مصنفین کی ہیں جنہیں علمی کمال اور ان علوم میں جن کو مفسر محتاج ہو، رسوخ وثبات حاصل نہیں ہے یا پھر وہ محض گمراہ فرقوں کی جماعت کا فرد ہے۔

آخری دو قسموں کی تفاسیر پر کچھ مناقشات وتنبیہات ذکر کی جائیں گی، اس لئے کہ ان تفاسیر میں بعض ابحاث شاہراہ مستقیم سے منحرف اور سلف کے سیدھے راستے کے مد مقابل ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ: ''یتیمة البیان'' کی دوبارہ طباعت کی جارہی ہے اور کچھ حذف واثبات کے بعد یہ کتاب دوبارہ منظر عام پر آئے گی، لیکن میری صحت تفصیلی بحث اور واضح تر بیان وتحریر سے معذور ہے، جس کی بناء پر میں مجبور ہوں کہ صرف اشارات پر اکتفاء کروں اور اشارات عقلمند وہوشمند کو کافی ہوا کرتے ہیں۔ واللہ الهادی، إلی الصواب

۱- معارف القرآن، مفتی محمد شفیعؒ

یہ تفسیر حضرت استاذ مفتی مولانا محمد شفیع دیوبندیؒ کی ہے (اللہ تعالیٰ ان کی [illegible]

عافیت کے ساتھ برکت دے) جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، اس تفسیر کا ماخذ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کی ''بیان القرآن'' ہے۔ مولاناؒ نے اس تفسیر میں ''بیان القرآن'' کو واضح عبارات کی صورت میں ملخص کر دیا ہے اور مزید چند ایسے قیمتی مسائل و ابحاث ذکر فرمائی ہیں جن کے اہل عصر محتاج ہیں، ہمیں اس تفسیر پر تعریفی کلمات رقم کرنے کی بالکل ضرورت نہیں، اس لئے کہ یہ وہ بہترین تفسیر بن چکی ہے، جس سے عالم وغیر عالم ہر شخص مستفید ہو رہا ہے۔

۲- معارف القرآن، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ

یہ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی تفسیر ہے، جس میں وہ سورۂ فاطر کے اختتام تک پہنچ سکے اور سورۂ حجر تک یہ تفسیر طبع بھی ہو چکی ہے، یہ بھی نہایت عمدہ تفسیر ہے، جس میں قاری بہترین نفیس منقول ابحاث پائے گا، مذکورہ بالا دونوں تفاسیر اردو زبان میں ہیں اور ہندوستان و پاکستان میں خوب رائج ہیں۔

۳- تفسیر ماجدی، مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ

حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی اردو زبان میں ترجمہ و تفسیر جن پر عربی تفاسیر کی منقول عبارات سے فوائد تفسیریہ تعلیق فرمائے گئے ہیں اور بعض مواضع میں مولانا نے ایک ہی مضمون کے متعلق کئی ابحاث جمع فرما دی ہیں، اس تفسیر میں جدید علوم وفنون اور مختلف تحقیقات کے متعلق بعض وہ ابحاث بھی ذکر کی گئی ہیں جو انگریزی زبان میں لکھی گئی کتب سے ماخوذ ہیں، اسی طرح بعض تاریخی ابحاث بھی عمدہ پیرائے میں ذکر کی گئی ہیں، اس تفسیر کا اسلوب بیان گذشتہ عہد کی کتابوں، انجیل، کماریٰ، تلمود کی طرح کا ہے۔

لیکن اس بات سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا ہے کہ مؤلف کو دینی علوم میں رسوخ وکمال حاصل نہیں ہے اور عربی علوم جن میں صرف، نحو اور بلاغت سرفہرست ہیں، ان کے متعلق بھی موصوف ادنیٰ واقفیت رکھتے ہیں، نیز عقائد میں بھی تصلب اور مضبوطی نہیں رکھتے ہیں، اس لئے اس تفسیر پر کلی اطمینان نہ رکھ لینا چاہئے اور یہ تفسیر محتاج ہے کہ کوئی معتبر و مستند عالم دین اس تفسیر کا

حرف بحرف شروع سے اخیر تک مطالعہ کرے اور اس تفسیر کے متعلق رائے پیش کرے، تا کہ عوام کے لئے صبح روشن ہو جائے۔

۴۔ تفہیم القرآن، مولانا مودودیؒ

یہ استاذ مودودی کی قلمی کاوش ہے، بیشک مؤلف موصوف اردو زبان کے بہترین صحافی اور ادیب تھے اور صحافت میں ان کو وہبی ملکہ عطا کیا گیا تھا، اردو طرز انشاء میں بھی عجیب اسلوب تحریر کے حامل تھے، مختلف ومتفرق موضوعات کے منتشر مسائل کے حل کرنے میں ان کا قلم سیل رواں کی سی ایسی روانی رکھتا ہے جو عوام کے لئے جاذب نظر اور نئی نسل کے قلوب کو اپنی جانب مائل کرنے والا ہے۔ بعض ابحاث میں موصوف نئی طرز فکر ونظر کے مطابق بحث فرماتے ہیں۔

لیکن افسوس کے ساتھ یہ ماننا پڑتا ہے کہ موصوف کو دینی علوم میں رسوخ وکمال نہیں اور نہ عربی ادب اور بلاغت کے علوم سے کچھ واقفیت ہے، چنانچہ اپنے اردو تحریر وانشاء کے ذوق کو بلیغ عربی گفتگو کے طرز سے مقید اور مزین فرماتے ہیں اور ہمیشہ دیگر مفسرین کے طور طریق پر اپنی گفتگو کی بنیاد رکھتے ہیں، لیکن جب اسی مضمون کی تعبیر اپنے خاص اسلوب میں کرنا چاہتے ہیں تو صراط مستقیم چھوڑ کر درست آراء ونظریات سے تجاوز کر جاتے ہیں۔

مؤلف محترم کی خودرائی اور خود پسندی بعض مرتبہ موصوف کے قلم سے ایسا کھیل کھیل جاتی ہے جو موصوف کے لئے دائمی جہالت اور شرمندگی کے داغِ نمایاں کا باعث ہوا کرتی ہے اور ہر مسئلہ کے متعلق ان کی تحقیق وتنقیح باوجود اس کے کہ موصوف اردو طرز تحریر وانشاء پردازی کے سوا، دیگر فنون کے متعلق انتہائی کوتاہ نظر واقع ہوئے ہیں اور سلف صالحین کی عیب جوئی ان کی تمام تر کتب وتصنیفات کا لازمی جز ہوا کرتی ہیں، اسی بناء پر ان کی اس تفسیر میں بھی کئی قابل گرفت ابحاث' مناقشات واعتراضات اور مختلف مضامین کے متعلق تنبیہات کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔

یہ مختصر رسالہ تو ان تمام مناقشات وتنبیہات سے تفصیلی بحث بمع مثال بیان کر دینے کی گنجائش نہیں رکھتا، لیکن مشتے از نمونہ خروارے چند مثالوں پر ہم اکتفاء کرتے ہیں۔

''تفہیم القرآن'' چند قابل گرفت مباحث

ان قابل گرفت مقامات میں سے سورہ آل عمران کی آیت متعلقہ غزوہ احد کی تفسیر میں (۱-۲۸۸، طبع خامس) یوں رقم طراز ہیں:

''جس سوسائٹی میں سود کی نحوست ہو وہاں حرص، لالچ، بخل، بغض وحسد آپس میں نفرت اور غم وغصہ جیسی اخلاقی بیماریاں نشونما پاتی ہیں جو لوگ سود دیتے ہیں ان میں حرص، لالچ اور بخل جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں اور جو سود لیتے ہیں ان میں آپس میں حسد، بغض اور عداوت جیسے امراض فروغ پاتے ہیں، چنانچہ صحابہ کرام میں ان دونوں قسموں کے افراد پائے جاتے تھے، جس کی بنا پر مسلمانوں کی شکست میں ان بیماریوں کا پایا جانا من جملہ دیگر اسباب ہزیمت کے بہت تاثیر رکھتا ہے''

اب ذرا غور فرمائیے! کیا قرآن کریم میں کہیں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ان اخلاقی بیماریوں کا پایا جانا مسلمانوں کی شکست میں اثر انداز ہوا؟ بلکہ اللہ جل شانہ تو ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ولقد صدقكم الله وعده إذ تحسونهم بإذنه حتى إذا فشلتم وتنازعتم في الأمر وعصيتم من بعد ما أراكم ما تحبون﴾

اور دوسرے مقام پر یوں فرماتے ہیں:

﴿إنّ الذين تولّوا منكم يوم التقى الجمعن إنّما استزلّهم الشيطان ببعض ما كسبوا ولقد عفا الله عنهم﴾

اللہ جل شانہ کے ان ارشادات پر غور فرمائیے اور پھر موصوف کی رائے کا تقابل کیجیے، کہاں خدا کا یہ فرمان مقدس اور کہاں موصوف کی انشاء آفرینی؟ اور جیسے مان لیا جائے کہ چند جوانوں نے اپنے امیر کی نافرمانی کی، اس کے حکم میں تاویل کی اور مال غنیمت کی طرف دوڑ پڑنے کو نبی کے حکم پر ترجیح دی کیا یہ ان کے باطنی حرص وطمع اور ان کے حسد وبغض پر دلالت کرتا

ہے؟ اور یوں بھی غور فرمایے کہ چلیے اس وقت تک ربوا کی حرمت نازل نہ ہوئی تھی لیکن اخلاص وصفائے باطن سے ایمان قبول کر لینے کے بعد کیا ان کی طبائع ان مذموم رذائل کو کسی طرح بھی اپنے درمیان راہ فراہم کر سکتے ہیں؟ ان سب کو چھوڑیے کیا اللہ رب العزت نے اس طرح کے کسی سبب کی طرف اشارہ فرمایا ہے؟ اور کیا "ببعض ماکسبوا" کا مطلب، ومقصد وہی ہے جو استاذ مودودی نے فرمایا؟ ان کی بیان کردہ تفسیر سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف انتظار میں تھے کہ پاکباز صحابہ کرام کے متعلق مذمت کا کوئی موقعہ ان کے ہاتھ آئے تو وہ ان سے انتقام لیں اور ان پر لعن طعن اور ان کی عیب جوئی کریں اور گویا ایسی گھات میں تھے کہ ان پر زبان درازی کر سکیں، اللہ رب العزت ان کو اس صریح گمراہی وکج روی سے ہدایت نصیب فرمائے اور تمام صحابہ کرام کو بروز قیامت علی رؤوس الاشہاد اپنی رضا کا پروانہ نصیب فرمائے۔

ایک اور عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مؤلف موصوف نے سید قطب شہیدؒ کی تفسیر "فی ظلال القرآن" کا مطالعہ فرمایا اور آیت ۱۲۱ تا ۱۸۹ تک جو آیات غزوۂ احد سے متعلق ہیں ان کی تفسیر ظلال القرآن سے استفادہ کیا، میرا مطلب یہ ہے کہ سید قطب شہیدؒ نے ان ٦٩ آیات کو ایک ہی ربط کے ساتھ بیان فرمایا اور ان آیات کے ذیل میں کئی لطائف ومعارف واشگاف کیے، ساتھ ساتھ ان آیات کے آپس میں مربوط ہونے اور ان تمام آیات کے آپس میں اتصال کو خوف آفریں انداز میں بیان فرمایا، جب آیت ﴿ولا تأكلوا الربا اضعافا مضاعفة﴾ جو غزوہ احد سے متعلق آیات کے اثنا ہی میں ہے آئی تو اس کی تفسیر میں صاحب "ظلال القرآن" نے یہ کلمات ارشاد فرمائے:

> معرکہ کارزار کے وقوع پذیر ہونے کے متعلق بیان کے سیاق وسباق کو دیکھتے ہوئے، اس معرکہ میں پیش آمدہ واقعات کی نقاب کشائی اور دیگر اخلاقی مسائل جو نفوس کے اصلاح وتزکیہ سے متعلق ہیں کہ کس طرح نفوس کو شہوات وخواہشات کے شکنجہ سے آزاد کیا جائے، طمع اور آپس کے حسد کی اندھیریوں کو کس طرح دور کیا جائے اور حرص وکینہ اور

دیگر چھپی ہوئی مدفون خواہشات سے طبائع کو کیونکر پاک وصاف کیا جائے ،ان دونوں قسم کے مختلف معاملات کو یکجا بیان فرما دینا اپنی جانب توجہات مبذول کراتا ہے۔

مؤلف موصوف استاذ مودودی ان آیات کی تفسیر کے متعلق تفصیلات کے ضمن میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''اس آیت کا بھی اسی طرح نظم وحکومت سے متعلق دیگر معاملات کے ساتھ گہرا تعلق ہے جن آیات میں نظم وحکومت کے متعلق مسلمانوں کی اجتماعی ،معاشرتی زندگی کو خداوند تبارک وتعالی کے بیان کردہ منہج وطریق پر استوار کرنے کے متعلق آشکارا کیا گیا وہ معاشرہ اور سوسائٹی جس کی بنیاد زندگی کے تمام شعبوں میں باہمی مشورہ پر رکھی گئی ہو نہ کہ صرف حکومتی معاملات میں مشورہ کو اہمیت دی جائے اور بس ،اسی طرح وہ معاشرہ جو آپس میں امداد اور تعاون کی بنیاد پر تشکیل پائے نہ کہ سودی لین دین کی بنیاد پر فروغ پائے ،یہی وہ منہج وطریق ہے جو خداوند تعالی کا بیان کردہ ہے،اس لیے کہ باہمی تعاون اور امداد پر استوار سوسائٹی سودی معاملات کی نشونما کے ساتھ ساتھ کسی نظام وحکومت کے تحت فروغ نہیں پا سکتی ہے۔''

اور ذرا آگے چل کر یوں کہتے ہیں:

''یہی وجہ تھی کہ قرآن سود کے درپے ہوا اور سودی لین دین سے منع کیا اور انفاق کے درپے ہو کر اس اطاعت وفرمانبرداری ہی کو رحمت خداوندی کے نزول کے لیے دارومدار ٹھہرایا۔''

اور پھر آگے یوں لکھتے ہیں:

''باہمی امداد ومساعدت پر مبنی سوسائٹی ،سودی معاملات پر

فروغ پانے والی سوسائٹی سے زیادہ مدد خداوندی کے قریب ہے اور غصہ کو
روکے رکھنا اور معافی و درگذر کی صفات نصرت خداوندی کو گویا کھینچ لانے
والے سامان ہیں''۔

خدا آپ کی حفاظت کرے! ذرا غور فرمایئے کہاں سید قطب کا وہ فصیح وبلیغ کلام اور کہاں یہ بوجھل عیب دار کلام جو کانوں سے پہلے دماغ کو بوجھل کرنے والا ہے، استاذ موصوف سید قطب کے کلام کی غرض ومقصد کو نہ پہنچ سکے، اور اپنی طرز پر جو ان کے ذہن میں آیا وہ کہہ گئے اور اپنے غلط فہم وفراست سے یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ اخلاقی اور روحانی بیماریاں صحابہ کرام کے درمیان پائی جاتی تھیں جو مسلمانوں کی شکست میں اثر انداز بھی ہوئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ ہی ذرا فرمایئے کہ ایسا شخص جس کی علمی بضاعت آپ ملاحظہ فرما چکے اور اس کی بساط فہم آپ نے جانچ لی، کیا اس شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر لکھے؟ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کی تفسیر کا موضوع ان جیسی تفاسیر سے بالکل مستغنی ہے، موصوف سے قبل بھی اردو زبان میں اس قسم کی تفاسیر لکھی جا چکی ہیں، جن میں ابو الکلام احمد دہلوی کی تفسیر سرفہرست ہے اور ابو الکلام تو اردو طرز تحریر وادب میں استاذ مودودی سے کہیں فائق تھے، بلکہ مودودی تو ابو الکلام کے ادبی خوان کے طفل مکتب ہیں، ابو الکلام نے اپنی تفسیر کا نام ''ترجمان القرآن'' تجویز کیا تھا، مودودی بھی اس تفسیر سے استفادہ کرتے ہیں اور اپنے اس استفادہ کی روشنی میں جو ان کی جی میں آتا ہے لکھ ڈالتے ہیں، لیکن ابو الکلام طرز تحریر اور اردو ادبی انشاء پردازی میں دیگر ادباء سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بات پسند کرتے ہیں کہ ایسی نئی تحقیق پیش کریں جس تک کوئی نہ پہنچ سکا ہو، تاکہ ان کو ان تحقیقات میں سابق گردانا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ سوچ تھی جس کی بناء پر بہت سے رجال کار دھوکہ وفریب میں مبتلا ہو گئے، لیکن اس سبقت کی کوشش میں وہ ایسے نظریات وقائم کرنے لگے کہ ان میں سبقت کی صلاحیت ہی نہ رہی، جس کی بناء جہالت یا گمراہی کے اندوہناک گڑھے میں جا پڑے، استاذ مودودی اکثر وبیشتر ان کے غلط اور گمراہ کن نظریات میں ان کی تقلید کرتے ہوئے دکھائے دیتے ہیں جس کی وجہ سے

پیروکار اوران کے سرکار دونوں گمراہ ہوئے۔

۲-سورہ بقرہ میں آسمانوں کی تفسیر کے متعلق مودودی نے (۱-۶۱ طبع خامس) جو تحریر کیا اس کا ترجمہ یہ ہے:

> ''سات آسمانوں کی حقیقت کا بیان اور ان کا تعین انتہائی مشکل کام ہے، اس لیے کہ آسمان کے متعلق ہر دور میں انسانوں کا باہمی اختلاف رہا ہے، یا بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ انسانوں کا اختلاف اس چیز کے متعلق رہا ہے جو ان کے اوپر زمین کے ورے ورے ہیں، انسان اس شئ کے مشاہدہ اور اس کے متعلق قیاس آرائیوں کے پیش نظر ہمیشہ ایسے نظریات قائم کرتا رہا جو بار بار بدلتے رہے، اس لیے یہ بالکل مناسب نہیں کہ کوئی شخص ان تمام تر تصورات میں سے کسی ایک تصور پر اپنی فکر اور عقیدہ کو مرتکز کردے اور قرآن کے ارشاد کو سمجھنے کے لیے مدار ٹھہرے، بلکہ اجمالی طور پر یوں کہنا کافی ہوجائے گا کہ اس زمین کے علاوہ جتنی کائنات ہے اس کائنات کو خدائے پاک نے سات مضبوط ومحکم طبقات میں تقسیم فرمارکھا ہے، یا یوں بھی کہنا کافی ہوجائے گا کہ یہ کشادہ سطح جو اس کائنات کے اردگرد پائی جارہی ہے، یہ خدائے پاک کی طرف سے کائنات کے لیے مقرر کردہ سات طبقات پر مشتمل ہے۔''

موصوف کے یوں فرمانے سے بظاہر یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ ان سات آسمانوں کو جن کی خدائے پاک نے مختلف صفات بھی بیان فرمائی ہیں اور ان میں مختلف ابواب کا ہونا بھی ذکر کیا گیا ہے موصوف ایمان نہیں رکھتے ہیں، انسانی آراء وافکار اور ان کے باہمی تنازعے واختلاف کو چھوڑیے، یہ دیکھیے کہ قرآن کریم نے اپنی واضح صریح نصوص میں ان آسمانوں کے متعلق کیا ثابت فرمایا ہے، کیا سورہ فصلت میں خدائے کریم نے نہیں فرمایا کہ:

﴿فقضاهنّ سبع سماوات فى يومين وأوحى فى كلّ سماء أمرها﴾

اور یہ دیکھیے کہ متواتر احادیث کی صریح نصوص ہمیں کیا خبر دیتی ہیں اور کیا ثابت کرتی ہیں خاص طور پر معراج کے متعلق قطعی یقینی احادیث جن میں ان آسمانوں کی کیفیات ان میں ملائکہ کے پائے جانے اور ان میں دیگر کئی امور ونظامات کا تذکرہ فرمایا گیا ہے اور عجیب سماوی نظام کی پردہ کشائی کی گئی ہے، یونانی اور یورپی فلسفے ہمیں نہ سنایے اور سائنسی علوم کی معلومات اور ان علوم کے ماہرین کا آسمان کی حقیقت تک نہ پہنچنا ہمیں نہ بتلایے، ان کا ادراک تو آسمانی فضاء میں معلق ستاروں تک ہی نہیں پہنچا، چہ جائیکہ کہ چاند تک پہنچ جائیں، اور مریخ پر اپنے خلائی جہاز اتار سکیں۔ یہ لوگ تو اس فضائی کائنات کی وسعت دیکھ کر ہی حیران اور دہشت زدہ ہو رہے ہیں، بلکہ ان ستاروں میں سے بعض ستارے تو ایسے ہیں کہ کئی کروڑ ہا سال تک بھی ان کی روشنی زمین تک نہیں پہنچ سکتی، حالانکہ سارے دکھے ان دکھے روشن چراغ آسمان دنیا کے نیچے ہی ہیں۔

اس شاداب گنبد (آسمان) کے ارتفاع کو ذرا غور کیجیے کہ کس طرح اسے اونچا کیا گیا اور پھر اللہ جل شانہ کے اس قول پر نظر فرمایے:

اور اللہ عزوجل کا یہ فرمان بھی غور فرمالیجیے:

﴿أفلا ينظرون إلى الإبل كيف خلقت وإلى السماء كيف رفعت﴾

ان کے مدارج فہم وادراک اور ان کی عقول چونکہ آسمان تک نہ پہنچ سکیں اس لیے یہ باطل گمان کر بیٹھے کہ ان کے پیش نظر جو انتہا نظر آ رہی ہے، یہ دیکھنے والے کے لیے محض ایک حسین منظر کی ہی حیثیت رکھتا ہے، واقعۃ اس کی کوئی حقیقت نہیں، بلاشبہ ان فلاسفہ کا یہ قول جھوٹ ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ ناکامی اور خسارے میں پڑ گئے، اس لیے کہ قرآن کریم نے اس کے وجود اور اس کی مختلف صفات کو بتلایا ہے اور حضور ﷺ کی یقینی متواتر احادیث میں اس کی تفاصیل اور اس کے متعلق کئی امور مثلا یہ کہ یہ آسمان خدائی فرشتوں کے جائے اقامت ہیں اور ان آسمانوں کے اوپر خدائے پاک کا عرش ہے وغیرہ بیان فرمائے گئے ہیں، یہ بات قطعی درست ہے کہ خدائے پاک مستقر ومکان سے پاک ہیں اور کسی مادی جگہ کے ہرگز محتاج نہیں ہیں اس لیے کہ خدائے پاک تو وہ بے نیاز ذات ہے جو ہمیشہ ہے اور ہمیشہ رہے گی اور وہ آسمان وزمین اور ساری

کائنات کا خالق اور خوب بلند برتر وبالا ہے، لیکن اس قدر بیان بھی کہ عرش ان آسمانوں کے اوپر قائم ہے آسمان کے قطعی حقیقت ہونے کا بخوبی معلوم ہوجاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ تمام آسمان مخلوق ہیں اور موجود ہیں، قطعی آیات اور واضح دلائل اس کے متعلق پائے جاتے ہیں، ان آسمانوں کا انکار قرآن کریم اور رسول امین ﷺ کی تکذیب کو لازم ہے جبکہ قرآن کریم کی سچائی، خدائے پاک اور رسول کریم کی سچائی پر ایمان ویقین رکھنا ضروریات دین میں سے ہے، اور ضروریات دین کی تادیل ان کے انکار کے مترادف ہے، مودودی صاحب نے جو رائے اور نظریہ تفہیم القرآن میں درج فرمایا ہے، اس سے آسمانوں کے انکار کا وہم ہوتا ہے اور قرآن وحدیث کے ثابت کردہ نظریہ پر عدم اطمینان کا پتہ چلتا ہے، جبکہ تمام ادیان سماویہ نے ان آسمانوں کے وجود کو ثابت ٹھہرایا ہے، درست تو یہ تھا کہ اس مقام پر یوں تفسیر فرماتے کہ: فلاسفہ کے افکار اگرچہ ان آسمانوں کے حقائق پر مطلع ہونے سے عاجز رہے ہیں، لیکن قرآن وسنت اور شریعت اسلامیہ نے ان کے وجود اور ان کی مختلف صفات کو آشکارائے خلائق فرمایا ہے، اب موصوف کا اس قول پر اکتفا کرنا کہ: ''ان آسمانوں کا تعین مشکل ہے اور کئی افراد کی آراء وافکار اس بارے میں آپس میں متصادم ہیں'' کیسے درست شمار کیا جائے؟ اس سقیم کلام کی کیا ضرورت تھی؟ اور قرآن وحدیث کے قطعی وصریح دلائل کے آگے دیگر رجال کی آراء کا کیا درجہ اور کیا قدر ومنزلت؟ ایک منصف شخص واضح اور قطعی دلائل کے باوجود اس غلط پیرائے میں سمجھانے کو خود جانچ سکتا ہے۔

فاضل مودودی صاحب نے جب اس مقام کے متعلق ''ظلال القرآن'' (۱-۶۲ طبع خامس) میں یوں پڑھا کہ:

جس طرح استواء علی العرش میں مادی اعتبار سے غور وفکر کی گنجائش نہیں، سوائے یہ کہ اس استواء سے مراد خلق وتکوین کا ارادہ اور محض استعلاء وغلبہ کا اعتقاد رکھا جائے، اسی طرح سات آسمان جن کے متعلق بیان یہاں مقصود ہے کے متعلق بھی غور وفکر کی گنجائش نہیں، کہ ان آسمانوں کی اشکال واجسام کی تحدید کی جائے بلکہ اس نص سے جس کو خالق کائنات جو تمام کائنات پر غلبہ رکھتا

ہے اس کے انکار و نافرمانی کو برا بتلانے کے ضمن میں ذکر کیا گیا ہے، حاصل ایک کلی مفہوم مراد لیا جائے کہ مراد کائنات میں پائی جانے والی زمین وآسمان کی درستگی اور برابری ہے اگر چہ سید قطب کا یہ کلام بھی اس محل کے لحاظ سے معنوی اعتبار سے مقصود رکھتا ہے لیکن باوجود اس معنوی تصور کے نظریاتی اعتبار سے یہ کلام بالکل بے غبار ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہی فاضل مودودی صاحبؒ سید قطبؒ کی منشا کو نہ پہنچ سکے اور اس بحث میں سید قطبؒ پر سبقت کرنی چاہی اور جو جی میں آیا کہنے لگے اور واقعی گمراہی کے قریب ہو گئے، بار بار غور فرمایئے سید قطبؒ اور فاضل موصوف کہ ان دونوں کلاموں کے درمیان آپ کو واضح فرق معلوم ہوگا۔

ساری بحث کا خلاصہ یہ کہ فاضل مودودی کا یہ کلام اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ موصوف کو قرآن وحدیث میں بیان کردہ نظریہ پر کلی اطمینان حاصل نہ تھا اور اس نظریہ وعقیدہ کے متعلق ان کا سینہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا، اللہ تعالی رحم فرمائے اس شخص پر جس نے انصاف کیا اور فاضل موصوف کی عبارت میں تکلف وتعسف سے کام لے کر تاویلات کو راہ نہ دی، اکثر قارئین کے پیش نظر ان حقائق کی طرف رہنمائی حاصل نہیں کر سکتے اور ان عواقب ونتائج پر مطلع نہیں ہو سکے جو خفیہ طور پر ان کے اذہان میں سرایت کر جاتے ہیں، خاص طور پر نئی نسل تو لچکدار عبارت سے خوب شغف رکھتے ہیں، اگر چہ یہ عبارات منکے میں بق بق کی گونج کی طرح محض لغو اور مہمل کیوں نہ ہوں، خدائے پاک ہی سب سے بڑھ کر حق گو اور حق کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں۔

۳-سورۂ بقرہ کی آیت "ورفعنا فوقهم الطور" کے متعلق فرماتے ہیں:

> ''طور کو علیحدہ فرما کر ان کے اوپر کر دینے کی کیفیت تو مشکل معلوم ہوتی ہے بلکہ اجمالی طور پر یوں سمجھ میں آتا ہے کہ پہاڑ کی گھاٹی میں بوقت اخذ میثاق ان پر پہاڑ کی ایک خوفناک تصویر پیدا کر دی گئی جس سے سمجھنے لگے کہ یہ پہاڑ ان پر گر پڑے گا۔''

یہ موصوف کے معتزلی ذوق کی خبر دیتا ہے گویا کہ حسی اور حقیقی رفع کے موصوف منکر ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بجائے رفع طور کہ باری تعالی نے ایک خوفناک جعلی صورت ان پر مسلط

کر دی تھی حالانکہ اس واقعہ کے متعلق سورۂ اعراف میں اللہ جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں:

"وإذ نتقنا الجبل فوقهم كأنّه ظلّة وظنّوا أنّه واقع بهم" اس صریح نص میں واقع لفظ "نتقنا" کی اس طرح معتزلی تاویل کیسے ممکن ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ اپنی کتاب ''مفردات القرآن'' میں فرماتے ہیں کہ "نتق الشيئ" یعنی کسی شئ کو اس طرح کھینچ لینا کہ وہ نرم ہو جائے اور جھک پڑے، باری تعالی کا فرمان ہے: ﴿وإذ نتقنا الجبل فوقهم﴾، فاضل مودودیؒ یہاں بھی صاحب ''ظلال الفرقان'' کے مقصد ومنشا کو نہ سمجھ سکے، صاحب ظلال القرآن فرماتے ہیں:

''ایسا عہد و پیمان لیا جو بھلایا نہ جاسکے، اسی وجہ سے ایسی جگہ پر لیا گیا جو بھلائی نہ جاسکے، یہ عہد و پیمان ایسی حالت میں لیا گیا کہ پہاڑ ان کے سروں پر سائبان کی مانند ٹھہرایا گیا تھا، چنانچہ اس سائے میں یہ خوفناک معجزہ دکھلایا گیا جس میں یہ صلاحیت تھی کہ ان کے عہد و پیمان کو قبول کر لینے کے بعد اپنے اندھے ہونے سے ان کو محفوظ کر سکے اس طرح یہ عہد و پیمان اس قوی معجزہ کے سائے میں ان کو دکھلایا گیا۔''

صاحب ''ظلال'' کے کلام میں "ظلّة" کو اس کے معنی متعارف سے جدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کو خوف ناک معجزہ کا نام دیا گیا ہے، مودودی صاحب نے موصوف کی اس شرح میں تحریف کی اور خوفناک معجزہ کے بجائے اس کو خوفناک کی فرضی صورت قرار دیا، اس لیے کہ پہاڑ کو ان کے سروں پر قائم کر دینے کو موصوف بعید از عقل خیال کرنے لگے جس طرح ایسے ہی تحریف ان سے پہلے ابوالکلام نے اس آیت کی تفسیر کے متعلق کی ہے۔

۴-سورۂ انعام کی آیت: "فلمّا جنّ عليه الليل رأى كوكبا" کے ذیل تفہیم القرآن (طبع پنجم) کی جلد نمبر:۱، ص:۵۵۶ پر موصوف یوں رقم طراز ہیں:

ان آیات مبارکہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر منصب نبوت سے سرفراز ہونے سے پیشتر گذرے ہوئے احوال اور ان کے فکر وتدبر کی بلندیوں اور آفرینیوں کو بیان کیا گیا ہے، جس سے یہ بات آشکارا ہوتی ہے کہ جو شخص سلیم الفطرت پیدا ہو، بت پرست سوسائٹی میں

آنکھ کھولے اور پیغام توحید کی اس تک رسائی ناممکن ہو، وہ اس کائنات خداوند میں وقوع پذیر اثرات و نیرنگیوں میں غور وفکر کر کے ان سے استدلال کرتے ہوئے ذات حقیقی تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔

پھر کچھ آگے چل کر یوں فرماتے ہیں: تردد وحیرت اور ہوشربائی کے ان منازل ومراحل کا، سفر توحید کے اثناء، وقوع پذیر ہونا ناگزیر ہے، چنانچہ ان مراحل پر ٹھہرنا کچھ معتبر نہیں، اس لئے کہ ان منازل ومراحل کے بعد اس مسافر کی انتہائے منزل توحید تک رسائی ہوجاتی ہے چنانچہ اعتبار انتہائے سفر کا ہے، اسی طرح اعتبار جائے قرار حقیقی کا ہے نہ کہ انتہائے سفر سے قبل پیش آمدہ مراحل کا الخ۔

موصوف کی اس تفسیری تحریر وتقریر میں کئی ایک قابل مؤاخذہ ومناقشہ باتیں ہیں:

اول: پہلی بات یہ کہ ہر نبی یا رسول کے قلب میں فطری وخلقی طور پر راسخ عقیدہ توحید جاگزیں ہوتا ہے اور ان کے نفوس اس عقیدہ توحید کے مطابق مطمئن ہوتے ہیں اور ان پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جبکہ وہ وحدانیتِ خداوندی کے تصور سے خالی ہوں، نبی کے لئے مراحل وحدانیت میں تردد اور حیرت ممکن ہی نہیں ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ:

"کل مولود یولد علی الفطرة فابواه یهوّدانه أو یمجسانه أو ینصرانه."

ترجمہ: ''ہر بچہ فطرتِ اسلامی پر پیدا ہوتا ہے، پس اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی کرڈالتے ہیں''

جب ایک عام بچہ کا یہ حال ہوا کرتا ہے تو جو بچہ پیدا ہی نبی اور رسول بننے کے لئے ہوا ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اللہ تعالیٰ پر ایمان ویقین تو اس کی فطری اور خلقی صلاحیت ہوتی ہے اور اس ایمان میں وہ کسی قسم کے استدلال واستنباط کا محتاج ہرگز نہیں ہوتا ہے' بلکہ تمام استدلالات سے قبل ہی وہ اس عقیدۂ توحید کی طرف اسی فطری صلاحیت سے راہ یابی پاتا ہے، اہل حق حضرات کے نزدیک حق عقیدہ یہی ہے۔ جی ہاں! یہ ممکن ہے کہ فکر وتدبر اور کائنات میں پیش

آمدہ احوال وآثار، نیز منظم ومرتب نظم میں غور وخوض کے بعد انبیائے کرام محض یقینی کیفیت سے عین الیقینی کیفیت کی جانب ارتقاء پذیر ہوتے ہیں اور پھر اس عین الیقین سے بڑھ کر حق الیقین تک پہنچتے ہوں، جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خدا تعالیٰ سے یوں سوال کرنا کہ:

﴿رب أرني كيف تحيي الموتى﴾

ترجمہ: ''اے پروردگار مجھے بتلادے کہ تو کیونکر حیات بخشے گا مردوں کو'' خوب واضح کرتا ہے۔

دوم: دوسری بین خطایہ کہ استاد مودودی کی تفسیر کے پیش نظر حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید کے معاملے میں حیرت وتردد کی منازل سے ہو کر گذرے ہیں اور پھر حق کی طرف بذریعہ استدلال راہنمائی پائی ہے اور ان منازل تردد کو جو ہر مسافر کو اثنائے سفر درپیش ہوتے ہیں، قطع کرنے کے بعد وحدانیت باری کی طرف راہ یاب ہوئے ہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے سلسلے میں اس قسم کی رائے رکھنا خطا محض اور صریح گمراہی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ استاذ مودودی نے اس مقام پر بھی سید قطب کی ''ظلال القرآن'' کی تقلید کی ہے، لیکن ظلال القرآن کے حقیقی مقصد ومطلب تک نہیں پہنچ سکے ہیں، اگرچہ مقام ہذا کے ذیل میں ''ظلال القرآن'' کی تعبیر بھی کوتاہ ہے۔

بہرحال عصمت انبیاء مسلم عقیدہ ہے اور شرک وکفر سے انبیاء کا قبل البلوغ وبعدہ مبرا ومنزہ ہونا امت محمدی کا اتفاقی اور اجماعی عقیدہ ہے، ممکن نہیں ہے کہ وہ معاملہ توحید میں متردد رہے ہوں اور حیرت سے سرگرداں ہو رہے ہوں یا کسی سے دریافت کریں یا اس عقیدہ توحید تک رسائی حاصل کرنے کے لئے استدلال کریں، ان کی پاکیزہ زندگانی میں ایک لمحہ بھی بت پرستی اور شرک متصور نہیں ہے، اگر اس تصور کو عارضی اثنائے سفر میں پیش آمدہ ایک لمحہ کا حال ہی کیوں نہ کہا جائے۔

سوم: تیسری خطایہ کہ ابراہیم علیہ السلام کا مذکورہ بالا کلام تو بطور مجادلہ ومناظرہ اور خصم اہل شرک کو خاموش کرنے کے واسطے تھا اور منکرین پر حجت تمام کرنے کا ذریعہ تھا، نیز ان کی گمراہی پر لطیف تنبیہ تھی، تاکہ ان کو اس مقام پر خطرے سے بچایا جائے۔ اہل بلاغت کی پرحکمت

دعوت کا یہی وطیرہ وطریقہ ہے، نہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود ورطۂ حیرت وشک میں مبتلا تھے اور حق سے بے بہرہ تھے، جس کی بناء پر یوں کہنا پڑے کہ مسافر کے لئے منزل تک پہنچنے میں اثنائے سفر ان راہوں سے گزرنا ناگزیر ہے۔

خلاصۂ بحث

یہ ان مؤاخذات کے چند نمونے ہیں جو گذشتہ آیات میں ان کے تفسیری کلام کے ذیل پیش کئے گئے۔ موصوف کی بعض غلطیاں تو اتنی فحش ہیں کہ راہ مستقیم سے گمراہ کردیں، ہماری غرض تو اس رسالے میں ان کڑکتی بجلیوں کی خفیف سی روشنی دکھلانا ہے۔ واللہ ولي التوفیق إلی العدالة.

موصوف کی مختلف کتب ورسائل کے منجملہ عیوب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب بھی علماء نے ان کو تنبیہ کی ہے کہ فلاں مقام پر موصوف کا کلام وقدم راہ راست سے بھٹکا ہے اور موصوف متنبہ بھی ہوئے کہ ان سے خطا ہوئی ہے اور اس کے درست کرنے کی کوشش بھی کرتے تو اس تعبیر کو بعینہ بدل ڈالتے تھے، گویا کہ موصوف نے رجوع کرلیا یا اس طرح تادیل ذکر کرتے تھے کہ وہ تعبیر ہی گویا بدل جاتی تھی، اور آنے والی نئی طباعتوں میں اسی تغیر وتبدل اور اصلاح تعبیر کے ساتھ اشاعت کرتے، لیکن اپنے رجوع یا تغیر وتبدل کو نہ بتلاتے تھے۔

چنانچہ گذشتہ طبعات جو لوگوں کے ہاتھوں پہنچ چکی ہوتی تھیں وہ ان کو اسی طرح پڑھا کرتے تھے اور اس تغیر واصلاح پر عدم اطلاع کی بناء پر اپنی گمراہی پر برقرار بھی رہتے۔ کاش کہ موصوف ان غلطیوں کو بانگ دہل بیان کرتے اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتے تو لوگوں کی نظروں میں ان کی قدر بڑھ جاتی اور اللہ تعالیٰ ان کی گذشتہ غلطیوں کو معاف فرما دیتے، لیکن انتہائی افسوس اور قلق ہے کہ موصوف نے ان غلطیوں کو یکسر واضح نہ کیا، گویا کہ ان سے خطا ہوئی ہی نہیں ہے۔

موصوف کی اس بغیر اطلاع کئے ہوئے تغیر واصلاح کی ایک مثال یہ ہے کہ موصوف نے حضرت یونس علیہ السلام کے تذکرہ میں یوں تذکرہ فرمایا کہ:

''ان سے منصب نبوت کے فریضہ کی ادائیگی کے معاملہ میں
تقصیر ہوئی، اس لئے کہ انہوں نے حکم خداوندی کا انتظار نہ کیا اور اپنی قوم کو
چھوڑ کر چلے گئے''

یہ بات موصوف کی واقعی انتہائی غیر مناسب تھی، چنانچہ علمائے کرام نے ان کو اس غلطی پر متنبہ کیا، اس لئے کہ اگر نبی منصب نبوت کے فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا تو گویا کہ وہ اس منصب عظیم کی اہلیت ہی نہیں رکھتا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گویا خداوند تعالیٰ ہی سے اپنے اس بندہ کے چننے اور اختیار میں کوتاہی ہوئی ہے، جس کی بناء پر خداوند تعالیٰ کے علم کا غیر محیط وغیر صحیح ہونا لازم آئے گا۔

علمائے کرام کی تنبیہات کے بعد موصوف نے اپنی تعبیر وتحریر کو تبدیل کرلیا، لیکن اس تغیر کو برسر عام نہیں بتلایا، جس کی بناء پر پہلی طبع میں وہ غلطی تاحال برقرار رہی۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر زندہ اٹھا لئے جانے کے متعلق بھی موصوف سے جو قلمی فروگذاشت ہوئی، اس کو بھی تبدیل کرلیا، لیکن عام اطلاع نہ کی۔ اسی طرح اور بھی کئی مقامات پر تغییر وتبدیل کے بعد اطلاع عام نہیں کی، اللہ رب العزت ہمیں بھی اور انہیں بھی حقیقی راہ ہدایت نصیب فرمائے۔

۵۔ تفسیر تدبر قرآن اور مولانا اصلاحیؒ

تفسیر ''تدبر قرآن'' یہ تفسیر اردو زبان میں شیخ امین احسن اصلاحی کا شاہکار ہے، مؤلف موصوف اپنی دیگر تالیفات کی وجہ سے کافی معروف شخصیت ہیں' موصوف استاذ مودودی کے قریب ترین افراد میں سے تھے اور ان کے دیگر حامیان کی فہرست میں سرفہرست تھے اور بیس سال کی طویل المدت رفاقت وامارت تسلیم کرتے ہوئے بعد ازاں استاذ مودودی سے علیحدگی اختیار کی' موصوف کی استاذ مودودی سے اس علیحدگی کا سبب ''مختلف مصالح اور مخصوص حکمت عملیوں کے پیش نظر شرعی احکام میں تغیر وتبدل کے جواز'' کا جو نظریہ مودودی نے اپنایا تھا، اس سے موصوف کا اختلاف تھا۔

مودودی صاحب نے یہ تصریح کی تھی اور یہ اعتقادی نظریہ بیان کیا تھا کہ: اسلام کے اساسی مقاصد دو قسموں پر مشتمل ہیں:

پہلی قسم: وہ اساسی مقاصد جس میں تغیر وتبدل کی کچھ گنجائش نہیں، جیسا کہ عقائد اسلامیہ مثلاً توحید، رسالت وغیرہ۔

دوسری قسم: ان مقاصد کی ہے جن میں مصالح اور حکمت عملی کے پیش نظر تغیر وتعدیل کی جاسکتی ہے۔ مودودی صاحب یوں بھی کہتے تھے کہ اس تغیر وتبدل کے شریعت اسلامیہ میں بے شمار نظائر بھی موجود ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے یوں اعلان فرمایا کہ: ''الأئمة من قریش'' امام اور خلیفہ قریشی ہی ہوسکتا ہے اور قرآن کریم میں باری تعالیٰ نے جو یوں ارشاد فرمایا کہ:

﴿یا أیّها النّاس إنّا خلقناکم من ذکر و أنثی وجعلناکم
شعوباً وقبائل لتعارفوا إنّ أکرمکم عند الله أتقاکم﴾

جس کا مقتضاء مختلف قبائل اور خاندانوں کے افراد کا باہمی فلسفۂ مساوات تھا، حضور ﷺ نے اس کو مصالح کے پیش نظر چھوڑ دیا۔

موصوف مودودی کی مذکورہ بالا تحریر وتقریر پر میں نے رسالہ ''الأستاذ المودودي وشيئ من حیاته وأفکاره'' میں بھرپور تنقید تحریر کی ہے۔ مزید تفصیل وبیان کے لئے وہیں مراجعت کی جائے۔

استاد مودودی نے جب اپنی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کا آغاز فرمایا تو موصوف اصلاحی صاحب نے بھی چاہا کہ ایک تفسیر تالیف فرمادیں، کیونکہ موصوف مودودی صاحب کو علوم عربیہ اور بلاغت وبیان کے علوم میں کوتاہ خیال کرتے تھے اور خود کو ان خصائص وصفات میں ان سے بلند گردانتے تھے۔

تدبر قرآن کے چند قابل گرفت مباحث

چنانچہ ''تدبر قرآن'' کے نام سے ایک تفسیر تالیف کرنا شروع کردی، یہ تفسیر تین ضخیم

جلدوں میں سورۂ بنی اسرائیل تک کی تفسیر پر مشتمل ہے، مجھ کو یہ امید تھی کہ شاید یہ تفسیر ان علمی اغلاط واخطاء سے پاک ہوگی ،لیکن افسوس! جب میں نے موصوف کی تفسیر کا مطالعہ کیا اور مختلف مقامات کی ورق گردانی کی ،تب میں نے کئی ایک ایسے مسائل پائے جن میں موصوف نے جمہور مفسرین' ائمہ اہل سنت والجماعت کی آراء سے مخالفت کی ہے، چنانچہ میری تمام تر امیدیں اکارت ہوگئیں اور پر امید خوشیاں مکدر ہوگئیں ،حالانکہ مجھے امید یہ تھی کہ یہ خوشیاں ہر قسم کی گندگی اور اس کے شوائب سے پاک ہوں گی ۔ چنانچہ درج ذیل آیات میں میں نے ان کی آراء کو جمہور مفسرین کے مخالف پایا:

١ : ورفعنا فوقكم الطور.

٢ : فقلنا اضربوه ببعضها .

٣: وجد عندها رزقا.

٤ :و إنْ من أهل الكتاب إلّا ليؤمننّ به قبل موته.

(تفصیل کے لئے ج:۱' ص:۱۹۹' ج:۱' ص:۲۰۵' ج:۱ ص:٦٨٠' ج:۲' ص:۱۹۵ کی مراجعت کی جاسکتی ہے)

ان مقامات کو دیکھ کر میرا اعتماد ووثوق ختم ہوگیا' یہ تفسیر بحث وتفتیش کے ساتھ بالاستیعاب مطالعہ کی محتاج ہے، اگر مؤلف محترم خود ہی بے لاگ تنقید اور بے تعصب بحث کو راہ دیں تو ان قابل مؤاخذہ آراء سے رجوع فرمالیں گے۔ والله الهادي إلى الحق.

٦-فی ظلال القرآن اور سید قطب شہیدؒ

مؤلف موصوف سید قطب بے شک عربی ادب میں قابل قدر براعت انداز وبلاغت بیان رکھتے ہیں اور جدید عربی ادب کے مطابق تحریر وتقریر کا ملکہ رکھتے ہیں، اسی طرح حسن تصویر وتمثیل میں بلند مقدرت ہیں اور ان کے عربی کلام میں بھی حسن پیرائیگی کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں، آیات قرآنی کے آپس میں ربط وضبط کے بیان میں بھی کافی حد تک صحت وسداد رکھتے ہیں ،موصوف نے مختلف آیات کو ایک عنوان ومقصد کے تحت نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے،

ہر آیت اپنی اگلی اور پچھلی آیات سے اتنا شدید علاقہ رکھتی ہے کہ اس کے پیش نظر کسی قسم کا انتشار وافتراق نہیں ملتا۔ موصوف کی تفسیر کی یہ امتیازی خصوصیت واقعی لائق التفات واعتنان ہے اور باریک بین محقق کے لئے قابل قدر بھی ہے۔

راقم السطور کا خیال یہ ہے کہ موصوف قرآن کریم کو اس کی حقیقی پاکیزہ روح کی صورت میں امت کو پیش کرنا چاہتے ہیں، لیکن چند جہات سے اس تفسیر میں بھی کوتاہی برتی گئی ہے اور کہیں کہیں تو صراط مستقیم سے بے راہ روی کا بھی واہمہ ہوتا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں وقت کی کمیابی کی بنا پر اس تفسیر کی مزید تحقیق وتفتیش کی قدرت نہیں پاتا ہوں اور نہ مجھے اس تفسیر سے کانٹ چھانٹ کرنے کی فرصت ہی دستیاب ہوسکی ہے۔

سید قطبؒ کی کتاب "العدالة الاجتماعية" میں مذکور چند مباحث جن میں خصوصی طور پر حضرت عثمان غنیؓ کے متعلق طعن زنی کی گئی ہے اور یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

> "(معاذ اللہ) حضرت عثمانؓ تو مروان کے اس قدر ماتحت تھے کہ وہ انہیں جیسے چاہتا، ہانکتا تھا۔ حضرت عثمانؓ صحابۃ الرسول کو مناصب حکومت سے برطرف کر کے اعداء خداوند کو مناصب سونپا کرتے تھے اور انکے زمانہ خلافت اور دیگر خلفاء کرام کے عہود کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھی"

دیگر آں! کئی ایسی ہی باتیں موصوف نے خلیفہ راشد حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے حق میں فرمائیں، حالانکہ جو شخص کچھ علم رکھتا ہو اس سے مخفی نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کے کئی مناقب ومحامد بیان کئے ہیں۔

سید قطب کی انہیں مباحث نے مودودی صاحب کو "خلافت وملوکیت" میں ہفوات بکنے پر جری کر دیا، سید قطب کی ان مباحث نے مجھے موصوف کی تفسیری مباحث کے متعلق غیر مطمئن کر دیا ہے اور باوجود اس کے کہ ادبائے زمانہ نوجوان موصوف سید قطب کے خوب عاشق اور ان کی تحریرات کے دلدادہ ہیں، مجھے موصوف کی تحقیقات پر بھروسہ اور اعتماد نہیں ہے۔

تفسیر قرآن کا معاملہ واقعی انتہائی نازک معاملہ ہے اور کافی صعوبت آمیز بھی، جس کے حقوق ہر شخص ادا نہیں کرسکتا ہے۔ سید قطب کی تفسیر کے متعلق جو کچھ میں نے گذارشات ماقبل سطور میں قلم بند کیں، یہ دینی وظیفہ ہے جو مجھ پر لازم تھا، اس کو میں نے ادا کیا ہے۔

ورنہ سید قطبؒ کی ان کوششوں اور کاوشوں کا جو انہوں نے ایک پر امن اور صالح معاشرے کے قیام کے لئے اخلاص سے فرمائیں اور پھر نتیجۃً شکست وخیبت کے آلام برداشت کئے، حتی کہ اپنی جان کا نذرانہ تک پیش کر دیا، ان تمام تر کوششوں کا میں انتہائی قدردان ہوں، اللہ تعالیٰ ان کو ان کی ان خدمات کا اور اپنی جان کو راہ حق میں قربان کرنے پر بھرپور صلہ وجزا نصیب فرمائے۔ واللہ الموفق.

قرآن کریم کی مختلف وجوہ اعجاز
جن کے ذریعے اقوام وامم کو چیلنج کیا گیا

گذشتہ سطور میں ذکرکردہ مباحث کی وجہ سے میں اپنے مقصد بحث سے بہت دور نکل گیا تھا اور اب اپنے مقصود و مطلوب کی جانب عود کرتا ہوں اور مقصد بحث سے اعتناء کرنا پسندیدہ بھی ہے، قرآن کریم کی وجوہِ اعجاز کے متعلق بحث میرا اہم ترین موضوع ہے، بلکہ یہ موضوع گذشتہ مباحث میں ذکرکردہ تمام موضوعات کی گویا روح اور اصل ہے۔

چنانچہ جان لینا چاہئے کہ گذشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہوئی کہ قرآن کریم کی تفاسیر مختلف جہات سے تحریر کی گئی ہیں اور بعض مفسرین نے ان مختلف جہات میں سے ایک حصہ کو لے کر اپنے زمانہ واحوال کے مطابق اس سے متعلق تفسیر تالیف کی ہے۔ بلاشبہ قرآن کریم وہ عالی مرتبہ معجزۂ خداوندی ہے جس کا اعجاز ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہے گا۔ ہر زمانہ کے بڑے بڑے خطباء اور فصحاء عرب کو قرآن کریم کے ذریعہ چیلنج کیا گیا اور انہیں قرآن کریم کے مقابلہ ومجادلہ کی دعوت دی گئی چاہے وہ انسان ہوں یا جنات، لیکن ان کے بلند گو ادباء گونگے ہوگئے اور ان کے ادب کی برق انگیزیاں گم ہوگئیں، اور یہ بات تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ فصاحت وبلاغت میں عرب کے باشندے کتنا بلند مقام رکھتے تھے، ان کے عجیب عجیب قصائد رجزیہ اشعار، مختصر ومفصل مختلف قسم کے خطبات، گرجتے مسجع کلام، منظم ومرتب نظمیں اور دلنشین نثری کلام موجود ہے، مگر پھر بھی وہ عاجز اور رسوا ہوئے اور ان کی تمنائیں ختم ہوگئیں اور انہوں نے قرآن پر عملی قولی اور اعتقادی پختہ یقین کرلیا اور ان کا عجز اس قدر ظاہر و باہر ہو رہا کہ کوئی صاحب فہم وفراست اس میں ہرگز شک نہیں کرسکتا۔

قرآن کریم کی مثال اس بلند گو خطیب کی سی ہے جو برسرِعام اپنے حسن نظم ونسق کا

اعلان کرے اور اپنے عمدہ ضبط ووصف کو آشکارا کرے، اسی طرح یہ قرآن حکماء اور فلسفیوں کے سامنے بانگ دہل نظام دنیا کی اصطلاح کے مطابق قوانین' تہذیب اخلاق کے دستور' ارتقاء وترقی کے رموز واشارات' سیاست شرعی اور ادارت وامارت کی روح' بہترین حکمت ونصیحت سے لوگوں کو دعوتِ حق کی صدا دیتا ہے اور مختلف پیرایوں میں ایسے قطعی دلائل پیش کرتا ہے جس کے بیان کرنے کو فلسفی ودانشمند محال یا مستبعد خیال کرتے ہوں، تاکہ ان حکماء اور فلسفیوں کے سینے ٹھنڈے ہوں اور اگر وہ اپنی عقل کو نظر غائر اور منصفانہ غور وتدبر کرنے کے لئے آزاد کردیں اور ہر قسم کی سرکشی والحاد اور حسد وعناد سے اپنے سینوں کو مبرا ومنزہ کرلیں تو وہ باآسانی ان دلائل سے طمانینت نفس پا سکتے ہیں۔

بے شک دنیوی علوم وفنون جس قدر ترقی پذیر ہو رہے ہیں، خداوند تعالیٰ کی اس عظیم الشان کتاب کے عجائبات اسی قدر صفحات عالم پر روشن سے روشن تر ہوتے جا رہے ہیں۔ نیز قرآن کریم کے ذوقی ووجدانی اور برہانی ویقینی کیفیات کے عجائب وغرائب صفحات عالم پر ثبت ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم ہمیشہ ہمیشہ اپنی صفت اعجاز پر برقرار رہے گا، نہ کبھی پرانا ہوگا نہ بوسیدہ، اور قیامت تک یوں ہی معجز رہے گا۔ راقم نے حضور پاک ﷺ کی شان اقدس میں ایک نعتیہ قصیدہ لکھا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

محمد جاء بالقرآن معجزة دامت لنا روضةً مخضرةً أنفا

أحكامه الغر أضحت للأنام هدى آياته أنجم تهدى الورى طرفا

ألفاظه نسقت در منضدة دقت لطائفه لا ترتجى لطفا

كالنجم إذلمعت والشمس إذسطعت والعين إذ نبعت والصوب إذ وطفا

فاقت حقائقه راقت دقائقه يهديك نورا مبينا للقلوب شفا

فاحت حدائقه ساحت عجائبه صوب درور كموج البحر مانشفا

بحر عظيم إذا ما غصته نظراً يجديك دراً ثميناً غالياً تحفا

فاقت بلاغته أعلى ذرى قلل حار العقول هنا عن كنهها رهفا

ترجمہ: ۱- محمد ﷺ قرآنی معجزہ کے ہمراہ تشریف لائے جو ہمارے لئے روشن باغ و بہاراں کے مانند ہے۔

۲- قرآن کریم کے واضح احکامات خلق خداوند کے لئے راہنمائی کا ذریعہ ہیں اور اس کی آیات گویا ستارے ہیں، جن سے انسان راہ یابی پاتا ہے۔

۳- الفاظ قرآن بہترین نظم وترتیب پر پروئے موتیوں کے مانند ہیں اور قرآنی لطائف و معارف اتنے دقیق ہیں جن کے لطف و باریکی کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں۔

۴- گویا قرآن کریم چمکتا چاند ہے اور ابھرتا روشن سورج اور بہتا چشمہ اور خوب برستی بارش۔

۵- حقائق قرآنی خوب بلند و بالا ہیں اور قرآنی دقائق خوشنما وخوش اسلوب ہیں جو تجھ کو واضح نور کی طرف راہنمائی کرتے ہیں اور دلوں کے لئے شفایابی کا باعث ہیں۔

۶- قرآن کریم کے روحانی ومعنوی باغات کی خوشبو خوب مہکتی ہے اور اس کے عجائبات وسیع تر ہوتے جارہے ہیں، گویا ایسی زوردار برستی بارش ہے کہ جو سمندر کی موجوں کی مانند کبھی خشک نہ ہوگی۔

۷- ایسا وسیع سمندر ہے کہ جب کبھی غور وتدبر کے ذریعے تو اس میں غوطہ زن ہوگا تو تجھ کو قیمتی لعل و جواہر کے تحفے عنایت کرے گا۔

۸- اسکی بلاغت وطلاقت بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں کو پہنچ گئی ہے، جہاں پہنچ کر عقول اپنی کمزوری کی بناء پر اس بلاغت کے حقائق کے بارے میں متحیر ومتردد ہو رہے ہیں۔

گذشتہ مقدمہ کے بعد اب سب سے اول یہ جان لینا چاہئے کہ قرآن کریم کا اعجاز درحقیقت کس جہت سے تھا؟ جس کی بناء پر وہ خدا تعالیٰ کی حجت بالغہ اور معجزۂ ناطقہ بن کر اپنے زمانہ کے شہسوارانِ فصاحت و بلاغت اور راہیان طلاقت وطلاوت پر غالب ہوکر رہا، قاضی ابوبکر باقلانیؒ "إعجاز القرآن" ص:۱۰ مطبوعہ مکتبہ سلفیہ پر تحریر فرماتے ہیں:

وقد كان يجوز أن يقع ممن عمل الكتب النافعة في
معاني القرآن وتكلم في فوائد من أهل العربية

وغيرهم من أهل صناعة الكلام أن يبسطوا القول في
الإبانة عن وجه معجزته ، والدلالة على مكانه ، فهو
أحق بكثير مما صنفوا فيه من القول فى الجزء.......
ودقيق الكلام في الأعراض ، وكثير من بديع
الإعراب وغامض النحو.

فالحاجة إلى هذا أمس ، والاشتغال به أوجب ، وقد
قصر بعضهم في هذه المسألة حتى أدى ذلك إلى تحول
قوم منهم إلى مذاهب البراهمة فيها ، ورأوا أنّ عجز
أصحابهم عن نصرة هذه المعجزة يوجب أن لا
يستنصر فيها ، ولا وجه لها حين رأوهم قد برعوا في
لطيف ما أبدعوا ، وانتهوا إلى الغاية فيما أحدثوا
ووضعوا، ثم رأو ما صنفوا في هذا المعنى غير كامل في
بابه، ولا مستوفى في وجهه، قد أخل بتهذيب طرقه،
وأهمل ترتيب بيانه.

''صنعت کلام عرب (عربی گرامر) کے ماہرین علمائے عرب وعجم نے جس قدر معانی قرآن کے متعلق مفید کتب تحریر فرمائیں اور مختلف فوائد قرآنی کے متعلق اپنی کاوشیں فرمائیں، اس سے کہیں بڑھ کر اس بات کی ضرورت تھی کہ قرآن کریم کی وجہ اعجاز اور اس کے بلند مرتبہ ومقام کو واضح کرتے اور اس کے متعلق ابحاث تحریر کرتے۔ نحوی واعرابی تراکیب کی دقیق ابحاث اور جزء لایتجزیٰ وغیرہ مختلف اعراض کے متعلق جو دقیق نکتہ سنجیوں پر مشتمل کتب علمائے کلام نے تحریر فرمائیں، اس سے بڑھ کر ''اعجاز القرآن'' کا موضوع اس قدر مباحث کا حقدار تھا وجوہ اعجاز کو بیان کرنے کی حاجت اور اس کے متعلق فوائد ومقاصد کے استخراج واستنباط میں اشتغال، دیگر فنی ابحاث سے کہیں برتر وبالا ہے۔

بعض علمائے کرام کی اس قدر اس موضوع کے متعلق کوتاہی کی بناء پر ایک قوم فرقہ براہمہ کے نظریہ وعقیدہ کی جانب مائل ہوگئی اور یہ رائے قائم کرلی کہ دراصل قرآن کی کوئی وجہ اعجاز

قابل بیان والتفات ہے ہی نہیں، یہ نظریہ اس قوم نے اس وقت قائم کیا جب انہوں نے علمائے عرب کی دقیق فنی نکتہ سنجیوں اور مختلف علوم وفنون کے متعلق کاوشوں کو دیکھا اور پھر اس موضوع کے متعلق لکھی جانے والی کتب پر نظر کی تو ان تصنیفات کو ناقص اور وجہ اعجاز کے بیان سے قاصر پایا اور طرق اعجاز کے بیان اور ان تصنیفات کے مباحث کی ترتیب کو مخل فہم، بلکہ مہمل و بے فائدہ دیکھا''۔الخ

''اعجاز قرآنی'' کے متعلق لکھی جانے والی کتب

''اعجاز القرآن'' وہ موضوع ہے جس کے متعلق قدیماً وحدیثاً مستقل کتب لکھی گئیں، میرے علم کے مطابق (یا جہاں تک مجھے معلوم ہے) اس موضوع کے متعلق سب سے پہلے ابوعثمان جاحظ متوفی: ۲۵۵ھ نے کتاب تصنیف کی جو "البیان والتبیین"، "الحیوان"، "البخلاء" وغیرہ کئی ادبی قابل قدر کتب کے مؤلف ہیں، اس کتاب کا نام "نظم القرآن" ہے، قاضی ابوبکرؒ نے "اعجاز القرآن" میں اس کتاب "نظم القرآن" کا ان الفاظ میں تعارف پیش کیا ہے:

> ''جاحظ نے بھی نظم قرآنی کے متعلق ایک کتاب تحریر کی، جس میں فقط وہی مباحث ذکر کئے جو متقدمین' متکلمین علماء نے بیان کئے تھے۔ اور اس موضوع کے متعلق جو مختلف آراء ونظریات میں اختلاط والتباس واقع ہوا ہے، اس کی وضاحت نہ کی''، الخ۔

امام باقلانیؒ کے بیان کردہ اس مبحث پر ہم اس طرح نکتہ چینی تو نہ کریں گے، جس طرح فاضل رافعی نے جو مشہور عربی ادیب ہیں نکتہ چینی کی ہے، لیکن بہرحال جاحظ کی طرف سے یوں معذرت کریں گے کہ جاحظ اس موضوع کے متعلق سب سے پہلے لکھنے والے ہیں اور ان کو اس موضوع کے متعلق تصنیف کرنے میں تقدم کی فضیلت بہرحال حاصل ہوئی ہے۔

بعدازاں! شیخ ابوعبداللہ واسطی معتزلی متوفی: ۳۰۶ھ نے اس موضوع کے متعلق ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام "إعجاز القرآن في نظمه وتاليفه" رکھا۔صاحب

"کشف الظنون" اور ابن الندیم (صاحب "الفہرست") دونوں حضرات نے اس کتاب کا تذکرہ فرمایا ہے، لیکن راقم اب تک اس کتاب پر مطلع نہ ہوسکا ہے، صاحب "اسرار البلاغة" اور "دلائل الاعجاز" شیخ عبدالقاہر جرجانی متوفی: ۴۷۴ھ نے اس کتاب کی دو شرحیں تصنیف فرمائیں، جن میں سے مفصل اور ضخیم شرح کا نام "المعتضد" ہے اور دوسری مختصر شرح کا نام راقم کو معلوم نہیں ہے۔ علامہ جرجانیؒ نے اس کی شرح تالیف فرمائی، یہی اس کتاب کی فضیلت وشرفیابی کے لئے کافی ہے، ان حضرات کے بعد ابوالحسن علی بن عیسیٰ الرمانی متوفی ۳۸۲ھ نے "اعجاز القرآن" کے متعلق تقریباً تیس صفحات پر حاوی ایک مختصر رسالہ بنام "اعجاز القرآن" تصنیف فرمایا، یہ رسالہ حال ہی میں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی (ہند) سے طبع ہوا ہے۔ راقم الحروف نے اس رسالہ کا مطالعہ کیا ہے۔

فی زمانہ جبکہ علم بلاغت ومعانی میں لکھی گئی کتب کی بہتات ہے، اس کے پیش نظر اس رسالہ کا کچھ خصوصی مقابلہ ومعیار شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ علامہ رافعیؒ کو اس رسالہ کے مصنفؒ کے بارے میں مغالطہ ہوا ہے اور انہوں نے مصنف کا نام ''ابوعیسیٰ الرمانی'' ذکر کیا ہے، لیکن درست نام ابوعیسیٰ کے بجائے ابن عیسیٰ ہے، ابن الندیم اور ابن خلکان وغیرہ علماء نے یوں ہی ذکر کیا ہے۔

بعد ازاں شیخ ابوبکر الباقلانیؒ (متوفی: ۴۰۳ھ) نے جو مشہور محقق ومتکلم شیخ السنۃ، لسان الامۃ اور گویا علم کے بحر بیکراں تھے "إعجاز القرآن" کے نام سے مشہور کتاب تصنیف فرمائی۔ شیخ رافعیؒ نے اگرچہ موصوف باقلانیؒ کی اس کتاب کی مدح وستائش کی ہے لیکن ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ اس کتاب پر طعنہ زنی بھی کی ہے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ اس کتاب کا بے شک تمام امت پر بڑا احسان ہے، خصوصاً شیخ رافعیؒ پر اس لئے کہ علامہ باقلانیؒ نے ہی تو "إعجاز القرآن" کے متعلق دلائل پیش فرمائے، طریق استدلال کو واضح کیا ہے اور امت کے لئے وجوہ اعجاز کو سمجھنے کا راستہ آشکارا کیا ہے، اس کتاب کو تصنیف ہوئے آج ہزار سال کا طویل عرصہ گذر چکا ہے، لیکن یہ کتاب اب تک تروتازہ

معلوم ہوتی ہے اور آج جبکہ اس موضوع کے متعلق کئی کتب اور علوم وضع ہو چکے ہیں، علمائے زمانہ بھی اس کتاب سے مستغنی نہیں ہو سکتے ہیں، پھر اس زمانہ میں جب کہ مختلف علوم وفنون کو اس حد تک ترقی وترویج حاصل نہ تھی، آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ کتاب کس حد تک نافع ثابت ہوگی۔

خاص طور پر اس زمانہ میں علوم بلاغت جس کے نقص وعیب کا ازالہ اور بلاغت وفصاحت سے متعلق اصول وضوابط کی ترتیب وتدوین کو اس فن بلاغت کے امام شیخ عبد القاہر جرجانیؒ نے مکمل فرمایا، ان علوم کو خاطر خواہ رواج حاصل نہ تھا اور وجوہ اعجاز کا فن تو اب تک ظاہر بھی نہ ہوا تھا، پھر کیسے اس کے متعلق علامہ باقلانیؒ نے اتنی قابل قدر مباحث تحریر فرمائیں (واقعی یہ ایک بڑا احسان تھا) اسی بناء پر تمام علماء نے تقریباً اس کتاب کی ایسی عبارات میں تعریف وتوصیف فرمائی ہے کہ قدم وقلم جھوم جھوم جاتے ہیں اور عقول وافہام عش عش کر اٹھتے ہیں۔

صاحب "الاتقان" اور صاحب "کشف الظنون" وغیرہ حضرات نے ذکر فرمایا کہ مشہور محدث امام احمد بن محمد الخطابی البستی الشافعی (متوفی ۳۸۸ھ) نے بھی جو "معالم السنن" کے مصنف ہیں اس موضوع میں ایک کتاب تصنیف کی۔ ابن سراقہ اور رؤیانی (جو شاید ابو المحاسن الرؤیانی ہی ہیں) (متوفی: ۵۰۶ھ) جو اکابر علمائے شوافع میں سے ہیں اور "بحر المذهب"، "مناصيص الشافعية" وغیرہ کے مصنف ہیں، انہوں نے بھی اس موضوع کے متعلق تالیف فرمائی' بعد ازاں امام رازی متوفی: ۶۰۶ھ ابن ابی الاصبع متوفی: ۶۵۴' شیخ زملکانی متوفی: ۷۲۷ھ نے بھی اس موضوع کے متعلق کاوشیں صرف کیں، ممکن ہے کہ آخر الذکر علماء کی تصنیف جیسا کہ امام رافعیؒ نے تحریر فرمایا، ایک دوسرے کی شرح اور متقدمین کی تحقیقات سے مستفاد تھیں۔

ممکن ہے کہ ان مختلف کتب میں مختلف خوشنما اسلوب وطرز پر اور واضح تعبیرات، نیز وجوہ اعجاز کو واضح تر خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ لیکن افسوس کہ امت نے ان کتب میں پھیلے بیش بہا معادن وخزائن سے قابل قدر فائدہ نہ اٹھایا، شاید کہ اب خدا تعالیٰ کوئی معاملہ پیدا فرمادیں (کہ لوگ ان کتب سے نفع مند ہوں)۔

ابن الندیم نے "الفهرست" میں ان مذکورہ کتب کے علاوہ دو اور کتابوں کا ذکر کیا ہے، ایک ابن اخشیدؒ کی "نظم القرآن" اور دوسری ابوعلی حسن بن علی بن نصرؒ کی "نظم القرآن" نیز علامہ قاسم بن فیرۃ شاطبی شافعیؒ کا رسالہ "اعجاز القرآن" اور مطرزیؒ کے رسالہ "اعجاز القرآن" کا بھی تذکرہ فرمایا ہے۔

متقدمین ومتاخرین علماء میں سے جن علمائے کرام نے اس موضوع کے متعلق جو کتب تحریر فرمائیں وہ میرے علم کے متعلق دس سے کچھ اوپر تھیں جو میں نے ذکر کر دیں بعد ازاں صدیاں گذرنے کے بعد ان متقدمین ائمہ کرام کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد مصر کے نابغۂ روزگار اور معاصر علمائے ادب میں لائق تحسین شخصیت، فاضل ادیب مصطفی صادق رافعی مرحوم نے جو بلاشبہ رواں صدی کے ادباء میں سرفہرست ہیں اس میدان میں قدم رکھا اور ایک کتاب بنام "اعجاز القرآن" لکھی جس میں آج کل کے بہترین مروجہ ادبی اسلوب کی رعایت رکھی۔ چنانچہ متقدمین علماء نے جو مباحث اجمالی طور پر بیان فرمائی تھیں موصوف نے ان کی تفصیل وتوضیح کی اور جن مباحث کی طرف متقدمین علماء نے اشارے فرمائے تھے ان کو نمایاں فرمایا، نیز موجودہ زمانہ میں ارتقاء پذیر علمی وفنی ابحاث اور ان کے مطابق اعجاز قرآنی کے پہلوؤں کو آشکارا فرمایا اور مختلف لطائف ونکات جو متقدمین کی کتب میں موجود تھے ان کو واضح انداز میں تحریر فرمادیا لیکن یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ موصوف کی طبیعت جیسا کہ انہوں نے باقلانیؒ کے بارے میں فرمایا علامہ باقلانیؒ کی طبیعت ہی کے مانند تھی کہ:

"وہ اپنی عبارات میں حیلہ سازی اور تفنن کو راہ دیتے ہیں اور مختلف ابحاث میں کئی بعید پہلوؤں کے متعلق بحث کرتے ہیں اور اپنی تحریر میں عمدہ اسلوب بیان پر مکمل قدرت میں نیز قابل قدر مباحث کے متعلق بصیرت افروز تصرفات میں جاحظ اور اس کے ادبی مقلد ابن عمید کی راہوں کے راہرو ہیں" الخ

فاضل رافعیؒ بھی جاحظ کا اسلوب بیان رکھتے ہیں، تحریر وتقریر کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتے ہیں اور میدان تحریر میں ان کا قلم جب حرکت کرتا ہے تو گویا خوب رقص وطرب کے مناظر

دکھلاتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ قاری کو بلاغت قرآنی سے روشناس کرنے سے قبل اپنی بلاغت کا قدردان بنانا چاہتے ہیں ان کی عبارت کی انتہائی سلاست وسلاست کبھی کبھی ان کے مقصود کلام کو داغدار کردیتی ہے۔

موصوف رافعیؒ نے اپنی اس کتاب میں ابن الاثیر کی "المثل السائر" سے خوب استفادہ کیا ہے لیکن اس کی تصریح نہیں فرمائی ہے، بہرحال میں موصوف کے ادبی فضل وکمال کا ہرگز انکار نہیں کرسکتا ہوں اوران کے اسلوب تحریر وانشاء کی جو قلوب میں وقعت ومنزلت ہے اس کا بھی میں ہرگز منکر نہیں ہوں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ کوئی معاصر ادیب ہمت فرما کر اس کتاب کی اس کے حجم کے مقابلہ میں ایک تہائی میں تلخیص واختصار پیش کردے اور تہائی بھی بہت نافع ہوگا اور پھر اس تلخیص کو علوم بلاغت کے نصاب میں موجود کتب میں شامل کردیا جائے تو طالبین بلاغت کے لئے انتہائی نفع مند ثابت ہوگی ان شاء اللہ۔اس موضوع "اعجاز القرآن" کے متعلق گذشتہ مؤلفات کے علاوہ جو محض اس موضوع کے متعلق بحث کرتی ہیں امت محمدیہ ﷺ کے کبار علماء نے جو منتشر لعل جواہر بکھیرے ہیں ان کو اگر اکٹھا کردیا جائے تو علم بلاغت کے گلے کے لئے ایک قیمتی ہار تیار ہوجائے گا اور وہ تالیف ادب عربی کی کتب میں نمایاں مقام ومرتبہ حاصل کریگی۔

ان دیگر کتب میں شیخ جرجانیؒ کی دوگرانقدر تالیفات "اسرار البلاغة" اور "دلائل الإعجاز" قابل بیان ہیں، مختلف مباحث کے ضمن میں علامہ جرجانیؒ نے "اعجاز القرآن" کے متعلق بیش بہا فوائد ذکر فرمائے ہیں ،اسی طرح امیر یمانیؒ نے اپنی کتاب "الطراز" امام رازیؒ نے "نهاية الايجاز" میں ایسے کئی فوائد ذکر کئے ہیں امام رازیؒ کی "نهاية الايجاز" اگرچہ شیخ جرجانیؒ کی ان دو کتب کا خلاصہ ہی ہیں جن کا گذشتہ سطور میں ذکر کیا گیا،لیکن اس کو اختصار وتلخیص کہنا ہی گویا مجاز ہے۔

انہی علماء کرام کے مانند ابن قیم الجوزیہؒ نے بھی "بدائع الفوائد"، مدارج السالكين" اور "كتاب الفوائد" نیز اپنی دیگر مؤلفات میں بھی قرآنی اعجاز کے متعلق مختلف لطائف ونکات تحریر فرمائے ہیں۔

مزید یہ کہ اکثر متاخرین مفسرین نے ان مباحث کی تفسیر جن میں صاحب "الکشاف" علامہ زمخشریؒ جو مفسرین میں نمایاں مرتبت ومنزلت رکھتے ہیں، گویا بلند وبالا مینار کے روشن چراغ ہیں، اسی طرح امام رازیؒ نے "التفسیر الکبیر" میں ابن اثیرؒ نے "المثل السائر" میں، ابوسعودؒ نے اپنی تفسیر "ارشاد العقل السلیم" میں اور علامہ آلوسیؒ نے "روح المعانی" اور دیگر ماہرین علوم وفنون اور ادبی شغف رکھنے والے علماء متقدمین نے اعجاز القرآن کے موضوع کے متعلق گرانقدر معارف ذکر کئے ہیں۔

قرآن کریم کی وجہ اعجاز کا بیان

جان لینا چاہئے کہ حضرات علمائے بلاغت نے قرآن کریم کی مختلف وجوہ اعجاز ذکر فرمائی ہیں، جن میں سے اکثر صحیح ہیں، اگرچہ ان وجوہ کے مراتب میں تفاوت ہے۔ میرے نزدیک سب سے باطل وجہ اعجاز وہ ہے جو نظام معتزلی نے بتلائی ہے، وہ کہتا ہے کہ:

> "قرآنی اعجاز بوجہ "صرفۃ" کے تھا یعنی اللہ تعالیٰ نے فصحائے عرب کی مقدرت معارضہ قرآنی کو سلب فرمالیا تھا اور ان کی عقول کو اس کے مقابلہ سے کوتاہ کر دیا تھا، اگرچہ فی ذاتہ اس کا معارضہ ممکن تھا لیکن اس خارجی مانع نے ان کو اس معارضہ ومجادلہ سے پابند کر دیا اور اسی وجہ سے قرآن کریم معجز ٹھہرا۔"

نظام معتزلی کی اس رائے کا فساد کسی تنبیہ کا محتاج نہیں، اس لئے کہ اس قول کے کئی مفاسد ہیں جو نمایاں ہیں، قاضی عیاض مالکیؒ نے بیان کردہ مختلف وجوہ صحیحہ کو چار انواع میں تقسیم فرمایا ہے:

نوع اول: قرآن کریم کی حسن تالیف وتنظیم، کلمات قرآنی کا ربط وتعلق، فصاحت بیان سے متعلقہ وجوہ اعجاز اور عرب کے شہسواران بلاغت کی عادت کے متناقض ومتباین متحیر العقول بلاغت۔ اس نوع کا خلاصہ یوں ہوا کہ بعض وجوہ صحیحہ قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت کے پیش نظر بیان کی گئیں ہیں۔

نوع ثانی: تدوین وتنظیم کی انوکھی صورت، اسالیب عرب کے مخالف نرالا اسلوبِ کلام۔
نوع ثالث: غیب کی خبریں اور آئندہ کی پیشین گوئیاں جو محقق ثابت ہو کر رہیں۔
نوع رابع: گذشتہ صدیوں میں ہلاک شدہ اقوام وامم، اور وہ شرائع جن کے آثار مٹ چکے تھے ان کے متعلق خبر دینا، باوجودیکہ جس پر یہ نازل ہوا وہ امی محض تھے انہوں نے لکھا پڑھا کچھ نہ تھا، اور یہ ایسے قصص تھے جن میں فقط ایک قصہ کا علم بھی صرف اسی چنیدہ اہل کتاب کے عالم کو حاصل ہو سکتا تھا جس نے ساری عمر تعلیم وتعلم میں گذار دی ہو۔

پھر قاضی عیاضؒ نے ان چاروں وجوہ اعجاز کی ایسی تفصیل وتوضیح فرمائی ہے جو قلوب کے لئے سامان شفا ہے اور آنکھوں کو جلا بخشتی ہے۔ موصوف کی ذکر کردہ تمام تفصیلی مباحث بالکل درست ہیں، راقم کی رائے تو ابن سراقہ کی کہی اس بات کے موافق ہے کہ: ''مفسرین علمائے کرام ان وجوہ اعجاز کے عشر عشیر کو بھی دریافت نہیں کر سکے۔''

میں کہتا ہوں کہ: قرآن کریم کی منجملہ وجوہ اعجاز کے یہ بھی ہے کہ وجوہ اعجاز کبھی بھی ختم نہ ہو سکیں گی، بلکہ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا رہے گا ان وجوہ اعجاز میں مسلسل اضافہ ہوتا ہی رہے گا، اور وہ وجوہ اعجاز ظاہر ہوں گی جو گذشتہ زمانوں میں آشکارا نہ ہوئی ہوں گی۔

كالبدر من حيث التفت رأيته
يهدى إلى عينيك نورا ثاقبا

ترجمہ:۔ ''جیسا کہ چمکتا چاند جہاں کو تو رخ کرلے تو اس کو دیکھے گا کہ تیری آنکھوں کو وہ چمکتا نور دکھلائے گا۔''

كالشمس فى كبد السماء وضوءها
يغشى البلاد مشارقا ومغاربا

ترجمہ:۔ ''جیسا کہ آسمان کے وسط میں چمکتا آفتاب، جس کی روشنی نے مشارق ومغارب کے شہروں کو ڈھانپ لیا ہو۔''

لیکن جس وجہ اعجاز کے ذریعے عرب کے بلغاء وخطباء کو چیلنج کیا گیا تھا اور جس کے مقابلے ومعارضے کی ان کے شہسواران ادب وبیان اور شعراء کو دعوت دی گئی تھی وہ قرآن کریم کی

بلاغت وفصاحت سے بھرپورنرالی عبارات اوراس کالطافت وسلاست آمیز اسلوب ہے، اس لئے کہ وہ لغت عرب میں فصیحانہ شان رکھتے تھے اور خطبہ و بیان کے ماہر تھے، اس فصاحت و بلاغت کو وہ اپنی ذوقی اور وجدانی کیفیات کی بناء پر خوب پہنچانتے تھے اور میدان فصاحت میں معرفت کا مرتبہ رکھتے تھے، ان کو اس بلاغت کے متعلق کسی قسم کا شبہ والتباس اور شائبہ وسوسہ نہ کھٹکتا تھا، یہی وہ وجہ تھی جس کی بناء پر ان کو چیلنج کیا گیا تھا۔ جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔ ابن عطیہؒ فرماتے ہیں کہ:

''صحیح تر وجہ جس پر جمہور ماہرین علماء کا اتفاق ہے یہ کہ قرآن کریم کی حقیقی وجہ اعجاز، قرآنی نظم و بیان، معانی ومفاہیم کی درستگی اور کلمات قرآنی کی پے در پے فصاحت وبلاغت ہے۔''

چنانچہ جب وجہ اعجاز قرآنی کے معاملہ کا مدار فصاحتِ عبارت اور بلاغتِ نظم پر ہے تو اب میدان کار وسیع ہے اور مجال بحث خوب کشادہ ہے اور قرآن مجید کی خدمت کے لئے سب سے لائق اسی جہت اعجاز سے بحث کرنا معلوم ہوتا ہے، لیکن اس جہت اعجاز کو مضبوط ومنظم طور پر بیان کرنا - جیسا کہ قاضی باقلانیؒ نے فرمایا - ان علوم وفنون میں تقدم وتفوق کے بعد حاصل ہوگا جو لائقِ التفات، قابلِ قدر، تنگ راہ اور لطیف ماخذ کے حامل ہیں۔

اسی بناء پر اس وجہ اعجاز کی درست معرفت امت مرحومہ کے چنیدہ خواص ہی کو حاصل ہوئی ہے، بلکہ ایک مشہور کہاوت ومثل زبان زد ہو چکی ہے کہ:

"لم يدر إعجاز القرآن إلا الأعرجان"

ترجمہ: ''قرآن کریم کی وجوہ اعجاز صرف دو اپاہج شخصوں کو ہے۔''

ان دونوں شخصیات سے مراد صاحب ''دلائل الاعجاز'' علامہ عبد القاہر جرجانیؒ اور صاحب تفسیر ''الکشاف'' علامہ جار اللہ محمود زمخشریؒ ہیں، اس مقولہ کے ساتھ ہمارے شیخ امام العصر حضرت استاذ محمد انور شاہ کشمیریؒ نے ایک مزید جملہ تعلیق فرمایا ہے، انہوں نے فرمایا:

"أحدهما من زمخشر والآخر من جرجان"

ترجمہ: ''ان دونوں میں سے ایک زمخشر سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے

جرجان سے۔"

اوران جیسے علماء کی کمیابی اسی وجہ سے ہے کہ وجہ اعجاز کے متعلق بحث وتمحیص کا معاملہ بڑا پرخطر اور عظیم القدر ہے اور اس تک پہنچنا دشوار بھی ہے، اور کیونکر نہ ہو جبکہ علامہ باقلانیؒ نے اپنی کتاب میں اصمعیؒ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ:

"فرسان الشعراء أقل من فرسان الحرب"

ترجمہ:۔ "شہسواران شعروبیان شہسواران جنگ سے کم ہیں۔"

اورابوعمرو بن العلاء سے یہ قول نقل فرمایا ہے کہ:

"العلماء بالشعر أعز من الكبيريت الاحمر"

ترجمہ:۔ "شعروبیان سے واقف کارعلماء کبریت احمر سے بھی زیادہ نایاں ہیں۔"

باقلانیؒ فرماتے ہیں کہ:

إذا كان الكلام المتعارف المتداول بين الناس يشق تمييزه، و يصعب نقده، و يذهب عن محاسنه الكبير، و ينظرون إلى كثير من قبيحه بعين الحسن، و كثير من حسنه بعين القبح، ثم يختلفون في الأحسن منه اختلافا كثيرا، وتتباين آراءهم في تفضيل ما تفضل منه، فكيف لا يتحيرون فيما لا يحيط به علمهم، ولا يتأتى في مقدورهم، ولا يمثل بخواطرهم.

"جب ایک متعارف ومتداول کلام میں درست وغلط کی تمیز اوراس پر نقد ونظر مشکل ہوتا ہے اور یہاں بہت سے ناقدین وتبصرہ نگار اس کے محاسن کے ادراک سے درماندہ وعاجز ٹھہرتے ہیں، کبھی کلام کے قبح کو بنظر حسن دیکھتے ہیں اور کبھی کلام کے حسن کو بنظر قبیح ونقد دیکھتے ہیں۔ پھر مختلف عمدہ عبارات میں ترجیح کے معیار پر احسن فالاحسن کی تلاش میں خوب اختلاف ہوتا ہے اور عمدہ ترین کلام کی تعیین وتشخیص میں آراء متضاد

ہو جاتی ہیں، جب ایک عام متعارف کلام کا یہ حال ہوتا ہے تو پھر ایسے کلام
میں جس پر ان کا علم محیط نہ ہو، ان کی مقدرت بیانی عاجز اور ان کے خیال
وخاطر میں بھی اس جیسا کلام نہ آئے، اس کے متعلق کیونکر حیران
وسرگردان نہ ہوں گے...... الخ۔"

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور اعجاز قرآن

چونکہ ہمارے شیخ حضرت کشمیریؒ "مشکلات القرآن" کے حل میں اپنے زمانہ میں اپنی مثال آپ تھے اور گذشتہ صدیوں کے چنیدہ بزرگوار علماء کی نظیر تھے، اللہ رب العزت نے موصوف میں ایسی خصوصیات جمع فرمادی تھیں، جن کا ایک شخصیت میں اجتماع کمیاب تھا، اس لئے موصوف محترم بھی اعجاز القرآن کی خوب معرفت رکھتے تھے اور ان کا قلب ان وجوہ اعجاز کے متعلق خوب مطمئن تھا اور گذشتہ مقولہ "لم يدر إعجاز القرآن إلّا الأعرجان" کے ساتھ کبھی کبھی یوں فرمادیا کرتے تھے کہ میں، ان دو شخصیات کا تیسرا شخص ہوں اور فرمایا کرتے تھے کہ: نظم قرآنی کا اعجاز میرے لئے مشرق میں طلوع ہونے والے آفتاب سے زیادہ واضح ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، بلکہ سورج کا طلوع ہونا تو مشتبہ ہوسکتا ہے اس طور پر کہ جو ٹکیہ افق میں نمایاں ہورہی ہے وہ اس ٹکیہ کا پرتو اور عکس ہے، جیسا کہ جدید سائنسی تحقیق نے واضح کیا ہے کہ سورج کے اپنے حقیقی افق سے طلوع ہونے سے چند ساعات قبل جو ٹکیہ نظر آتی ہے وہ اس حقیقی ٹکیہ کا عکس ہوتا ہے۔

حضرت شیخ کشمیریؒ اس کو آسانی سے سمجھنے کے لئے ایک مثال دے کر سمجھایا کرتے تھے کہ نقرئی درہم کے ایک سکہ کو ایک ہنڈیا میں ڈال کر اتنے فاصلے پر رکھا جائے کہ وہ درہم نظر نہ آسکے پھر اس ہنڈیا کو پانی سے بھر دیا جائے تو درہم کا عکس آپ کو اس کی سطح پر نمایاں نظر آئے گا۔

بہر حال ممکن ہے کہ آفتاب کی ٹکیہ کے طلوع میں شک وشبہ کو دخل ہو لیکن قرآن کریم کا اعجاز اس قدر یقینی ہے کہ اس میں ذرہ بھر شک کی گنجائش نہیں اور اس قدر سینہ کو ٹھنڈا کرتا ہے کہ کسی قسم کی حیرت وسرگردانگی کو دخل نہیں ہوتا، دل اس اعجاز پر مطمئن ہوتا ہے اور آنکھیں فرحت وسرور

پاتی ہیں۔میرے نزدیک یہ اعجاز برتن کے شگاف اور سورج کے طلوع سے بھی زیادہ نمایاں وآشکارا ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ علوم بلاغت میں حضرت کشمیریؒ کی مہارت اور ان کا کمال بہت بلند مرتبہ ومقام رکھتا تھا، جس مرتبہ کی بلندی تک پہنچنا بہت دشوار ہے، بلاغت وفصاحت تو موصوفؒ کے رگ وپے میں بسی ہوئی تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ: بلاغت وفصاحت کو پہچاننے کے لئے اللہ رب العزت نے میرے دل میں ایک معیار ودیعت فرمارکھا ہے، میں اس معیار بلاغت کی پہچان میں کسی کا مقلد ومتبع نہیں ہوں اور مجھے بلاغت کلام کے متعلق ایسی بصیرت عطا فرمارکھی ہے جس سے میں مراتب بلاغت کا ادراک کرتا ہوں۔

بہت سی مرتبہ میں نے خود شیخ کو دیکھا کہ قرآنی تعبیر سے ان کو وجد ونشاط طاری ہوجاتا تھا اور اس طرح جھوم جایا کرتے تھے جس طرح چڑیا پر بارش کے قطریں پڑیں تو وہ جھوم جایا کرتی ہے۔شیخ محترم قرآن کی حلاوت وطراوت سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے اور اس طراوت کی تمازت ان کے قلب وروح میں اس طرح سرایت کرتی تھی جس طرح بدن میں روح سرایت کئے ہوئے ہے اور قرآنی تعبیر کی رونق اور چاشنی سے خوب متعجب ومتحیر ہوجایا کرتے تھے۔اور فرمایا کرتے تھے کہ: قرآن کریم کی تفسیر سے متعلق سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ قرآن کریم کی جلالت وجزالت شان کے تقاضے کو برقرار رکھتے ہوئے قرآن کریم کے مقصد ومطلب کو واضح کیا جائے۔ اس طور پر کہ اسکا معجز نظم وتعبیر اپنی فطری سادگی وخوش اسلوبی پر برقرار رکھا جائے اور ایسے مختلف تکلفات وتقدیرات نکالنے سے پرہیز کیا جائے جو قرآن کریم کی عمدہ معجز نظم کے مناقض ہیں، اس لئے کہ: قرآنی عبارات میں تکلفات برتنے اور تقدیری کلام نکالنے میں ان تعبیرات کو اس بلند وبالا مقام ومرتبہ سے گرانا لازم آتا ہے جس کے درپے کوئی منزل باقی نہیں رہی ہے، اور نہ اس کے بعد کوئی ہدفِ انتہاء ہوسکتی ہے۔

رتب تقصر الأمانی حسری
دونها ماوراءهن وراء

ترجمہ:۔’’ایسے مراتب ومنازل ہیں جن تک پہنچنے سے امیدیں حیرت زدہ ہیں اور جن

کے ورے کچھ باقی نہیں بچا ہے۔"

حضرت شیخ کشمیریؒ کی اس بات کی تائید علامہ زمخشریؒ کے اس تحریر فرمودہ بیان سے بھی ہوتی ہے کہ:

"عالی مرتبت کلام خداوندی اور کلام معجز کی تفسیر کرنے والے پر یہ لازم ہے کہ اس کے نظم وتعبیر کو وہ اس کے حسن پر باقی رکھتے ہوئے اس کی بلاغت کو یونہی کامل ومکمل برقرار رکھے اور جس نظم کے ذریعے تحدی واقع ہوئی ہے اس کو قدح وطعن سے سلامت رہنے دے۔"

بعض مفسرین نے یوں فرمایا ہے کہ:

"اس طرز وانداز کو (یعنی کلام اللہ کی نظم کو تکلفات، تقدیرات سے خالی کر کے غرض قرآنی کو بیان کرنا) مختلف پہلوؤں سے اچھی طرح جان لینا، اس مفسر کے لئے جو کلام اللہ کے عجائب پر مطلع ہونے کا خواہاں ہو، بے حد ضروری ہے۔ اس طرز وانداز کو جان لینا ہی فصاحت کا اہم ترین قاعدہ اور بلاغت کے ہار کا درمیانی قیمتی موتی ہے۔"

حضرت کشمیریؒ شیخ ابراہیم بن عمر بقاعیؒ متوفی ۸۸۵ھ (جو ابن حجر عسقلانیؒ کے اجلا ساتھیوں میں سے ہیں) کی تصنیف کردہ "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" کی بہت تعریف فرمایا کرتے تھے اور اس عالی مرتبت وجہ اعجاز "فصاحت و بلاغت" کے متعلق لکھی گئی معروف ومتداول تفاسیر پر اس کو فوقیت دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ:

"بشری وسعت وطاقت کے بقدر مصنف نے اس موضوع کا حق ادا کر دیا ہے"

حضرتؒ کی خواہش تھی کہ یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو جائے اور مکتبہ مصریہ کے حضرات نے اس کے عکس لینے کا بھی ارادہ فرما رکھا تھا، لیکن اس امید کے درمیان اجل مقررہ حائل ہوئی اور اس طبع کی اپنے دل میں حسرت لئے جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ حضرتؒ کی یہ تمنا اور

پھر آرزو برآری سے قبل آپ کی وفات اس شعر کی مصداق تھی:

و لم ینفق حتی مضی لسبیله

و کم حسرات فی بطون المقابر

ترجمہ:۔''اس شخص کی امید کے مطابق کوئی اتفاق نہ ہوسکا یہانتک کہ وہ اپنی منزل کو چلا گیا (یعنی وفات پا گیا) اور کتنی حسرتیں قبروں میں خاک بوس ہوگئیں۔''

اسی طرح ''ذوالقروح الملک الضلیل'' کے اس شعر کی مصداق بنی:

وما المرأ ما دامت حشاشة نفسه

بمدرك اطراف الخظوب َولا ال

ترجمہ:۔''جب تک ایک نفس خوش عیش اور مطمئن رہتا ہے تب تک وہ صاحب خوش نفس نہ حوادث زمانہ کی واقفیت رکھتا ہے اور نہ تجربہ کار بن سکتا ہے۔''

پروردگار عالم کا فرمان عالیشان ہے:

﴿أم للإنسان ما تمنّٰی فللّٰه الآخرة والأولیٰ﴾

اب میں قرآنی اعجاز، نظم قرآنی کی امتیازی حیثیت مختلف حادثات وسانحات کے بیان میں قرآنی آداب وخصوصیات اور قرآنی لطائف واسرار کے متعلق حضرت شیخ کشمیریؒ کی وہ چند ابحاث ذکر کئے دیتا ہوں جو میں نے شیخؒ سے براہ راست سنی یا بالواسطہ شیخؒ کے، ان علوم تک میری رسائی ہوئی، تاکہ گذشتہ سطور میں راقم کی شیخؒ کے متعلق تعریف وتوصیف کی واقعیت معلوم ہوجائے اور مشکلات القرآن کے موضوع کے متعلق اور دیگر قرآنی علوم ومعارف کے متعلق آپ کو حضرت شیخ کشمیریؒ کی عالی منزلت ومرتبت کا علم ہوجائے، اور جس کتاب پر مقدمہ تحریر کرنے کی راقم نے جسارت کی ہے، اس کتاب کی امتیازی قدر وحیثیت کی واقفیت حاصل ہوجائے، بعد ازاں آپ حضرت شیخؒ کی ذکر کردہ ابحاث کا علمائے امت کے اعجاز قرآنی کے متعلق مختلف اقوال اور دیگر قرآنی موضوعات کے متعلق علمائے اسلاف کی تصانیف اور ان کی پیش کردہ ابحاث سے تقابل کر لیجئے، جس سے آپ کے لئے مسائل قرآنی کا سمجھنا مزید آسان ہوجائے گا اور کئی اہم مسائل واضح ہوجائیں گے اور خوب بصیرت ومعرفت سے آپ حق وباطل اور صحیح وغیر صحیح کے

درمیان امتیاز کر سکیں گے۔

یہ موضوع (یعنی اعجاز قرآنی) ان تمام گذشتہ موضوعات میں سب سے اہم موضوع ہے، جن موضوعات قرآنی کے متعلق ماقبل میں راقم بحث رقم کر چکا ہے، اس لئے کہ یہ موضوع تنگ راہ' معنویت کے اعتبار سے لطیف اور انتہائی پوشیدہ حقیقت وحکمت رکھتا ہے، جس کے متعلق بحث کے لئے ادبی ذوق اور عقلی درایت کی بے حد ضرورت ہے، اور ساتھ ساتھ علوم بلاغت میں مہارت، خوب غور وخوض' فراغ قلبی اور باریک بین وباریک ادراک اور فکر وشعور کا حصول بھی ضروری ہے۔

لیکن حضرت کشمیریؒ کا کلام انتہائی بلیغ اور انتہائی موجز ہوا کرتا ہے، ابن اثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا:

> ''میں نے کسی بلیغ کو نہ پایا مگر یہ کہ اس کے کلام و بیان میں ایجاز واختصار ہوا کرتا ہے اور معانی ومفاہیم میں وسعت وطوالت ہوا کرتی ہے۔''

ہمارے شیخ عثمانیؒ مصنف "فتح الملهم شرح صحيح مسلم" سے میں نے خود سنا کہ حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

> ''حضرت شیخ کشمیریؒ کا کبھی کبھار تو ایک جملہ ہی اپنی شرح وبسط کے لئے ایک رسالہ کا محتاج ہوا کرتا ہے۔''

حضرت شیخ کشمیریؒ کا بیان میں اس قدر ایجاز واختصار فرمانا ایسا تھا جیسا کہ ابن الندیم نے اپنی کتاب الفہرست کے شروع میں تحریر فرمایا:

> ''کچھ نفوس مقدمات وقضایا کے بجائے نتائج کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں اور غرض کلام اور مقصود بیان سے مطمئن ہوتے ہیں، نہ کہ عبارات کی تطویل سے''۔

یا جیسا کہ خلیل بن احمدؒ نے فرمایا کہ:

''چند ابواب علم ایسے ہوا کرتے ہیں کہ اگر ہم ان کی اس قدر تشریح وتوضیح کرنا چاہیں کہ ہر کس ونا کس اس کو سمجھ سکے تو ہم ایسا کر سکتے ہیں، لیکن ضروری ہے کہ ہمارے بعد ایک عالم کی امتیازی حیثیت ہو۔''

خلیل بن احمدؒ کے اس قول کو ابن یعیشؒ نے شرح المفصل میں نقل کیا ہے، ابن یعیشؒ اس قول پر تعلیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس لئے ہر شخص جانتا ہے کہ جو شخص ایجاز واختصار میں بلاغت پر قدرت رکھتا ہے وہ تطویل واطناب میں بلاغت پر بھی قادر ہوگا۔''

چونکہ شیخ کشمیریؒ کا طرز، اختصارِ عبارت کا تھا اور ان کا کلام مقدمات کی تمہید اور تفصیلی شرح وبسط سے خالی ہوا کرتا تھا، اس وجہ سے راقم اب ان کے اقوال کو بعض مقامات میں جہاں تشریح وتفصیل کی ضرورت ہے، شرح وبسط سے ذکر کرے گا اور اس شرح وبسط میں راقم کے پیش نظر ان کے اسی رسالے کی ابحاث ہوں گی یا وہ فہم جو توفیق خداوندیؒ اور نصرت ایزدی سے راقم کو حاصل ہوا۔

اعجاز قرآنی باعتبار مفردات

حضرتؒ نے فرمایا کہ: قرآن کریم تمام کا تمام معجز ہے اور قرآن کا یہ اعجاز قرآن کے مفردات' مرکبات، اس کے کلمات کی ترکیب والتیام اور اس کے مقاصد وحقائق میں جاری وساری ہے، چنانچہ لفظاً' ترکیباً اور ترتیباً بھی قرآن کریم معجز ہے، نیز اپنے اغراض ومقاصد اور وسیع المجال علوم وحقائق کے اعتبار سے بھی قرآن کریم معجز ہے۔

ارشاد فرمایا کہ: مفردات قرآن کے اعتبار سے قرآنی اعجاز کے ثبوت کا مطلب یہ ہے کہ جب قرآن مجید کسی ایسے معاملہ کے متعلق بحث کرتا ہے جس میں عقلاء کی آراء میں اختلاف واقع ہوا ہو اور اس بحث کے مختلف پہلو آشکارا کئے گئے ہوں، لیکن عقول متحیر وسرگرداں رہیں اور حقیقت حال کا ادراک نہ کرسکیں، نیز کسی جہت کی صحت واضح نہ ہوتی ہو اور حقیقت کی جانب راہ

یابی نہ ہو سکے، تب ایسے معاملہ میں قرآن کریم مفرد کلمات سے وہ تعبیر پیش کرتا ہے جو اس تعبیر سے زیادہ حقیقت کو واضح کرنے والی موقع و مقام کے مناسب اور مقصد کو پورا ادا کرنے والی تعبیر ناممکن ہوا کرتی ہے اور ثقلین بھی اگر جمع ہو کر اس مقام پر کوئی اور لفظ جو حقیقت کے قریب تر اور مقصد و مطلب کو واشگاف کرنے والا ہو، لانا چاہیں تو خائب و خاسر ہی لوٹیں اور اپنے عجز و قصور کو سمجھ لیں۔۔اس لئے کہ قرآنی تعبیر کے علاوہ اس مطلوبہ غرض کو کسی اور کلمہ سے مکمل طور پر بیان کر دینا محال اور ناممکن ہے۔قرآن کریم کی یہی بلند و بالا شان ہے کہ وہ ایسے سنجیدہ اور غامض حقائق کو جن کے متعلق افکار بے مائیگی کا شکار رہیں اور ان کو تفصیلی ابحاث میں بھی بیان نہ کیا جا سکے،ایک کلمہ مفردہ میں واضح کر دیتا ہے۔ذیل میں ہم اس کی ایک مثال پیش کرتے ہیں جو اگلی سطور میں پیش کی جانے والی غرض اور بحث کی تمہید بھی ہے۔

''موت'' اور قرآن میں لفظ ''توفی'' کا استعمال

عام کفار عرب بعث بعد الموت کے منکر تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے جسمانی جوڑ بکھر جاتے ہیں اور اس کے اجزائے بدن کچھ اس طرح فناء ہو جاتے ہیں کہ ان میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا،قرآن کریم نے مختلف و متعدد مواقع میں ان کے اس باطل خیال کو ذکر فرمایا ہے۔سورۃ الانعام میں باری جل شانہ کا فرمان عالیشان ہے:

﴿وقالوا إن هى إلا حياتنا الدنيا نموت ونحيي وما نحن بمبعوثين﴾

اور صحیح بخاری میں کسی عرب شاعر کا یہ شعر نقل کیا گیا ہے:

يخبرنا الرسول بأن سنحيى
وكيف حياة اصداء وهام

ترجمہ:۔''یہ رسول ہمیں بتلاتا ہے کہ ہم عنقریب (مرنے کے بعد) زندہ کئے جائیں گے،حالانکہ صدائیں اور کھوپڑیاں کیونکر زندہ ہو سکتی ہیں۔''

اس شعر میں مستعمل لفظ ''اصداء'' ''الصدی'' سے ماخوذ ہے اور چونکہ عرب کا یہ

خیال تھا کہ جب کوئی شخص قتل کیا جاتا ہے تو اس کے سر سے ایک پرندہ نکلتا ہے اور وہ با آواز بلند یہ صدائیں بلند کرتا ہے کہ مجھے قاتل کا خون پلاؤ! مجھے قاتل کا خون پلاؤ! اور وہ یہ پکار اس وقت تک جاری رکھتا ہے جب تک کہ اس کا انتقام نہ لے لیا جائے۔ اسی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے "الصدی" کی یہی تشریح صحیح بخاری کی مختلف شروح، نیز فرید وجدی کی ''دائرۃ المعارف'' میں مادہ "الصدی" کے ذیل میں مذکور ہے۔

چنانچہ عرب میں مرنے کے بعد حساب وکتاب، آخرت ومعاد کا کوئی تصور ہی نہ تھا، ان کا گمان تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی اور کبھی فنا ہی نہ ہوگی، صاعد اندلسیؒ نے "طبقات الامم" ص:۶۸ اور شہرستانیؒ نے "الملل والنحل" اور دیگر علماء نے عرب کے اس تصور عدم فنا کو بیان فرمایا ہے اور انہی عرب میں ایک مختصر جماعت معاد کی قائل بھی تھی، جیسا کہ بعض شعرائے جاہلیت کے اشعار میں اس معاد کا تذکرہ موجود ہے، پھر اس مختصر جماعت (جو معاد کی قائل تھی) کے درمیان بھی اس بعث کی کیفیت میں اختلاف تھا اور کوئی قابل اطمینان واعتماد بات ان کے لئے بھی واضح نہ ہوئی تھی، جیسا کہ باری تعالیٰ نے ان کی اس بے اطمینانی کی کیفیت کو یوں فرمایا: "فهم فى أمر مريج" اسی طرح ''ابوالطیب متنبی'' نے اس حقیقت کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا ہے:

تخالف الناس حتى لا اتفاق لهم إلا على شجب والخلف في الشجب
فقيل: تخلص نفس المرأ سالمةً وفيل: تشرك جسم المرأ في العطب
ومن تفكر في الدنيا ومهجته أقامه الفكر بين العجز والتعب

ترجمہ:۔ ''۱۔لوگ اپنی آراء میں اس قدر مخالف ہیں کہ کسی معاملہ میں ان کا اتفاق نہیں ہے، ہاں صرف موت کے وقوع میں ان کا اتفاق ہے بلکہ موت کے بارے میں بھی آپس میں اختلاف ہے۔

۲۔بعض کہتے ہیں کہ انسان کی روح صحیح سلامت نکلتی ہے اور سالم برقرار رہتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس ہلاکت میں روح اور جسم دونوں شریک ہوتے ہیں۔

۳- جو شخص دنیا اور دنیوی زندگی کے متعلق غور و تامل میں لگے گا تو یہ غور وفکر اس کو ناتوانی، عاجزی اور تھکن کے درمیان کھڑا کر دیگی۔''

زمانہ جاہلیت میں عرب نے موت کے لئے اپنے احساسات و ادراک کے اعتبار سے مختلف نام متعین کرر کھے تھے۔ ابن سیدۃ اندلسیؒ نے یہ نام "المخصص" جلد ۶ ص: ۱۱۵ پر شمار کئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱: همیغ	۲: النیطۃ	۳: الزھر	٤: المنون
٥: الشعوب	٦: الفود	۷: الحمام	۸: السام
۹: المقدار	۱۰: قتیم	۱۱: جباز	۱۲: حلاق
۱۳: القاضیة	۱٤: الطلاطل	۱٥: الطلاطلة	۱٦: العول
۱۷: الذام	۱۸: الکفت	۱۹: الجداع	۲۰: الحزرہ
۲۱: الحتف	۲۲: الخالج		

اور ان اسماء میں سے اکثر کے لئے زمانہ جاہلیت کے شعراء کے اشعار سے شواہد بھی پیش کئے ہیں اور لفظ ۲۳- التوفی بھی من جملہ اسماء موت ذکر فرما کر اس کے لئے قرآنی آیت سے شاہد پیش فرمایا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزول سے قبل لفظ "توفی" ان کے ہاں موت کے لئے مستعمل نہ تھا۔ اسلام کے آنے کے ساتھ جب نزول قرآن ہوا، قرآن کریم نے عقیدۂ معاد و بعث بعد الموت' عقیدۂ قیامت اور عقیدۂ حساب و کتاب کو بیان کیا اور ان کے عقیدۂ فنا محض' عقیدۂ عدم بقائے روح' و مرکز، دوبارہ جی اٹھنے کو مستبعد سمجھنے اور اجزاء بدن کے پارہ پارہ ہوجانے کے بعد از سرنو اجتماع پر ان کے تعجب و مضحکہ کی شدید تردید و تنقید کی اور یہ واضح کیا کہ ظاہری جسم کو بقاء حاصل ہوگی اور اس عقیدہ کے اثبات پر بعث بعد الموت کی حقیقت کے متعلق مختلف امثلہ بیان فرمائیں جو عام عقول و اذہان کے لئے نہایت آسان فہم تھیں، نیز ان کے استبعاد اور بعث بعد الموت جو ان کے لئے ایک پوشیدہ و پیچیدہ معمہ تھا کچھ اس طرح آشکارا فرمایا کہ قلوب سلیمہ کو اطمینان اور نفوس طیبہ کو شفایابی ہوسکتی تھی، اس حقیقت کو آشکارا کرنے کے لئے لفظ

"توفی" استعمال فرمایا گیا، جس کے معنیٰ کسی چیز کو کامل ومکمل اور صحت وسلامت کے ساتھ لے لینے کے ہیں، اس طور پر کہ اس لینے میں ذرہ بھر نقص وخلل کو دخل نہ ہو، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ارواح کے لئے اللہ رب العزت کے ہاں ایک علیحدہ مقام ہے اور اجزاء بدن کے لئے بھی مستقل علیحدہ مقام ہے، جہاں یہ دونوں صحیح وسلامت موجود ہیں اور جب خداوند علیم وخبیر چاہیں گے، ان کو جمع فرمادیں گے۔ جیسا کہ باری جل وعلا کا فرمان ہے:﴿وهو على جمعهم إذا يشاء قدير﴾ بدن کا کوئی ذرہ بھی خداوند تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں ہے اور نہ ان اجزاء بدن میں خداوند تعالیٰ کو کوئی اشتباہ واختلاط ہوسکتا ہے۔ اسی عدم اشتباہ والتباس کو رب العزت نے یوں فرمایا: ﴿وعند نا كتاب حفيظ﴾۔

شیخ نے فرمایا کہ: عرب کے وہ ناتجربہ کار ادباء (جو فصاحت وبلاغت میں طاق ہونے کے باوجود قرآنی تعبیرات میں ناتجربہ کار اور بھولے بھالے تھے) قرآنی کلمات کی مانند جو کلمات حقیقت ومعرفت سے بھرپور، وقار ومرتبت کی چاشنی لئے ہوئے اور قوت وشدت میں بے مثل کلمات وجمل کہاں پیش کرسکتے ہیں؟ آپ بھی ذرا دیکھئے: لفظ شہادت کو قتل کے لئے کس خوبی سے استعمال کیا گیا اور موت کے لئے جو یوں تعبیر فرمائی گئی: "فمنهم من قضىٰ نحبه" اس تعبیر کی لطافت وجرأت کو دیکھیے!

"تحية الاسلام" میں حضرت شیخ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "توفی" کا موت کے لئے شائع وذائع استعمال بھی اسلامی ادوار ہی میں قرآن کی اتباع کرتے ہوئے ہوا، اور شاید اسی وجہ سے شیخ ازہریؒ نے "تهذيب الألفاظ" اور ثعالبیؒ نے "فقه اللغة" میں لفظ "توفی" کو موت کے اسماء میں ذکر نہیں فرمایا ہے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ: شیخ کے کلام کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ صاحب "المخصص" صاعد اندلسیؒ نے بھی جو لفظ "توفی" کو اسمائے موت میں ذکر فرمایا ہے تو قرآن کریم کی آیت ہی بطور شاہد پیش کی ہے، جیسا کہ ماقبل میں بیان بھی کیا جاچکا۔

اسی طرح ان کے ہاں موت کی وہ حقیقت ہرگز نہیں تھی جو اسلام نے پیش کی، چنانچہ وہ

کیسے موت کی تعبیر لفظ "توفی" سے کر سکتے تھے۔ "توفی" کے اس بنیادی واساسی معنی کی ان کو واقفیت ہی نہ تھی، بلکہ لفظ "توفی" کا معنی لغوی ان کے ہاں صرف یہ تھا کہ کسی چیز کو پورا علی جھتہ الکمال لے لینا، جیسا کہ 'طرفہ' کی بہن نے 'طرفہ' کے مرثیہ میں لفظ "توفی" کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے:

عددنا له ستا وعشرين حجة فلما توفاها استوى سيدا ضخما

فجعنا به لما رجونا إيابه على خير حال لا وليدا ولا فحما

ترجمہ:۔ "۱- ہم نے اس کی عمر کے چھبیس سال شمار کئے، جب اس نے چھبیس سال اپنی عمر میں سے پورے پورے وصول کر لئے تو وہ ایک عالی قدر سردار کے رتبہ پر فائز ہو گیا۔

۲- ہمیں اس بات کا صدمہ پہنچا کہ جب ہم اسکی عمدہ حالت میں واپسی کی امید میں تھے، جو نہ بچپنے کی حالت تھی اور نہ بڑھاپے کی۔"

حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ لفظ توفی میں ایک اور باریک نکتہ کی طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے اور وہ یہ کہ "متوفی"، متوفّٰی" کا حق ہوا کرتا ہے، چنانچہ ایک شخص نے اپنے گم کردہ گھوڑے کو صحراء میں پکڑ لیا تو یہ نہ کہا جائے گا کہ "توفیت الفرس" میں نے اپنے گھوڑے کو پورا لے لیا، بلکہ کہا جائے گا کہ "توفیت حقی" یعنی میں نے اپنا حق حاصل کر لیا۔ اور فارسی میں اس کا ترجمہ یوں ہوگا 'وصول کردم حق خویش را' چنانچہ جب لفظ "توفی" اپنے حق کی وصولیابی کے لئے ہوتا ہے اور اپنا حق کسی غیر کے پاس صرف عاریت کے طور پر ایک مقررہ مدت کے لیے ہوا کرتا ہے اور اس جہت سے ضمنی طور پر مدت مقررہ کے پورا کرانے کو بھی شامل ہوتا ہے، اس لئے کہ صاحب حق اپنے حق کی وصولیابی کا جس وقت چاہے مستقل طور پر مختار ہے، جیسا کہ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

و تراكضوا خيل الشباب و حاذروا

من أن تردّ فإنهن عواری

ترجمہ:۔ 'وہ لوگ اپنی عمر شباب کے گھوڑے سرپٹ دوڑانے لگے اور وہ خائف تھے کہ یہ گھوڑے ان سے لے لئے جائیں گے، اس لئے کہ یہ گھوڑے بطور عاریت ان کو دیئے

گئے ہیں۔ (اور صاحب حق جس وقت چاہے لے سکتا ہے)۔''

اسی طرح ایک اور شاعر یوں گویا ہوا:

وما الروح والجثمان إلا وديعة

و لابد يوما أن تردّ الودائع

ترجمہ:۔'' روح اور جسم تو محض ودیعت کردہ ہیں اور ایک دن ضرور آتا ہے، جبکہ ودائع واپس لے لی جاتی ہیں۔''

شیخ فرماتے ہیں کہ: لفظ ''توفی'' کے حق جل شانہ کی طرف مسند و منسوب ہونے میں ایک اور باریک نکتہ ہے اور وہ یہ کہ لفظ ''توفی'' مشیر ہے اس بات پر کہ متوفی کا صحیح تر مالک باقی رہنے والی ذات ہے جس پر کبھی فنا و ہلاکت نہ آئے گی، چنانچہ اب اس متوفی پر بھی کبھی ہلاکت و فنا کا گذر نہ ہوگا۔ حضرت شیخ کے الفاظ ''تحية الاسلام'' ص: ۳۳ میں یوں ہیں:

اور جان لیجئے کہ لفظ ''توفی'' جس کے معنی حق کی وصولیابی کے ہیں جب اس کی اسناد مقام اختصاص میں اللہ رب العزت کی طرف ہو تو یہ لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ متوفی چونکہ ''باقی'' کی ملکیت میں داخل ہو گیا ہے (اور باقی کی ملکیت بھی باقی ہوتی ہے) اس لئے اب اس متوفی پر بھی کبھی ہلاکت اور فنا نہ آئے گی، یہی معنی حق جل شانہ کے اس مبارک فرمان سے مراد ہیں: ﴿وكنتم أمواتا فأحياكم ثم يميتكم ثم يحييكم ثم إليه ترجعون﴾ یعنی دوسری مرتبہ کا مارنا اور جلانا پہلی مرتبہ کی طرح نہ ہوگا بلکہ اس کی انتہاء ''ثم اليه ترجعون'' (یعنی اسی رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے) پر ہوگی اور اسی طرح اس کی انتہاء ﴿ما عندكم ينفد وما عند الله باق﴾ (جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہونے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے) پر ہوگی۔

چنانچہ جب کہ روح ''متوف'' ہوتی ہے، اس لئے اب وہ خداوند تعالیٰ کے ہاں ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گی، معلوم ہوا کہ لفظ توفی ''متوف'' کے باقی رہنے پر بھی دلالت کر رہا ہے، چونکہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بدن مبارک اور ان کی روح دونوں کو اللہ رب العزت نے اٹھا لیا تھا اور ان کے علاوہ کسی کی روح اس کے بدن کے ساتھ نہ اٹھائی گئی تھی، اس لئے سورہ آل عمران

میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رفع جسمانی وروحانی کو یوں بیان فرمایا گیا کہ لفظ "متوفیك" کے بعد "ورافعك إلیّ" کا بھی اضافہ کردیا گیا، نیز لفظ "توفی" کی اسناد اللہ رب العزت کی طرف یا تو مقام اختصاص میں یا مطلقاً لفظ "توفی" کے استعمال کے وقت ہوئی ہے، وگرنہ لفظ توفی کی اسناد ملائکہ کی طرف ہوتی ہے۔

"توفی" کے اسی معنی کو (یعنی جسم اور روح دونوں کے ساتھ اٹھالینا) امام راغبؒ نے اپنی "مفردات القرآن" میں یوں تعبیر فرمایا ہے: "توفی اختصاص وشرف لا توفی موت"۔

پھر چونکہ نیند میں بھی ایک قسم کی توفی والی کیفیت ہوتی ہے، اس لئے قرآن کریم نے نیند کے لئے بھی لفظ توفی استعمال فرمایا ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿الله یتوفی الأنفس حین موتها والتی لم تمت فی منامها﴾ اسی طرح اس ارشاد گرامی میں: "وهو الذی یتوفاکم باللیل" الخ۔

حضرت کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ: باری جل شانہ کے فرمان "الله یتوفی الانفس" میں لفظ "الانفس" کو صراحۃً اس لئے ذکر کیا گیا کہ موت کے وقت کی توفی لوگوں کو قرآن کریم سے معلوم ہو رہی تھی، لیکن نیند کے وقت جو توفی ہوتی ہے وہ تو ایک انوکھی بات تھی، چنانچہ قرآن نے ان کو یہ بتلایا کہ نیند میں بھی توفی نفس وقوع پذیر ہوتی ہے، اس لئے صراحۃً نفس کا ذکر کیا گیا۔

پھر جب ایک مرتبہ نیند کے وقت کی توفی باور کرادی گئی تھی اس لئے بعد ازاں "توفی منام" کے لئے بھی مطلقاً لفظ توفی مستعمل ہوا اور یوں فرمایا گیا: "وهو الذی یتوفاکم باللیل".

راقم کہتا ہے کہ شیخ کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ جب حق جل شانہ نے لوگوں کو یہ بات باور کروانی چاہی کہ بوقت منام بھی ایک قسم کی توفی واقع ہوتی ہے تو وہاں لفظ "الانفس" کی صراحت فرمائی، تاکہ بوقت منام توفی کی حقیقت سے معرفت دو واقفیت حاصل ہوجائے، پھر جب لوگوں میں بوقت منام کی توفی کی واقفیت عام ہوئی، تب بعد ازاں لفظ "الانفس" ذکر کرنے کی

حاجت باقی نہ رہی، اور توفی منام کے لئے بھی مطلقاً لفظ "توفی" وارد ہوا، چنانچہ فرمایا گیا ﴿وهو الذی یتوفاکم باللیل﴾۔

حضرت کشمیریؒ نے اس لطیفے کے بیان میں وہ اشکال جو عموماً کھٹکتا ہے کہ ایک آیت میں "توفی منام" کے ساتھ "الانفس" کی تصریح فرمائی گئی اور دوسری آیت میں تصریح ذکر نہ ہوئی، اس اشکال کو کس عمدہ لطیفہ ومعرفت کے عکس میں زائل کر دیا اور کس قدر عمدہ علمی جواہر اپنی تصانیف میں بکھیر دیئے، فللہ درہ۔

پھر شیخ نے فرمایا کہ: ''میری مراد یہ ہے کہ لفظ "الانفس" کی تصریح فرما کر اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ بوقت نوم اور بوقت موت ہر دو مواقع پر علیحدہ علیحدہ نوع کی توفی واقع ہوتی ہے، جس میں اللہ رب العزت کے بلاواسطہ فعل کا دخل ہوتا ہے، قرآن کریم بعض مواضع میں ایسے حقائق کا اظہار کرتا ہے، جنہیں اہل عرف نہ پہچانتے تھے اور ممکن ہے کہ اہل عرب بھی واضح طور پر نہ جانتے ہوں بوقت موت بھی توفی واقع ہوتی ہے جو تحصیل کے معنی میں ہے......الخ۔

حضرت شیخ نے "تحیة الاسلام" کے اسی مقام پر ایک خاص بحث فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یوں ہے:

> ''جان لیجئے کہ زمانہ جاہلیت میں عرب موت کو فنائے محض اور انعدام خالص خیال کرتے تھے، قرآن کریم نے ان کو بتلایا کہ موت کا معاملہ اس طرح نہیں ہے، جیسا کہ وہ خیال کر رہے ہیں، بلکہ بوقت موت خداوند تعالیٰ کی طرف سے توفی کا وقوع ہوتا ہے، اگر چہ "توفی" بعینہ موت نہیں ہے۔''

میں یہ نہیں کہتا کہ موت پر توفی کا استعمال ہوا ہے، لیکن بہر حال محل ذکر موت میں لفظ توفی کا استعمال اہل عرب کو قرآن ہی سے معلوم ہوا تھا اور قرآن ہی نے اس حقیقت کی طرف ان کی راہ یابی کی تھی اور ان کو یہ حقیقت سمجھائی تھی، حقیقۃً لفظ توفی ہر اس مقام پر مستعمل ہوسکتا ہے جہاں ''اخذ'' یعنی لے لینے کے معنی ہوں، چنانچہ موت، نوم اور رفع ہر تین پر لفظ توفی

صادق آتا ہے۔

لغوی اعتبار سے لفظ توفی کی یہی حقیقت ہے اور قرآن کریم کا منصب ومقصد بھی حقائق کو واشگاف کرنا ہے جس شخص کو اللہ جل شانہ کی طرف سے قرآنی بلاغت میں ذوق بخشا گیا ہو اور عربیت کا کچھ حصہ عطا ہوا ہو، وہ یہ بات بخوبی جان سکتا ہے کہ قرآن کریم کا طرز عامیانہ گفتگو کی طرح ہرگز نہیں ہے، بلکہ الفاظ کے چناؤ میں قرآن کریم کا ایک امتیازی طرز وطریقہ ہے، جس میں وضع اصلی کا بھی خوب لحاظ ہے اور معنی موضوع لہ کے حقائق ومعارف کی بھی عمدہ رعایت رکھی گئی ہے، اسی بناء پر قرآن کریم کے کسی لفظ کے بدل میں کوئی دوسرا لفظ وضع کرنا متعذر رہی نہیں، بلکہ محال ہے، جس کی وجہ مختلف اشیاء کی مختلف حقائق سے ناواقفیت، نیز اس مقام خاص کے حق کو پورا اداکرنے سے عاجزی ہے، قرآن کریم اس قدر باریک طرز پر اور ایسی انوکھی تعبیر سے فوائد متعین کرتا ہے جس کے بدل لانے سے عقول وافہام قاصر اور سرخیل دانشوران قوم کے مدارک شعور عاجز رہ جاتے ہیں۔

بعدازاں شیخ کشمیریؒ نے آیت توفی یعنی باری جل شانہ کے ارشاد گرامی "یا عیسی إنّي متوفيك ورافعك إليّ" کے ذیل میں فصاحت وبلاغت کے عجیب وغریب نکات واضح فرمائے ہیں اور نظم قرآنی کے لطائف ومعارف واضح کئے ہیں یہ تمام تر تفصیلات حضرت شیخ کی کتاب "عقیدة الاسلام فی حیاة عیسی علیه السلام" اور اس پر شیخ کی تعلیقات بنام "تحية الاسلام" میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت کشمیریؒ کے بیان کردہ یہ لطائف ونکات اس قدر عمدہ وعالی شان ہیں کہ مردانِ علم مدہوش رہ جاتے ہیں اور عقول متحیر وسرگرداں معلوم ہوتی ہیں، شیخ کا ٹھاٹھے مارتا علمی سمندر خوب موجیں دکھلاتا ہے اور قیمتی وعالی قدر موتی بکھیرتا ہے، جن کے مناسب یہ ہے کہ وہ علم فصاحت کے ہار کا وسطی ہیرا اور علمِ بلاغت وبراعت کی حقیقی بنیاد شمار کیا جائے۔

ان نکات میں شیخ نے تفصیلی کلام رقم فرمایا ہے اور مقام کے متعلق تمام متنوع ابحاث کا احاطہ فرمایا ہے، جس سے علومِ بلاغت میں شیخ کی اس عالی منزلت کا اندازہ ہوتا ہے جس منزل

ومرتبہ تک پہنچنے سے بلغاء کے قدم قاصر اور شیخ کے ہمعصر حیران ہیں۔

شیخ کی ان جملہ مباحث کو جو شیخ نے اپنی ان دو کتابوں میں پھیلائی ہیں جمع کر لیا جائے اور صرف اسی آیت کے متعلق حضرت شیخ کے ذکر کردہ مراجع کو جمع کر لیا جائے، نیز جو مختلف مواضع میں علمی لطائف شیخ نے بکھیرے ہیں انہیں یکجا کر کے عصری اسلوب کے مطابق عمدہ ترتیب اور پیرائے میں ڈھال لیا جائے تو ایک بڑا دفتر تیار ہو سکتا ہے اور بے شک وشبہ یہ دفتر کتبِ بلاغت وبیان اور کتبِ تفاسیر میں عمدہ پائے کا ذخیرہ شمار کیا جاتا۔

شیخ نے اسی مقام پر یہ بحث بھی فرمائی ہے کہ لفظ ''توفی'' کا موت کے لئے مستعمل ہونا اصولی کنایہ ہے یا بیانی کنایہ؟ پھر کنایہ حقیقت لغویہ ہے یا مجاز لغوی ہے؟ علمائے بلاغت کے اس میں اقوال کیا ہیں اور کون سا قول درست وصواب پر مبنی ہے؟ اس کے علاوہ علم بلاغت کے دیگر کئی ایسے لطائف بیان فرمائے ہیں جنہیں ایک فصیح وبلیغ شخص جو معانی ومفاہیم میں ذوق سلیم رکھتا ہو اور الفاظ کی فصاحت میں بھی اس کو حظِ وافر عطا کیا گیا ہو قدر بیں نگاہوں سے ملاحظہ کرے گا۔

حضرت شیخ نے اپنی کتاب ''عقیدة الاسلام'' میں ایک مستقل فصل قائم فرمائی ہے، جس کا عنوان یوں ہے:

> ''فصل في تفسير لفظ التوفی وشرحه لغة وعرفا وبيانه حقيقة وكناية وتوفية حقه واستيفاء مستحقه.''

یعنی فصل لفظ توفی کی لغوی تفسیر وعرفی تشریح اور اس کے حقیقت وکنایہ میں مستعمل ہونے کی توضیح، نیز اس توفی کے حق کو ادا کرنے اور اس کے مستحق مصداق کو واضح بیان کرنے کے بارے میں ہے۔

درحقیقت حضرت شیخ کشمیریؒ کے اس لفظ ''توفی'' کے متعلق اس قدر تفصیلی شرح وبسط کی وجہ نبوت کے جھوٹے دعوے دار ملعون مرزا غلام احمد قادیانی اور اس ملحد جماعت پر رد کرنا تھی، جنہوں نے یہ نظریہ اختیار کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی دیئے جا چکے اور موت سے ہمکنار ہو چکے ہیں اور اس پر انہوں نے قرآن کریم ہی سے اسی لفظ ''توفی'' کی رو سے استدلال کیا تھا۔

اس مقام پر قرآن میں شدید تحریف کی اور معانی و مفاہیم کو مسخ کر دیا اور قرآن کریم کے اساسی اغراض و مقاصد میں تصحیف کرتے ہوئے محکم امور کو منسوخ ٹھہرایا، جیسا کہ حضرت نے فرمایا:'' یہی ''توفی'' وہ لفظ ہے جس کے بارے میں اس بد بخت جاہل (غلام احمد قادیانی ملعون) اور اس کے پیروؤں نے شور وشغب کر رکھا ہے جو چکی سے ابھرنے والی آوازوں کی مانند تو ہے لیکن چکی کا وجود ہی نہیں، اس لفظ توفی پر کئی صفحے کالے کر چکے ہیں اور ایک ہی بات پر اصرار و تکرار کے ساتھ صحائف بھر چکے ہیں، چنانچہ اس جاہل ملعون کی آپ جو تحریر بھی دیکھیں اس میں اس نے اپنی علمی کم مائیگی سے گویا ایسے گھڑے رکھیں ہیں جس کو دیکھنے والا اکتا جاتا ہے اور ان سطور کے لکھنے والے کو اس کا دل لعنت و ملامت کرتا ہے، یہی ہے اس قادیانی ملعون کا ردی اور خسیس سرمایہ، ادر جب اس لعین پر علمی رد و قدح کی گئی تو مایوس ہو کر دھتکارے ہوئے کتے کے مانند پیچھے ہٹا اور ان ردود، و تنقیدات کا جواب نہ لکھ سکا، اس کی حالت شاعر کے اس قول کی مصداق تھی:

ما زال سر الكفر بين ضلوعه

حتى اصطلى سر الزناد الواری

ترجمہ: ہمیشہ کفر کی بنیاد اس پسلیوں کے درمیان (دل میں) رہی، یہاں تک کہ چقماق کے اندر چھپی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔

شیخ نے اس سے علمی مجادلہ و مباحثہ کیا اور انتہائی رد و تنقید کرتے ہوئے اس کے شور و غوغا کو خاموش کر دیا اور حق کو اس قدر آشکارا کیا کہ اس میں نقب زنی ممکن ہی نہ رہی اور اس لعین اور بد بخت کو شیر کے منہ کے قریب چھوڑ دیا، مختلف قرآنی مواضع کی ایسی عمدہ اور واضح تشریح و تفسیر فرمائی کہ گویا قرآن کریم اس ملعون پر ہی رد کرنے کے لئے نازل ہوا ہے اور اس کے دل میں سلگتا ہوا انگارا رکھ چھوڑا، چنانچہ اس رد پر جواب لکھنے کے لئے اس پر تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں اور دنیا میں مذموم و نامراد ہوا اور آخرت میں دائمی عذاب کا مستحق ٹھہرا۔ یہ مختصر رسالہ ان تمام تفصیلات و مباحث کو مکمل بیان کر دینے کا متحمل نہیں، اسی لئے ہم نے اس قدر قلیل پر اکتفاء کیا۔ مجھے بارہا یہ خیال گذرتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق نصیب ہوئی تو شیخ کی ان جملہ مباحث کو آشکارا کروں گا اور شیخ کے قیمتی علمی معادن سے نفیس موتی، علوم بلاغت و بیان کے طلبہ پر شیخ کے بھرپور

علمی خوان سے چن کر خرچ کروں گا اور یہ شیخ کا ہی علمی خوان ہے جو علمی اعتبار سے بھی اعلیٰ اور ذوقی ووجدانی اعتبار سے بھی لذیذ اور شیرین ہے۔

والله ولي التوفيق وهو حسبي ونعم الوكيل

راقم کہتا ہے کہ قرآن کریم کے مفردات کے اعتبار سے جس طرح اعجاز قرآنی حضرت شیخ نے بیان فرمایا ہے، اس طرز پر شیخ سے قبل کسی کو تنبہ نہ ہوا تھا اور کسی نے حضرت شیخ جیسے طرز طریق پر اس قدر وضاحت نہ کی تھی، اگرچہ قرآنی ترکیب وترتیب وغیرہ دیگر جہات کے اعتبار سے متقدمین نے بھی مباحث فرمائی ہیں، لیکن ان جہات کو انہوں نے اعجاز قرآنی کا مدار اور تحدی ومبارات کے لئے بنیادی جہت نہیں شمار فرمایا ہے، حالانکہ اس جہت اعجاز پر تنبیہ اور اس کے متعلق فکر وتامل، یہ قرآنی اعجاز اور اس کے علمی مجادلہ ومباحثہ کے باب میں انتہائی اہم جہات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔

چنانچہ اب میں گذشتہ متقدمین علمائے کبار کے بیان کردہ بعض نکات ولطائف منتخب کرتا ہوں، تاکہ یہ بات خوب واضح ہوجائے (کہ شیخ کے علمی تفوق نے کس قدر علمی نفائس کو طلبہ دین اور علمائے امت پر عطیہ کیا ہے) جبکہ شیخ نے اسلاف کے بیان کردہ نکات کی طرف التفات نہیں فرمایا ہے، اس لئے کہ فصحاء وبلغاء کو ادنیٰ فکر وتامل سے ان معارف کا ادراک ہوسکتا ہے یا اس لئے کہ اسلاف نے ان پر تنبیہ فرمادی ہے، شیخ کا مقصد تو پیچیدہ مباحث کو واضح کرنا اور ان چیزوں کو کھولنا تھا جو متقدمین نے واضح نہیں کی تھیں۔

چنانچہ شیخ کا طرز وانداز ان متوسط حلقہ علماء کے طرز وانداز سے قدرے مختلف تھا جو متقدمین علماء ہی کے جواہر پاروں کو چن کر تصنیف وتالیف کیا کرتے ہیں، بلکہ شیخ کا طرز ان محققین کے طرز تحقیق کی مانند تھا جو اپنی فنی وعلمی تحقیق وتدقیق میں طاق ہوں، لیکن جن مقامات پر اسلاف کے اقوال کو بیان کرنے کی حاجت پیش آتی، وہاں ان کو بیان فرمادیا کرتے تھے۔

والله المستعان

''ظلم'' اور قرآن میں لفظ ''ضیزیٰ'' کا استعمال

راقم کہتا ہے کہ: کبھی کبھی کوئی کلمہ اگر قرآن کریم کے علاوہ کہیں اور استعمال ہو جائے تو قبیح و متنفر اور طبع سلیم کو ناموافق گذرتا ہے، لیکن اگر قرآن کریم میں مستعمل شدہ ہو تو اس قدر مناسب و مستحسن معلوم ہوتا ہے کہ اس خاص موقع پر نظم قرآنی میں مستعمل شدہ اس لفظ کے قائم مقام کوئی دوسرا لفظ نہیں بچ سکتا ہے اور واقعی یہ خداوند کریم کا اعجازِ عجیب ہے، جس خداوند نے کائنات کی ہر شیٔ مضبوط اور مستحکم پیدا فرمائی ہے. چنانچہ اس لفظ کے متعلق ذرہ بھر خلل یا نقص پیدا نہیں ہوتا۔ اب کلمہ ''ضیزی'' کو دیکھئے کہ اس کے موقعہ مستعملہ میں کوئی دوسرا لفظ ہرگز اس کے معانی و مطالب ادا نہیں کرسکتا ہے، غور فرمایئے ''سورة النجم'' تمام آیات حرف ''یاء'' کے مطابق مسجع بیان فرمائی گئی ہیں، باری جل شانہٗ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿والنجم إذا هوى ، ما ضل صاحبكم وما غوى﴾ اسی ذیل میں جب بتوں کی مذمت اور مشرکین مکہ کی تقسیم اولاد (جو ملائکہ کو بنات اللہ کہا کرتے اور خود اپنے لئے ذکور اولاد کو پسند کرتے تھے) کا تذکرہ کیا گیا تو یوں فرمایا گیا ﴿أ لكم الذكر وله الأنثىٰ تلك إذا قسمة ضيزىٰ﴾ چنانچہ لفظ ''ضیزی'' بھی حرف یاء پر مسجع مذکور ہوا، جس طرح تمام سورت حرف یاء پر مسجع ہے، اس لفظ کے علاوہ کوئی اور لفظ نہ تھا جس کو اس موقع میں استعمال کیا جاتا۔ اگرچہ معنی کے اعتبار سے اس لفظ سے بہتر لفظ تھا جو استعمال کیا جا سکتا تھا، لیکن وہ لفظ اس موضع کے مناسب نہ ہوتا، اس لئے کہ جس اصل واساس پر (یعنی حرف یاء کے سجع کے مطابق) سورت ''النجم'' وارد ہوئی ہے، اس اصل سے وہ کلمہ خارج ہو جاتا، اگر ہم لفظ ''ضیزی'' کے علاوہ اس کے ہم معنی لفظ رکھ کر دیکھیں اور ہم یوں کہیں: ''هى قسمة جائرة يا ظالمة'' تو بے شک لفظ ''جائرة'' اور ''ظالمة'' لفظ ''ضیزی'' سے لفظی حسن میں کہیں بہتر ہیں، لیکن ہم اس آیت کو ماقبل آیات سے مربوط و منظم کر کے دیکھیں اور یوں پڑھیں: ﴿أ لكم الذكر وله الأنثى تلك إذا قسمة جائرة'' تو ''نظم کلام'' جو حسن ''ضیزی'' کی صورت میں رکھتا ہے، وہ حسن کھو بیٹھے گا۔ اور یہ کلام اس ناقص شیٔ کی طرح مہمل رہ جائے گا جو اپنی تکمیل و اتمام کا محتاج ہو... بات ایک باذوق شخص پر جس کو نظم

کلام کے متعلق معرفت ہو، پوشیدہ نہیں، اس نکتے پر ابن الاثیرؒ نے جو متفوق ادیب ہیں اپنی کتاب: المثل السائر ص: ۶۲ میں تنبیہ فرمائی ہے اور میں نے اس کو کچھ ملخص پیش کر دیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اسی طرح اس کلمہ کے لطائف میں سے ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ اس لفظ کے ذریعہ اس تقسیم کی قباحت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، اس لئے کہ لفظ اپنے معنی کا عنوان ہوا کرتا ہے اور ادباء وفصحاء کے طرز وانداز میں سے ہے کہ وہ معنوی ہولناکی کی طرف لفظی تہویل سے اشارہ کیا کرتے ہیں، یہ موضوع بہت وسیع ہے، جو مستقل بحث کا محتاج ہے اور یہ وسیع بحث یہاں بیان نہیں کی جاسکتی۔

ابن الاثیرؒ کے بیان کردہ گذشتہ نکتہ کی توضیح اس بحث سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے اپنی کتاب کے (ص: ۱۱۱) پر یوں فرمائی: لفظ "الأخدع" دو مختلف شعروں میں استعمال ہوا ہے، لیکن ان میں سے ایک شعر میں اس کا استعمال مستحسن اور لائق قدر ہے اور دوسرے شعر میں ثقیل اور طبع سلیم کے لیے ناگوار ہے، ابن الصمہ عبداللہ (جو دیوان حماسہ کے منتخب شعراء میں سے ہیں) کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

تلفت نحو الحی حتی وجدتنی
وجعت من الاصغاء لیتا وأخدعا

ترجمہ: "جب محبوبہ نے چہرا پھیر کر اس محلہ کی طرف دیکھا تو مجھے پایا کہ اس کی طرف کان لگائے رکھنے کی وجہ سے میرے کنارۂ گردن اور رگ گردن میں شدید درد ہو چکا ہے۔"

اور اب ابوتمام کا یہ قول ملاحظہ کیجئے:

یادھر قم عن أخدعیك فقد
اضججت ھذا الأنام عن خرقك

ترجمہ: "اے زمانے! اپنے حوادث کو ختم کر، کہ تو نے انسانوں کو اپنے حوادث سے تنگ دل وتنگ عیش کر رکھا ہے۔"

غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ اس لفظ "الأخدع" کا ابوتمام کے شعر میں استعمال سماعت سلیمہ پر ثقیل اور طبع سلیم کے لئے باعث کراہت ہے، جبکہ ابن الصمۃ عبداللہ کے شعر میں

اسی لفظ سے کئی گنا راحت وخفت اور مانوسیت پائی جاتی ہے۔

چند دیگر مثالیں

کبھی کبھار اگر کسی کلمہ کو مفرد استعمال کیا جائے تو اس میں حسن وخوبی معلوم ہوتی ہے اور اگر جمع ذکر کیا جائے تو کلمہ متنفر اور ثقیل ہوجاتا ہے، اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔قرآن کریم میں اس کی بھی رعایت کی گئی ہے کہ پہلی صورت میں قرآن مجید کلمہ کو مفرد ہی استعمال کرتا ہے اور دوسری صورت میں جمع ہی استعمال کرتا ہے،دوسری صورت کی مثال امام ابن اثیرؒ نے (ص:۱۱۱) پر یوں پیش فرمائی ہے:

> ''قرآن کریم اسی نوع اعجاز (نظم قرآنی کے افراد وترکیب کے اعتبار) سے یہ بھی ہے کہ بعض مواضع میں چند ایسے الفاظ کے استعمال سے عدول کیا جاتا ہے جن سے عدول کرنے پر کوئی واضح دلیل نہیں ہوتی اور اس عدول کے متعلق صرف ذوق سلیم رکھنے والوں ہی سے پوچھا جاسکتا ہے اور یہ مواضع بہت ہی تعجب خیز ہوا کرتے ہیں جس کی اصل حقیقت وواقعیت معلوم نہیں کی جاسکتی ہے،اسی شمار میں لفظ ''اللب'' بمعنی عقل، نہ کہ بمعنی مغز اور گودہ،اس لفظ ''اللب'' کا استعمال صرف بصورت جمع ہی مستحسن ہوتا ہے،اسی بناء پر قرآن کریم میں بھی جن متعدد مواضع میں یہ لفظ استعمال ہوا، بصورت جمع استعمال ہوا اور کہیں بھی مفرد استعمال نہیں ہوا ہے، جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ولیتذکّر أولو ا الألباب﴾ ﴿إنّ فی ذلك لذکریٰ لأولی الألباب﴾ اسی طرح لفظ ''الاکواب'' اور لفظ ''الارجاء'' بھی قرآن میں بجز صیغۂ جمع کے اور کسی صیغہ میں وارد نہیں ہوئے ہیں اور ان کے صیغۂ مفرد ''الکوب'' اور ''الرجا'' (الف مقصورہ کے ساتھ) قرآن میں یکسر مستعمل نہیں۔

پہلی صورت کی مثال جیسا کہ شیخ صادق رافعی نے بیان کی: کہ لفظ "الأرض" قرآن میں فقط مفرد مستعمل ہوا ہے اور جہاں آسمان کو صیغۂ جمع کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے وہاں بھی لفظ "الأرض" مفرد ہی مذکور ہوا ہے اور جہاں اس لفظ کو بصورت جمع لانے کی حاجت ہوئی وہاں ایسی صورت میں معنی جمع کی ادائیگی ہوئی ہے کہ جس میں کچھ ایسے انداز میں فصاحت کا جوہر اور اس کی واقعیت ودیعت کی گئی کہ فکر وشعور نے سرنگوں ہوکر اس فصاحت و بلاغت کو طویل سجدے کئے، باری جل شانہ کا ارشاد گرامی ملاحظہ ہو: ﴿الله الذی خلق سبع سموات ومن الأرض مثلهن﴾ یہاں "سبع ارضین" نہ فرمایا گیا جس کی وجہ سے نظم قرآنی گلوگرفتگی اور ہر قسم کے خلل ونقصان سے پاک رہا۔

ابن النفیسؒ نے اپنی کتاب "الطریق إلی الفصاحة" میں یہ بیان فرمایا ہے کہ: عربی ادب وانشاء میں کلمے کو کبھی ایک صیغے سے دوسرے صیغے کی طرف یا ایک وزن سے دوسرے وزن کی طرف یا ماضی سے مستقبل کی طرف یا اس کے برعکس وغیرہ منتقل کیا جاتا ہے، ان تمام تصرفات کے نتیجے میں کلمہ اپنے قبح سے حسن وخوبی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ اب دیکھئے لفظ "حور" بمعنی جلدی کرنے کے قبیح ہے، لیکن اگر اس "حور" کو ناز و انداز والی عورت کے لئے استعمال کیا جائے تو یہ لفظ اپنے قبح میں کمتر ہوجائے گا۔ اسی طرح "ودع" صیغۂ ماضی میں اس کا استعمال قبیح محسوس ہوتا ہے، اس لئے کہ صیغۂ ماضی کے ساتھ اس کا استعمال بہت کم واقع ہوا ہے لیکن اسی لفظ کو صیغۂ امر اور فعل مضارع کی صورت میں استعمال کرنا قبیح نہیں ہے۔ لفظ "اللب" بمعنی عقل کا استعمال صیغۂ مفرد سے قبیح معلوم ہوتا ہے، جبکہ صیغۂ جمع میں استعمال سے یہ قبح جاتا رہتا ہے، باری جل شانہ کا ارشاد ہے: "لأولی الألباب" بلکہ حدیث میں بھی لفظ "اللب" صیغۂ مفرد کے ساتھ مجازاً استعمال ہوا ہے، جیسا کہ نبی کریم علیہ السلام کا فرمان یوں منقول ہے: "مارأیت من ناقصات عقل ودین أذهب للب الرجل الحازم من احداکن"

یا پھر صیغۂ مفرد بصورت اضافت استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ جریر کے اس شعر میں ملاحظہ کیجئے:

یصرعن ذا اللب حتی لاحراك به

وهن أضعف خلق الله أركانا

ترجمہ:۔ ''یہ عورتیں عقلمند شخص کو ایسا پچھاڑتی ہیں کہ وہ بے حس و حرکت ہوجاتا ہے، حالانکہ یہ عورتیں اعضاء و جوارح کے اعتبار سے خداوند تعالیٰ کی کمزور ترین مخلوق ہیں۔''

اسی طرح لفظ ''الارجاء'' کہ صیغۂ جمع ہی کے ساتھ اس کا استعمال مستحسن محسوس ہوتا ہے، جیسا کہ باری جل وعلاء کا فرمان ہے: ''والملك على أرجائها'' لفظ ''الارجاء'' صیغۂ مفرد میں صرف بصورت اضافت ہی خوب معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ ہم یوں کہیں: ''رجاء البئر''

اسی طرح لفظ ''أصواف'' بھی صیغۂ جمع ہی کی صورت میں اچھا معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ باری تعالیٰ کا فرمان ہے: ''ومن أصوافها'' صیغۂ مفرد میں اس کا استعمال بھلا نہیں لگتا، ابوتمام کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

''فكأنما لبس الزمان الصوفا''

گویا کہ زمانہ نے اون پہن رکھا ہے۔

جو الفاظ بصورت صیغۂ مفرد تو خوب معلوم ہوتے ہیں، لیکن صیغۂ جمع ہونے کی صورت میں قبیح محسوس ہوتے ہیں، تمام مصادر اسی قسم سے شمار کئے جاتے ہیں، جیسے ''طیف'' (صیغۂ مفرد) ''طیوف'' (صیغۂ جمع جو قبیح معلوم ہورہا ہے) ''بقعة'' اور ''بقاع'': لفظ بقاع صیغۂ جمع کی صورت میں ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔انتہی۔ یہ تمام تفصیلات شیخ بہاء الدین سبکیؒ نے ''عروس الأفراح'' میں بیان فرمائی ہیں۔

اگر ایک ہی معنی کے لئے متعدد الفاظ ہوں اور ان میں سے کوئی لفظ بھی ثقل و کراہت سے خالی نہ ہو یا ہر لفظ کثرت استعمال کی وجہ سے اپنی حقیقی اور واقعی وقعت کھو بیٹھا ہو، تب ایسے مواضع میں قرآن مجید اس معنیٔ خاص کی تعبیر ایسے لفظ سے کرتا ہے کہ اصل حقیقت بھی واضح ہوجائے اور اس معنی کے لئے اس ثقیل اور مکروہ لفظ کے استعمال کی بھی حاجت باقی نہ رہے۔

ابن الاثیرؒ اپنی کتاب (ص:۱۷) پر رقمطراز ہیں:

وإن شئت أن تعلم من سر الفصاحة التي تضمنها القرآن فانظر إلى هذا الموضع، فإنه لما جيئ فيه بذكر الآجر لم يذكره بلفظه ولا بلفظ القرمد، ولا بلفظ

الطوب الذي هو لغة أهل مصر؛ فإن هذه الأسماء مبتذلة، لكن ذكر في القرآن على وجه آخر وهو قوله: ﴿وقال فرعون يا أيها الملأ ما علمت لكم من إله غيري فأوقد لي ياهامان على الطين فاجعل لي صرحا﴾ فعبر عن الآجر بالوقود على الطين.

''اگر آپ قرآن کریم میں موجود اساسی فصاحت وبلاغت کے نکات ومعارف ملاحظہ کرنا چاہیں تو ذرا اس مقام پر نظر کیجئے جب قرآن کریم نے پکی اینٹ کا تذکرہ کرنا چاہا تو اس کے لئے وضع کردہ لفظ ''القرمد'' یا ''الطوب'' جو اہل مصر کی لغت تھی، استعمال نہ فرمایا، اس لئے کہ یہ الفاظ گھٹیا اور کثیر الاستعمال تھے بلکہ اس پکی اینٹ کا معنی کی کامل ادائیگی کے لئے قرآن نے ایک منفرد طرز اپنایا، باری جل شانہ کا ارشاد ہے: ﴿وقال فرعون يا يها الملأ ما علمت لكم من اله غيرى فاوقد لى يا هامان على الطين فاجعل لى صرحاً﴾۔ غور فرمایئے کس حسن وخوبی سے ''پکی اینٹ'' کے لئے ''الوقود على الطين'' کی تعبیر استعمال فرمائی گئی۔''

راقم کہتا ہے کہ: اس تعبیر کے متعلق مفسرین نے ایک نکتہ یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ: فرعون کے زمانہ سے قبل لوگ ''القرمد'' اور ''الطوب'' کو نہیں پہچانتے تھے، اس عجیب تعبیر میں اس اینٹ کی صنعت اور کاری گری کی رہنمائی کرتے ہوئے ''القرمد'' کی حقیقت واضح کی گئی ہے، ان متعدد معارف کے پائے جانے میں کچھ اشکال نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ لطائف واسرار متعدد ہو سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ: خدائے پاک کی روشن کتاب کی فصاحت اور اس کے حیران کن اعجاز کی آب وتاب کے متعلق اسرار ونکات کے استنباط میں ایسے گرانمایہ معارف ولطائف معلوم ہوئے ہیں جو عجب خیزی اور شان وشوکت میں وہ مرتبہ رکھتے ہیں کہ ان کے حسن وجمال، خوبی

وکمال، رونق وبہجت اور حسن سبکی وسلاست کے متعلق انسانی عقول سرگرداں رہ جاتی ہیں۔ معارف قرآنی کا موضوع تو بحر ناپیدا کنار کی مانند وسیع ہے، جس کے ایک قطرہ کو میں نے یہاں بکھیرا ہے اوراس پھوٹتے چشمے کی چند بوندیں ہی یہاں گرائی ہیں، وگرنہ انسانی عقول کے لئے نظم قرآنی کے تمام محاسن کا ادراک ناممکن ہے، بلکہ ان محاسن کے استخراج میں انسانی عقول سرگردانگی اور ہوشربائی کا شکار ہیں اور انسانی ظنون داوہام ان محاسن کی پھیلی وسیع وادیوں میں کم عقلی ونا سمجھی کی بناء پر متحیر ہورہے ہیں۔

ابن الاثیرؒ فرماتے ہیں: اس فن میں غوطہ زنی کرنے والوں کو چاہئے کہ ان محاسن کے متعلق خوب فکر وتامل کریں اور یہ جان رکھیں کہ ان محاسن کے ہر گوشہ میں کئی خزانے پوشیدہ ہیں اور یقینا جب وہ بوقت استعمال ان الفاظ قرآنی کے اسرار میں غور وفکر کریں گے اوران کے متعلق قیاسات واعتبارات کے سمندر میں غوطہ زن ہوجائیں گے تو کئی تعجب خیز لطائف وغرائب پائیں گے۔

یہ نظم قرآنی کی باعتبار مفردات کے چند وجوہ اعجاز تھیں جو میں نے اس لئے بیان کردیں تاکہ حضرت شیخ کشمیریؒ کے کلام کی وضاحت ہوجائے۔

اعجاز قرآنی باعتبار ترکیب نظم قرآنی

حضرت شیخ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

"قرآن کریم کا اعجاز باعتبار ترکیب وترتیب کے اس طور پر ہے کہ قرآن کریم کلام کی مختلف ترکیبات میں سے اس ترکیب کا انتخاب کرتا ہے جو موقع ومحل کے مناسب ہو اور ظاہری فکر میں مذاق سلیم بھی اس ترکیب سے اکتاہٹ اور ملال محسوس نہ کرے، بہرحال قرآن کریم ہرصورت میں ایسی ہی ترکیب کا چناؤ کرتا ہے جس سے بلیغ ترین حقیقت کو مکمل بیان کردینے والی اور مقصد ومطلب کی مکمل عکاس ترکیب کوئی اور نہیں ہوسکتی ہے۔

اس کی مثال باری جل شانہ کے اس ارشاد گرامی سے واضح ہوتی ہے: "وجعلوا للہ شرکاء الجن" سطحی رائے کے مطابق تو یہاں ترکیب عبارت یوں ہونی چاہئے تھی: "جعلوا

الجن شرکاء لله" لیکن چونکہ قرآن کریم کا مقصد یہ ہے کہ: ان مشرکین نے اللہ ہی کے لئے شرکا ٹھہرائے ہیں نہ کہ کسی اور کے لئے یعنی اس معبود برحق کے لئے شرکا ٹھہرائے ہیں جو محض اکیلا ہے اور ہر شریک سے مستغنی ہے، اب یہاں پر لفظ "لله" کی تقدیم میں ان کے اس فعل شنیع کے قبح کو مزید بڑا کر کے دکھلایا گیا ہے کہ یہ نری جہالت وحماقت ہے، پھر ان مشرکین نے محض اللہ کے شریک ٹھہرانے پر اکتفاء نہ کیا، بلکہ شرکا ٹھہرائے تو بھی "جن" ٹھہرائے جو اللہ کی مخلوقات میں ایک کمزور مخلوق ہے، اس طرح ان کے اس فعل شنیع کی قباحت کے بیان میں مزید اضافہ ہو گیا اور جنوں کو شریک ٹھہرانا مزید قبیح معلوم ہونے لگا جو ان کی ایک اور بڑی جہالت وحماقت تھی، چنانچہ جس غرض وہدف کے لئے اس کلام کو لایا گیا ہے یہ اسی وقت بخوبی تمام ہو سکتی تھی جبکہ قرآن کریم ہی کی اختیار کردہ ترکیب استعمال کی جاتی۔

اسی طرح قرآن کریم کا یہ طرز وانداز رہا ہے کہ ظاہر مقام جس ترکیب کا متقاضی ہے، اس ترکیب سے ہٹ کر قرآن ایسی ترکیب پیش کرتا ہے جو اپنے اندر معارف ولطائف کے بیش بہا خزانے سموئے ہوتے ہیں اور یہی اسرار ونکات انسانی افکار کو جلا بخشتے ہیں اور انسانی عقول کو براہ راست کھٹکھٹاتے ہیں۔"

راقم کہتا ہے کہ: قرآن کریم کی تعبیر کے متعلق شیخ کی اختیار کردہ رائے ممکن ہے اس نکتہ پر مبنی ہو کہ "الجن" یہ "شرکاء" سے بدل ہے۔ ابوسعودؒ نے اپنی تفسیر میں فراء اور ابواسحاق کا یہی قول نقل کیا ہے اور ابوحیانؒ نے اپنی کتاب بحر اور نہر میں حوفی اور ابوالبقائی کا بھی مختار مسلک یہی بتلایا ہے۔

پھر فرمایا: یہاں پر "الجن" اور "شرکاء" میں نسبت بدلیت ثابت کرنے پر یہ شبہ وارد ہو سکتا ہے کہ بدلیت کا قول درست نہیں، اس لیے کہ یہاں پر بدل کو مبدل منہ کی جگہ پر رکھنا درست نہیں، جب کہ یہ تو بدل میں شرط ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت شیخ کی رائے کو ان نحویین کے مسلک پر مبنی قرار دیا جائے جن کے ہاں بدل میں یہ شرط نہیں ہے، بہر حال یہ اس بحث کی جگہ نہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ "الجن" کو مفعول اول مؤخر قرار دیا جائے اور یوں کہا جائے کہ مفعول ثانی "شرکاء" کی تقدیم اسی مذکورہ نکتہ کی وجہ سے کی گئی ہے اور شیخ کے کلام سے بھی بظاہر ایسا محسوس ہو رہا ہے۔

ہر دو تقدیر کے مطابق لفظ جلالۃ "لله" لفظ "شرکاء" ہی کے متعلق ہے اور اسی اہتمام کی بناء پر مقدم کیا گیا ہے جو میں نے معنی کے بیان میں لکھا اور جس کی میں نے بجا طور پر لفظی تفسیر میں رعایت رکھی۔

انہی دونوں احتمالات کے مطابق علامہ زمخشریؒ نے "کشاف القرآن" میں بحث فرمائی ہے، تفصیلات وہیں دیکھی جا سکتی ہیں، علامہ زمخشریؒ کے الفاظ یہ ہیں:

فإن قلت: فما فائدة التقديم؟ قلت: فائدته استعظام أن يتخذ لله شريك من كان ملكا أو جنيا أو إنسيا، ولذلك قدم اسم الله على الشركاء.

"چنانچہ اگر آپ یوں اشکال کریں کہ: اس تقدیم میں کیا فائدہ ہے؟ تب میں اس کے جواب میں یوں کہوں گا کہ اس تقدیم کا فائدہ خدا کے لئے شریک ٹھہرانے کی مذمت کو بصورت عظمت بیان کرنا ہے، چاہے یہ شریک انسی، ملکی یا جنی ٹھہرایا جائے، اور اسی نکتہ کے لئے لفظ جلالہ "الله" کو "شرکاء" پر مقدم کیا گیا ہے۔

اس موضع کے ذیل میں چند دیگر تراکیب بھی علمائے کرام اور مفسرین عظام نے بیان فرمائی ہیں، لیکن ان کے بیان میں مزید فائدہ معلوم نہیں ہوتا اور نہ ان نحوی تراکیب پر حضرت شیخ کے کلام کی بناء درست ہے۔ مبحث مذکور یہاں تمام ہوا۔

حضرت شیخ اپنی کتاب "نيل الفرقدين" کے خاتمہ میں رقمطراز ہیں:

ومن المعلوم أن لا ترادف في المفردات عند المحققين وكذا في المركبات فضرب زيد عمرا، وضرب عمرا زيد، وزيد ضرب عمرا، كلها تراكيب متغايرة في المعاني الثواني، وكذا زيد قائم، وقائم زيد، وزيد

القائم، والقائم زید.اھ

''علماء کرام کے ہاں یہ بات معروف ہے کہ محققین کے نزدیک نہ مفردات میں ترادف پایا جاتا ہے اور نہ ہی مرکبات میں، چنانچہ ''ضرب زید عمرا، ضرب عمرا زید، زید ضرب عمرا'' یہ تمام مختلف تراکیب مختلف معانی کے لئے مستعمل ہوتی ہیں، اسی طرح ''زید قائم، قائم زید، زید القائم'' اور ''القائم زید'' اپنے مواقع میں علیحدہ علیحدہ معانی ومطالب کے لئے مستعمل ہوتی ہیں۔''

راقم کہتا ہے کہ: ترتیب اور ترکیب کی یہ جہت معنی کے اعتبار سے ہے اور اسی پر معنوی بلاغت کا دارومدار ہے اور بسا اوقات یہ ترتیب وترکیب ایسے لطائف ودقائق کو محیط ہوتی ہے جن کا ادراک اور تنبہ صرف انہی کو حاصل ہوتا ہے جنہوں نے علوم بلاغت میں بڑا حصہ پایا ہو، جیسا کہ زمخشریؒ اور جرجانیؒ جیسے اہل بلاغت زمانہ ماضی میں ہمارے لیے بہترین مثالیں بن کر گذرے ہیں، بشرطیکہ اب ان جیسا کوئی ہو۔اس لئے یہ جہات ترکیبیہ وترتیبیہ بہت ہی اہم اور قابل صد التفات ہیں، چنانچہ حضرت شیخ نے ان جہات کے متعلق بحث وتمحیص فرمائی۔

نظم کلام کی ترتیب کی دیگر جہات بھی ہیں، مثلاً مناسبت بین الکلامین، کلام کی آب وتاب، حسن وجمال، سلاست لفظی، عیب داری سے سلامت، سننے کے بوجھل پن اور نفس کی کراہت سے حفاظت، گویا کہ کلام بہترین ترتیب پر بنایا گیا ہوا، ورانوکھے قالب میں ڈھالا گیا ہو۔ابن الاثیرؒ وغیرہ علمائے فن نے ان مباحث پر تنبیہ فرمائی ہے، کچھ حرج نہیں کہ مقام ہذا کے حق کی ادائیگی اور مقصود بحث کو واضح کرنے کی غرض سے چند امثلہ ذکر کردی جائیں، چنانچہ ملاحظہ ہوں:

ابن الاثیر ''المثل السائر'' (ص:۵۷) پر فرماتے ہیں:

جان لینا چاہئے کہ تراکیب نظم میں تفاوت وتفاضل مفردات کے تفاوت وتفاضل سے کہیں زیادہ وقوع پذیر ہے، اس لئے کہ ترکیبی جہات کی رعایت مفردات کے تفاوت سے کہیں مشکل اور مبہم ہے، آپ خود ہی دیکھ لیجئے کہ قرآن کریم کے مفرد الفاظ کو تو گذشتہ عرب بھی استعمال کرتے تھے اور بعد کے عرب بھی اور ان کے اس استعمال کے باوجود قرآن کریم بہرحال ان کے تمام کلام پر واضح برتری اور تفوق کا حامل ہے اور یہ اسی ترکیب قرآنی کا تعجب خیز خاصہ ہے۔

اور کیا آپ باری جل شانہ کے اس قول مبارک کو ملاحظہ کرنے کے بعد بھی ہمارے اس نقطۂ نظر میں شش و پنج میں مبتلا ہو سکتے ہیں؟ ملاحظہ کیجئے: باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وقيل يا أرض ابلعي ماء ك و يا سماء أقلعي وغيظ الماء وقضي الأمر واستوت على الجودي وقيل بعدا للقوم الظالمين﴾

آپ جو اس آیت میں نمایاں امتیاز محسوس کرتے ہوں گے، وہ محض اس کی ترکیب وترتیب کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور یہ حسن وخوبی اس لئے یہاں جاگزیں ہوئی ہے کہ جملہ اولیٰ جملہ ثانیہ کے ساتھ، جملہ ثانیہ جملہ ثالثہ کے ساتھ اور جملہ ثالثہ جملہ رابعہ کے ساتھ منظم اور مربوط ہے۔

اب بھی اگر آپ کو کچھ شک کی کیفیت باقی ہے تو یوں غور کریں کہ اگر آپ اس آیت میں مستعمل الفاظ میں سے کسی لفظ کو علیحدہ کرتے اور اس کو منفرد استعمال کرتے تو کیا ایسی صورت میں یہ حسن وخوبی جو اس آیت میں رکھے گئے ان کلمات کے خاص موضع وموقع میں نکھر کر واضح ہوئی تھی، کیا بصورت انفراد واضح ہوتی؟ اس نقطۂ نظر کی شہادت اور تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ کبھی آپ کوئی لفظ کسی کلام میں پاتے ہیں تو وہ لفظ آپ کو پسند آتا ہے پھر وہی لفظ ایک دوسرے کلام میں آپ پاتے ہیں تو وہ قبیح محسوس ہوتا ہے، اس واضح امر کا تو وہی شخص انکار کرسکتا ہے جس نے اب تک فصاحت وبلاغت کا ذائقہ نہ چکھا ہو اور الفاظ کے انفراد وترکیبی استعمال کے لطیف اسرار سے ناآشنا ہو۔

میں آپ کو ایک مثال بیان کرتا ہوں جو میری رائے کی صحت وواقعیت پر گواہی دے گی، اور وہ مثال یوں ہے کہ کبھی کبھار ایک لفظ قرآن کریم میں وارد ہوتا ہے اور شعر میں بھی مستعمل ہوتا ہے لیکن قرآن کریم میں تو اس لفظ میں فصاحت ومتانت پائی جاتی ہے، جبکہ شعر میں مستعمل یہی لفظ بے ربط اور ناموزوں ہوتا ہے۔ اس لفظ کہ متضاد اثر میں اس کی جہت ترکیبیہ ہی کا عمل دخل ہوتا ہے۔ آیت قرآنی ملاحظہ کیجئے:

﴿فإذا طعمتم فانتشروا ولامستأنسين لحديث إنّ ذالكم كان يؤذى النبى فيستحيي منكم والله

لا يستحيي من الحق﴾

اوراب شعر ملاحظہ کیجئے جوابوالطیب المتنبی کا ہے:

تلذ له المروءة وهى تؤذى
ومن يعشق يلذ له الغرام

ترجمہ: ''شرافت ومروت اس کے لئے لذیذ ہے، حالانکہ یہی مروت ایذاءرساں بھی ہےاور جوعشق کرتا ہےاس کے لئے محبت کا بوجھ بھی لذیذ ہوتا ہے۔''

متنبی کا یہ شعر معنوی شرافت وکرامت کے اعتبار سے عمدہ شعر ہے ،لیکن لفظ ''تؤذی'' جو یہاں استعمال ہوا وہی قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ،لیکن اس لفظ کے ضعف ترکیبی کی وجہ سے اس شعر کی قدر گھٹ گئی ،لیکن قرآن کریم میں اس کے موقع حسنہ میں وقوع کی وجہ سے مزید حسن ونکھار نمایاں ہوا۔

اب غور فکر کرنے والے قاری سے درخواست ہے کہ! گذشتہ سطور میں ہمارے بیان کردہ نقطہ فصاحت کے متعلق انصاف کرے' اور اپنی طبع سلیم پر اس نقطہ نظر کو پیش کرے، تا کہ اس کی صحت کو جانچ پرکھ کر سمجھ لے، یہ مبحث کچھ پیچیدہ بھی ہےاور خوب غور وفکر اور نقد ونظر کا محتاج ہے،اس مبحث پر مجھ سے قبل کسی نے تنبیہ نہیں کی۔

یہی لفظ ''تؤذی'' جب مستعمل ہوتو مناسب یہ ہے کہ اس کا مابعد کے ساتھ معنوی ربط اور لفظی تعلق ہو، جیسا کہ باری جل شانہ کے فرمان اقدس میں دیکھئے: ''إنّ ذلكم كان يؤذى النّبى'' اور متنبی کے کلام میں یہ لفظ منقطع واقع ہوا ہے،اوراس نے یوں استعمال کیا: ''تلذ المروءة وهى تؤذى'' اور پھر اس لفظ کے استعمال پر کلام کو ختم کر کے جملہ مستأنفہ سے کلام شروع کیا اور یوں گویا ہوا: ''ومن يعشق يلذ له الغرام'' انتهى ما قال ابن الأثير۔

صفحہ: ۴۷ پر رقمطراز ہیں:

وأما إذا صارت مركبة فلتركيبها حكم آخر، وذاك أنه يحدث عنه من فوائد التأليفات والامتزاجات ما يخيل للسامع أن هذه الألفاظ ليست تلك التي كانت

منثورة مبددة، وفي عكس ذلك من أخذ لآلى من ذوات القيم الغالية، فيفسد تأليفها، فإنه يضع من حسنها، وكذلك يجرى حكم الألفاظ العالية مع فساد التأليف، وهذا موضع شريف ينبغى الالتفات إليه والعناية به.

''اور جب یہی مفردات بصورت ترکیب مستعمل ہوں تو ان کی ترکیب وتنظیم کا کچھ اور حکم ہوتا ہے، اس لئے کہ اس تالیف وتنظیم اور مختلف الفاظ کے حسین امتزاج سے کچھ ایسے فوائد واضح ہوتے ہیں جن سے سننے والے کو یہ واہمہ ہوتا ہے کہ یہ وہ مفردات نہیں ہیں، بلکہ حسن وخوبی اور لطیف معنو ت رکھنے والے کچھ اور مفردات ہیں، اس کی مثال یوں کہ ایک شخص چند ایسے موتی جو انتہائی قیمتی نہ ہوں، اکٹھے کر لے اور پھر ان موتیوں کو جوڑ کر اچھی ترتیب وتنظیم کے قالب میں ڈھال لے، چنانچہ اس خوبصورت تنظیم اور مضبوط کاریگری کی وجہ سے دیکھنے والا یہ خیال کرے گا کہ یہ وہ پچھلے بکھرے موتی نہیں ہیں، اس کے برعکس اگر وہ شخص قیمتی یواقیت ودرر جمع کرے، لیکن اس کی ترتیب وتنظیم کوتاہ ہو تو اس ترتیبی فساد کی وجہ سے ان کا حسن کافور ہو جائے گا۔ یہی حال عمدہ الفاظ کی فاسد ترکیب وترتیب کا ہے، یہ مبحث واقعی لائق اعتناء اور قابل قدر ہے۔ انتہی''

امام رازیؒ نے اپنی تفسیر مفاتیح الغیب (۲-۵۶۴) سورۃ البقرۃ کے اواخر آیات کی تفسیر کے ذیل میں یوں بیان فرمایا کہ:

ومن تأمّل في لطائف هذه النظم وفي بدائع ترتيبها، علم أن القرآن كما أنه معجز بحسب فصاحة ألفاظه وشرف معانيه، فهو أيضا معجز بحسب ترتيبه ونظم آياته، ولعل الذين قالوا، إنه معجز بحسب أسلوبه أرادوا به ذلك.

''جو شخص نظم قرآنی کے لطائف اور اس کی ترتیب کے عجائب میں غور وتامل بروئے کار لائے گا وہ یہ بات ضرور جان لے گا کہ جس طرح قرآن کریم اپنے الفاظ کی فصاحت اور اپنے

معانی ومطالب کی سلاست کی وجہ سے معجز ہے، اسی طرح اپنی ترتیب وتالیف اور نظم آیات میں بھی معجز ہے اور جن حضرات نے یوں تعبیر کی کہ: ''قرآن کریم اپنے اسلوب کے اعتبار سے معجز ہے'' شاید ان کا بھی مقصد اسی اعجاز تنظیمی کی طرف اشارہ کرنا تھا۔''

امیر یمنی نے ''الطراز'' کی تیسری جلد میں فن ثالث (جو الفاظ قرآنی کے چار وجوہ سے حاصل شدہ اس خصوصی امتیاز کے بیان پر مشتمل ہے، جس کی بناء پر قرآن کو فصاحت وسلاست میں نمایاں مقام اور بلاغت وبیان میں عالی مرتبہ حاصل ہے) کہ ذیل میں اس بحث پر تنبیہ کی ہے، چنانچہ جلد: ۳، ص: ۲۱۹ پر فرماتے ہیں:

''وہ خصوصی امتیازات جو قرآنی الفاظ کی طرف راجع ہیں، کبھی تو ان کا تعلق مفردات الحروف سے ہے، کبھی ان حروف کی تالیف وترتیب سے، کبھی مفردات الفاظ سے اور کبھی الفاظ مرکبہ سے، یہی وہ چار وجوہ ہیں جو کسی بھی لفظ کے فصیح ہونے میں لازمی طور پر معتبر ہوتی ہیں، اور یہ چاروں قرآن میں کامل طور پر موجود ہیں۔''

پھر ان وجوہ اربعہ کی امیر یمنی نے تفصیل وتوضیح فرمائی ہے اور ان چار وجوہ پر حاوی باری جل شانہ کے فقط اس قول سے مثال بیان فرمائی ہے: ''وقيل يا أرض ابلعي ماءك ......الأية'' پھر اس آیت کی تشریح کے ذیل میں خوب طوالت واطناب سے کام لیتے ہوئے تفصیلی بحث فرمائی ہے اور اس آیت کے اچھوتے پہلوؤں، الفاظ کی آب وتاب، نظم کلام کے ظاہر محاسن، پوشیدہ باطنی دل نشین معارف اور افرادی وترکیبی، وضعی وترتیبی، لفظی ومعنوی، مختلف جہات کو علم بیان، علم معانی اور علم بدیع کی روشنی میں خوب بیان فرمایا ہے، یہ بحث ص: ۲۲۶ سے ص: ۲۵۰ تک لطائف ومعارف سے کچھ اس طرح محیط ہے کہ عقلمند ذی ہوش پر ہر باب میں تسلی اور راحت کا غلبہ ہوتا ہے اور ذی فکر وذی شعور طبقہ علماء کے لئے روحانی سرور وسرود کا سامان بہم مہیا کرتی ہے، امام یمنیؒ کی تعبیر وبیان کا انداز بھی ایسا ہے کہ حسن وخوبی میں گویا بہتا ہے اور لوگوں کے قلوب میں سرایت کر جاتا ہے اور آپ کو ذوقی ووجدانی کیفیات کے ساتھ معرفت ویقین کے آئینہ میں نور وبرہان دکھلا کر سکینت وطمانیت کا فرحت بخش احساس فراہم کرتا ہے۔ اللہ رب العزت موصوف

کو ہماری اور سارے مستفیدین کی طرف سے وہ بہتر بدلہ عطا فرمائے جو بدلہ رب کریم محسنین ومخلصین کو مرحمت فرماتے ہیں۔

طوالت کا خوف اور خارج از بحث کلام سے اس طرح بچنا کہ ایجاز واختصار جو اس مضمون میں مقصود ہے فوت نہ ہونے پائے، یہ خوف اور بچنا دونوں قلم کی لگام کو اشارات پر اکتفا کرتے ہوئے تفصیلات کے ذکر سے کھینچ رہے ہیں۔

صاحب بصیرت قارئین کرام! میرا خیال ہے کہ آپ کو اجمالی طور پر شیخ کے بیان کردہ قرآن کریم کے ایسے نظم وبیان اور مضبوط ومحکم ترتیب وتنظیم کے متعلق اعجاز قرآنی کی ان منتخب اقتباسات کی روشنی میں شناسائی ہوئی ہوگی اور آپ نے شیخ کے ان رشحات قلم سے شفایابی کا سامان پایا ہوگا اور امید ہے کہ آپ نے قرآن کریم کی ہر دو جہت فصاحت کو مکمل طور پر جان لیا ہوگا یعنی ایک فصاحت مفردات ہے جو باعتبار حروف کی باہمی مناسبت اور ربط، سماعت پر ان کی خفت، گویائی میں سلاست اور مطلوب ومقصود حقیقت کو مختلف پیرائے الفاظ میں تمام ایسے اغراض کا احاطہ کرتے ہوئے واضح کرنا ہے جن کے کلی حقائق سے فقط علیم وخبیر ہی باخبر ہے۔

اور دوسری فصاحت مرکبات جو باعتبار ان کے باہمی ربط وتعلق، ہر مرکب جملہ کا اس طرح اپنے موقع ومحل میں ہونا کہ گویا ہر اگلا جملہ اپنے پچھلے جملے کے پچھلے دھڑ کو تھامے ہوئے ہے اور پھر ان مرکبات کے مطلوبہ معانی کے اعتبار سے جن کے لئے شان وشوکت والی ترتیب ڈھالی گئی اور دقیق اغراض واشگاف کی گئی ہیں، جو کچھ میں نے ذکر کیا اس میں ایک صاحب بصیرت طالب علم کے لئے کفایت ہے اور اس میں پندوموعظت کی بھی باتیں ودیعت ہیں، یہ نصائح اس شخص کو بخوبی نفع دیں گی جو قلب سلیم رکھتا ہو اور غور سے حاضر باشی وحاضر دماغی کے ساتھ سنتا ہو۔

اعجازِ قرآنی باعتبار مقاصدِ قرآنی

شیخ باعتبار مقاصد کے قرآنی اعجاز کو ثابت کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ:

''مقاصد سے میری مراد وہ امور ہیں جن کا سیکھنا، سمجھنا اور ان کے رنگ میں رنگ جانا، مخلوقِ خدا سے ان کے مطابق معاملہ کرنا مخاطبین کے لیے ضروری ہے، جیسا کہ علمائے امت نے

اسماء حسنیٰ کی شرح کے متعلق ان جملہ امور واحکام کے متعلق بحث فرمائی ہے''۔اردو میں حضرت شیخ کے الفاظ یوں ہیں:

''مقاصد سے میری مراد مخاطبین کو سبق دینا یا لینا ہے ،
جیسا کہ علمائے کرام نے اسمائے حسنیٰ کی شروح میں لکھا ہے''۔

چونکہ حضرت شیخ کے کلمات مختصر تھے اور اس کلام کے متعلق مجھے کما حقہ شرح صدر نہ ہوا تھا،اس لئے میں نے اس کے بارے میں حضرت شیخ محقق علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے دریافت کیا اور ان کے سامنے یہ عبارت پیش کی' چنانچہ انہوں مجھے یہ عبارت بھی سمجھائی اور حضرت عارف باللہ فقیر اللہ بن عبد الرحمن التراسی جلال آبادی علوی حنفی افغانیؒ کی کتاب "قطب الإرشاد" کے مطالعہ کرنے کو کہا، ذیل میں میں اپنے استفادہ کے مطابق ان مباحث کا منتخب خلاصہ ذکر کئے دیتا ہوں، ملاحظہ ہو:

اسماء حسنی وصفات باری تعالی

راقم عرض گذار ہے کہ اسمائے حسنی کے متعلق مندرجہ ذیل تین امور قابل توجہ اور قابل غور ہیں:

۱-مرتبۂ علم ۲-مرتبۂ اعتقاد ۳-مرتبۂ عمل۔

چنانچہ ان اسمائے حسنیٰ کے تحقق کا مطلب علمائے امت کے ہاں یہ ہے کہ بندہ اللہ جل شانہ کے ان اسماء کے معانی کے ساتھ متصف ہونے کا قلبی اعتقاد رکھے اور ان معانی کی معرفت اور شناسائی میں ان تمام اقدار کا لحاظ رکھے جو باری جل شانہ کی عظمت وکبریائی سے متعلق ہیں،اس لئے باری جل شانہ کو اس کی مخلوقات میں سے کسی مخلوق کی طرح نہ گردانے اور نہ اس کی کسی صفت کو مخلوقات کی صفات پر قیاس کرے۔

پس پختہ عقیدہ رکھے کہ اس کی ''بصر'' ہے،لیکن مخلوق کی آنکھوں کی مانند ہرگز نہیں ہے ،اس کے لئے خاصہ ''سمع'' ہے،لیکن مخلوقات کی کیفیاتِ سمع کی مانند ہرگز نہیں ہے،اسی طرح تمام صفات میں لحاظ رکھے اور باری جل شانہ کی ان صفات ردئیہ سے جو باری تعالیٰ کی کبریائی وبزرگی

کے متضاد ہیں یا مناسب نہیں ہیں، ان سے باری تعالیٰ کی تقدیس وتمجید بیان کرتا رہے اور یہ خیال بھی رکھے کہ اس کی مانند کچھ بھی نہیں، وہ سمیع وبصیر ہے، اس اعتقاد میں اپنی بشری مقدرت کو انتہائی طور پر بروئے کار لائے۔

اسی طرح ان اسمائے حسنیٰ کے ساتھ تعلق کا مطلب علمائے کرام یہ لیتے ہیں کہ جب خداوند بزرگوار سبحانہ وتعالیٰ کبریائی اور عظمت وبزرگی کی ان اعلیٰ صفات کے ساتھ متصف ہے اور اسمائے حسنیٰ کا موضوع حقیقی ومنفرد ہے تو اب اس کے بندہ کو اس کے پیش نظر کیا کرنا چاہئے؟ اور اس کا تعلق اپنے خالق کے ساتھ کیسا ہونا چاہئے؟ چنانچہ علمائے کرام نے بخوبی واشگاف کیا ہے کہ تب بندہ کو چاہئے کہ اللہ رب العزت کی صفات جلالیہ وجمالیہ کا اس قدر استغراقی مراقبہ کرے کہ باری تعالیٰ کا تصور ہمہ وقت اس کے دل میں جاگزیں ہوجائے اور ان صفات واسماء کے آثار وانوار کے مطالبات کے سامنے سرنگوں ہوجائے اور قلبی طور پر ان کے تقاضوں کے روبرو سرتسلیم خم کردے، یہاں تک کہ اس پر ان کے انوار وتجلیات کے آثار ونقوش نقش ہوجائیں۔ اور جہاں تک ان اسمائے حسنیٰ کے ساتھ تخلق کا تعلق ہے تو اس کا مطلب علماء نے یوں لیا ہے کہ بندۂ خدا ان صفات ربانیہ کے رنگ میں رنگ جائے اور عملی طور پر ان کو تسلیم کرلے، جس کی بناء پر وہ صفات باری تعالیٰ میں سے ہر ہر صفت کا گویا مظہر بن جائے، پس مخلوق کے ساتھ اس کے معاملات کی کیفیت اس طور پر ہو کہ اس میں اس استخلاف ونیابت کے آثار جھلکنے لگیں کہ واقعی اس کو خداوند بزرگوار نے زمین میں اپنا خلیفہ اور اپنی صفات کا مظہر بنایا ہے اور حدیث شریف میں بھی وارد ہوا ہے:

"إنّ الله خلق آدم على صورته فجعله سميعا بصيرا
وهداه إلى الخير والشر والحق والباطل"

چنانچہ بندۂ خدا سے مطلوب یہ ہے کہ اس کے اعمال باری تعالیٰ کے شئون کے موافق ہوں، چنانچہ وہ عمدہ خصائل، بہترین صفات پر ستائش، افعال وکردار اور قیمتی اعمال کا حامل ہو اور انہی اعمال کے نتیجے میں تمام مخلوق کے ساتھ بغیر کسی دنیوی منفعت وغرض کے جو اسے اس کے دنیوی مقاصد میں برآری کے لئے مقصود ہو معاملہ رکھے، بلکہ سوائے رضائے خداوندی اور

خوشنودی پروردگار عالم کے کسی شئ کا خواہاں نہ ہو اور یہ گمان رکھتا ہو کہ اس نے اپنا ایک واجبی فعل ادا کیا ہے اور محض اپنے منصب کے تقاضہ کو بھی پورا کیا ہے، یہ ہے اللہ رب العزت کے اسمائے گرامی کے ساتھ تخلق کا حاصل۔ یہی ہے صفات خداوندی کے ساتھ رنگ جانے کا مطلب۔

اب ہم ایک مثال ذیل میں درج کرتے ہیں جس سے یہ تینوں مراتب بخوبی روشن ہو جائیں گے۔ لفظ "الرحمٰن" اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم مبارک ومحترم ہے، اس کے متعلق مرتبہ تحقیق تو اس بات کی معرفت ہے کہ اللہ رب العزت کے لئے عظیم رحمت کی صفت ہے، یہ صفت ازلی، ابدی اور خداوند کی بقاء کے ساتھ ہمیشہ باقی ہے اور باری جل وعد اس صفت کے ساتھ حقیقتاً وواقعتاً متصف ہیں، اگر چہ اس صفت کی مکمل حقیقت کا ادراک اور اس کے متعلق مالہا وماعلیہا تفصیلات کی شناسائی نہ ہو سکے۔

اسی طرح یہ اعتقاد رکھنا کہ مخلوقات میں جو رحمت کی صفات پائی جاتی ہیں، یہ اسی رحمت عظیمہ کے آثار وانوار سے مقتبس نور واثر ہے اور اسی چشمے کا قطرہ اور چھوٹی نہر سے مستفاد ہوتا ہے، خداوند کی ذات اس سے برتر وبالا ہے کہ اس کی کوئی مخلوق اس کے ساتھ اس صفت میں مشارکت ومسابمت رکھتی ہو "ليس كمثله شيئ وهو السميع البصير" اور اس صفت رحمت کے ساتھ مرتبہ تعلق کا مطلب یہ ہے کہ: بندۂ خدا، خدا کے حضور اپنے مقدور بھر قویٰ وجوارح سے عاجزی اور فروتنی کرے، اس کا ظاہر وباطن، اپنے قیام وقعود، سونے جاگنے میں انکساری کا گویا مظہر ہو اور ایسا شکر ادا کرے جو اس کی اس رحمت کے لائق ہو، جو رحمت غیر محدود ہے اور اعضاء وجوارح، قلب ولسان سے اس رحمت بے پایاں کو کسی شمار میں گنا نہیں جا سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی جان رکھے کہ اس رب کے ان بیش بہا احسانات وانعامات کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری واجب ہے۔

اسی طرح اس صفت رحمت کے ساتھ مرتبہ تخلق یہ ہے کہ: آدمی اس رب کے بندوں پر مہربان ہو، مصائب میں ان کی غمگساری کرے، شدائد میں فریادرسی کرے، اپنے ذاتی مال سے ان پر خرچ کرے اور اس مہربانی کرنے کو جملہ واجبات کا حصہ سمجھے اور اپنے عہدہ اور منصب کا

تقاضہ سمجھے اور محض خالق و مالک کی خوشنودی تلاش کرے، اس کے علاوہ اور جو "رحمت" کے متعلق باری جل وعلا کے شؤن ہیں، ان کو اختیار کرے۔ اجمالی طور پر اس قدر بحث اس مقام کے مطابق کافی ہے، اس لئے کہ اس مختصر رسالہ میں ان تمام تر تفصیلات کا بیان ناممکن ہے۔

پھر راقم کہتا ہے کہ: ان ہر سہ مراتب میں سے ہر مرتبہ لاحقہ، مرتبہ سابقہ پر متفرع ہے، تخلق تعلق کی فرع اور تعلق، تحقق کی فرع ہے۔ تحقق مرتبہ اعتقاد وتسلیم ہے۔ تعلق مرتبہ صفات نفسانیہ ہے اور تخلق مرتبہ صفات فعلیہ ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ خداوند کی معرفت اور اس پر یقین کی کیفیات کے تفاوت مراتب کے اعتبار سے ان مراتب ثلاثہ میں بھی قوت اور ضعف کا تفاوت پایا جاتا ہے۔ مرتبہ اولیٰ میں کامل شخص، مرتبہ ثانیہ میں اور مرتبہ ثانیہ میں کامل، مرتبہ ثالثہ میں بھی کامل ہوگا۔ اسی طرح طبعی وفطری اخلاق وملکات کے اعتبار سے بھی ان مراتب ثلثہ میں تفاوت کا پایا جانا ممکن ہے، اس لئے کہ بعض بندگان خدا صفاتُ جلالیہ کے رنگ میں ڈھل جانے کو جلد قبول کر لیتے ہیں اور بعض صفات جمالیہ کی کیفیات کے قریب ہوتے ہیں۔ کامل شخص وہی ہوتا ہے جو ان ہر دو قسم کی صفات میں کمال وصلاحیت رکھے۔ تفصیلی بحث کے لئے متعلقہ کتب ملاحظہ کی جاسکتی ہیں، یہاں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

جہاں تک راقم السطور کی رائے ہے تو شیخؒ کا مقصد اپنی اس عبارت سے یہ ہے کہ لوگوں کو چاہئے کہ ان اسمائے حسنیٰ سے پند ونصیحت حاصل کریں اور عبرت وموعظت کے پہلوؤں کو تھامتے ہوئے اپنے جملہ معاملات سرانجام دیں اور اعتقاد رکھیں کہ انسانی کمال صرف انہی اسمائے حسنیٰ کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے اور یہ یقین رکھیں کہ انسانی نجات اور فوز وفلاح کا دارومدار ان اسمائے حسنیٰ کو سمجھنے اور ان اسمائے حسنیٰ کے اس مضبوط کڑے کو تھامے رکھنے میں ہے، جو کڑا کبھی ٹوٹ نہ سکے گا اور یہ بھی جان رکھیں کہ اسی میں ابدی سعادت اور رضائے خداوندی مضمر ہے، چنانچہ اس کے فطری خصائل وشمائل ان اسمائے حسنیٰ کے مقاصد کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے رنگ میں رنگ جائیں گے اور پھر وہ احکام خداوندی کی اطاعت وفرمانبرداری، خداوند تعالیٰ کی بکھری عبرتوں سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ ترغیب وترہیب اور قصص وامثال سے پند ونصیحت حاصل

کرنے میں، قرآنی مصالح وحقائق اور دنیوی واخروی منافع کے حامل اعمال میں تدبر اور غور وفکر کرنے میں، نیز اپنے اعمال کی ابتداء وانتہاء، اپنے ظاہری و باطنی کردار کے متعلق بصیرت حاصل کرنے میں، اسی طرح قرآنی تنبیہات وتعلیمات میں تیقظ اور قرآنی تلمیحات واشارات پر مطلع ورواہ یافتی کے حصول میں گویا اس مردے کی مانند ہو جائے گا جو غسل دینے والے کے زیر تصرف ہو۔ بعد ازاں حضرت شیخ فرماتے ہیں: قرآنی مقاصد تو وہی ہونے چاہئیں جن میں مبدأ ومعاد، اصلاح معاش، اور دنیوی واخروی نجات کا حصول کے اعمال بتائے گئے ہوں۔ حضرت شیخ کے الفاظ یہ ہیں:

''قرآن حکیم کے مقاصد وہ ہونے چاہئیں جن سے مبدأ ومعاش ومعاد اور فلاح ونجاح دنیا وآخرت وابستہ ہو''۔

مقصد یہ ہے کہ قرآنی مقاصد بندگان خدا کو مبدأ ومعاد میں پیش آمدہ احوال کے متعلق تنبیہ کرنا ہے، تاکہ وہ باری تعالی پر جو قدرت واختیار میں منفرد ومتفرد ہیں، اعتقاد الوہیت مضبوط رکھے، وہ خداوند بزرگوار جو آسمان وزمین اور ان کے مابین تمام اشیاء کا اکیلا خالق ہے، اسی طرح یہ بھی اعتقاد رکھے کہ اس کے بہترین اسماء وصفات ہیں، اسی نے تمام مخلوق کو پیدا فرمایا جبکہ اس سے پہلے کچھ نہ تھا، اسی ذات برحق نے انسان کو پیدا کیا، پھر اس کو برابر خلقت سے نوازا، اس کی بہترین صورت بنائی اور اپنی تمام مخلوقات پر اس کو فضیلت وکرامت بخشی اور ان کو ایسا نور بخشا جس کے عکس میں وہ اپنے جملہ امور سے شناسائی حاصل کرے اور کائنات کی بکھری نشانیاں دیکھے، خداوند کے ودیعت کردہ اچھوتے محکم نظام کا مشاہدہ کروانے کے ساتھ ساتھ اس نے انہی تعلیمات کی نشر واشاعت کے لئے رسل وانبیاء بھیجے اور انسان کی راہنمائی کے واسطے کتابیں نازل فرمائیں اور اس کو اس شریعت ودین کی پیروکاری کا حکم دیا جو اس کے معاش ومعاد اور دنیوی واخروی امور میں مکمل نجات ونجاح کا ضامن ہے اور اس انسان کو یہ باور کروادیا کہ یہ دنیا دھوکہ کا سامان ہے، چنانچہ اس کو چاہئے کہ وہ اس کے شان وشوکت، حسن وجمال، دلفریبیت ظاہری آب وتاب اور اس کے آسمانی وزمینی مناظر، ان کی ملاحت وشگفتگی، اور ان کی تازگی اور مٹھاس کو دیکھ کر دھوکہ میں

نہ پڑ جائے ، اس لئے کہ آخر کار رجوع اور انتہائی ٹھکانہ خدا کی طرف جانا ہے اور اس کے ہاں حساب وکتاب کی منازل طے کرنا ہے اور پھر اس کے حکم کردہ ٹھکانہ کو لوٹ جانا ہے، یہ دنیا ہلاک اور فنا ہونے والی ہے اور خبردار تمام معاملات کو اللہ ہی کے ہاں پہنچنا ہے، چنانچہ قرآن کریم نے بھی اس دنیا کے مختلف مراتب اور احوال اور متعدد حالات واطوار بیان فرمائے ، باری جل شانہ کا فرمان ہے:

﴿اعلموا أنّما الحيوة الدنيا لعب ولهو وزينة وتفاخر بينكم وتكاثر في الأموال والأولاد، كمثل غيث أعجب الكفّار نباته ثمّ يهيج فتراه مصفرّا ثمّ يكون حطاما وفي الآخرة عذاب شديد ومغفرة من الله ورضوان وما الحيوة الدنيا إلّا متاع الغرور﴾

ان مقاصد کی رو سے حاصل ہونے والا اعجاز قرآنی بہت نمایاں اور خوشنما ہے اور واقعی یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم خدائے پاک کی زبردست کتاب ہے جو حکیمانہ پند ونصائح سے بھر پور ہے جو ان مذکورہ امور واحکام کو اچھوتے طرز پر نفاست کے ساتھ' انتہائی فصیح ومحکم لہجے میں جو لوگوں کے لئے نرمی کا پہلو بھی رکھتا ہے اور بہت نفع بخش بھی ہے، بیان کرتا ہے۔ اس شریعت حقہ کے مساوی کوئی شریعت شمار نہیں کی جا سکتی اور نہ کوئی کتاب اس کتاب عزیز کی ہمسری کر سکتی ہے اور اسی ہوشربا طرز کے مطابق جس تک پہنچنے سے حکماء اور دانشوروں کی عقول قاصر وکوتاہ ہیں، یہ کتاب پچھلی شرائع الہیہ کا نچوڑ اور خلاصہ پر بھی مشتمل ہے اور گزشتہ ادیان سماویہ کے گویا مغز واساس کی حامل ہے، قرآن کریم نے ان تمام ادیان سماویہ کا مغز اخذ کیا، اس کے نصاب کو مکمل کیا اور ان ادیان سماویہ کی بہترین تعلیمات واحکام کو اختیار کیا' اس کا نچوڑ اور خلاصہ لے کر اپنے اندر سمو لیا، پھر اسی شریعت قرآنی پر ابدی سعادت اور دائمی نجات کا دارومدار ہے، اسی شریعت پر عامل ہو کر رب تعالیٰ کی خوشنودی بھی حاصل کی جا سکتی ہے اور ابدی جنت کی متنوع نعم کے حصول کی صورت میں کامیابی مل سکتی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم نے اجتماعی شعبے، آداب واحکام کا وہ خزانہ عطا کیا ہے جو فطرت انسانی اور نوامیس عالم کے عین موافق ہے، ان آداب واحکام کی قدر

ومنزلت اتنی بلند ہے کہ بشری عقول ان سے زیادہ محکم' بلند پایہ آداب کا تصور نہیں کرسکتی ہیں اور واقعی خداوند تعالیٰ کی مثال بہت اونچی ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی اور خداوند زبردست حکمت والا ہے، کیا اس عالم دنیوی میں کوئی اور کتاب ہے جس کو سعادت ونجات کا مدار ٹھہرایا جاسکے؟

اور کیا قرآن کریم کے وضع کردہ نظام کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسا عمدہ نظام محکم پیش کیا سکتا ہے جو بشری فطرت کے تقاضوں کے عین موافق ہو؟ کیا لوگوں کے پاس اس صحیفے کے علاوہ بھی کوئی صحیفہ ہے جو حق اور صراط مستقیم کی طرف درست رہنمائی کرتا ہو؟ کیا دنیا میں قرآن کریم کے علاوہ بھی کوئی کتاب ہے جو حکمت ونصیحت سے بھرپور اور نور مبین ہو جو بیک وقت لوگوں کے واسطے دنیوی کامیابی' اس کے مراتب عالیہ تک رسائی کے ساتھ ساتھ اخروی جنات نعیم کی کامیاب راہوں کی طرف راہ یابی بھی کرتی ہو؟ باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وإنّه لكتاب عزيز لا يأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد﴾

قرآنی اعجاز بیانِ حقائق کے رو سے

حقائق کے بیان کے اعتبار سے قرآنی اعجاز کے متعلق حضرت شیخ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ: ان حقائق سے میری مراد وہ پوشیدہ امور ہیں جن تک عقل وفہم کی رسائی نہیں ہوسکتی اور انسانی بساط کے پیش نظر بشری فکر وخیال ان امور کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ عقول انسانی ان امور کے متعلق ہمیشہ سرگرداں اور پراگندہ افکار کی حامل رہی ہیں اور ان کے متعلق باہمی نزاع اور مناقشہ کبھی نفع بخش ثابت نہ ہوسکا اور نہ ہی آراء واقوال کے تیر وتلوار ہدف پر پہنچ سکے ہیں۔

مثلاً خلق افعال کے مسئلے ہی کو لے لیجئے، عقلاء وحکماء اس کے متعلق حیران وپریشان ہیں اور اس مسئلے کے متعلق سطحی ادراک سے بھی قاصر ہیں، ان کے طویل غور وخوض اب تک اس حقیقت کو آشکارا نہیں کرسکے ہیں کہ بندہ کا اپنے فعل کے ساتھ تعلق کیا ہے؟ اور کس کیفیت پر ہے؟ پھر اس فعل حادث کا قدرت ازلیہ قدیمہ سے کیا ربط ہے اور اس کی کیفیت کیسی ہے؟ قرآن کریم

ان مشکل اور پیچیدہ مباحث کے بیان میں ایسی کامل اور واقعی تعبیر پیش کرتا ہے کہ بشری قدرت اس تعبیر سے زیادہ مفصل اور واضح عبارت کا تصور ہی نہیں کر سکتی ہے۔

الحمد للہ! شیخ کی اعجاز قرآنی کے متعلق ذکر کردہ چاروں وجوہ: مفردات قرآنی، مرکبات قرآنی، مقاصد اور حقائق کی شرح وتفصیل سے راقم فارغ ہوا اور مجمل عبارات کی بھی خاطر خواہ تفصیل راقم نے بیان کردی۔

مجھے یہ بخوبی علم ہے کہ یہاں ذکر کردہ تفصیل ان زریں وجوہات کے پیش نظر ہرگز کامل ومکمل شمار نہیں کی جاسکتی ہیں، بلکہ ان وجوہ اعجاز کی کماحقہ شرح وبسط کے لئے ایک مستقل دفتر کی ضرورت ہے، جس میں ہر وجہ اعجاز کی مکمل ومفصل توضیح ہو۔ نیز مختلف نظائر کو پیش کرنے کے بعد امثلہ بھی وافر مقدار میں ذکر کردی جائیں، تاکہ اعجاز قرآنی کے متعلق یہ حسین مرقع خوب واضح ہوجائے، جیسا کہ شیشے کے برتن کا شگاف اور فجر کی پو پھٹنا خوب نمایاں ہوا کرتی ہے۔ بہرحال قابل صد اعزاز وقابل اعتبار مباحث میں نے بیان کردی ہیں اور محاورہ بھی یوں استعمال کیا جاتا ہے کہ: "مالا یدرك كله لا يترك" جس چیز کو مکمل حاصل نہ کیا جاسکتا ہو اس کو مکمل چھوڑ دینا دانشمندی نہیں ہے۔

راقم کے خیال میں حضرت شیخ کی تحریر کردہ عبارت کو بعینہ بیان کردینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا متن مضبوط ہے، اگرچہ اثنائے شرح وتفصیل کچھ عبارات میں ذکر کر آیا ہوں، لیکن اس تمام تحریر کو دیکھنے کے بعد اچھی طرح علم ہوجائے گا کہ شیخ کو بلاغت ایجاز اور جامع اختصار میں کس قدر ید طولیٰ حاصل تھا اور حضرت شیخ کس طرح ایک بھرپور مواد کو مختصر کلمات وعبارات میں بند کردیا کرتے تھے اور صاحب فہم وبصیرت اس بات کو بھی جان لے گا کہ شیخ کے کلام کا ایک ایک جملہ بھی اپنی شرح وبسط میں ایک رسالہ کا محتاج ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح تحقیق وتفتیش کی گہرائی وگیرائی تک پہنچنے والے علماء کا امتیاز دیگر علمائے امت سے جو ان سے کم درجہ رکھتے ہیں، نمایاں ہوجائے گا۔ گویا کہ حضرت شیخ نے ہر بعد میں آنے والے مفسر قرآن کے لئے اعجاز قرآنی کی تفسیر وتوضیح کے متعلق چار بنیادی اصول وضع فرمائے ہیں

اور یقیناً ان چاروں امور کا پیش نظر رکھنا اور قرآن کی تفسیر میں ان کے متعلق بحث وتفتیش کرنا مفسر قرآن پر منجملہ امور واجبہ میں سے ایک اہم اور لائق توجہ واجب امر ہے، چنانچہ اب میں ذیل میں شیخ کے الفاظ بعینہ نقل کرتا ہوں:

''قرآن مجید وحکیم کا اعجاز مفردات اور ترکیب وترتیب کلمات اور مقاصد وحقائق کی جملہ وجوہ سے ہے، مفردات میں قرآن مجید وہ کلمہ اختیار فرماتا ہے جس سے اوفی بالحقیقۃ واوفی بالمقام ثقلین نہیں لا سکتے، مثلاً جاہلیت کے اعتقاد میں موت پر توفی کا اطلاق درست نہ تھا، کیونکہ ان کے اعتقاد میں نہ بقاء جسد تھی نہ بقاء روح، قرآن مجید نے موت پر توفی کا اطلاق کیا اور بتلایا کہ موت سے وصولیابی ہوتی ہے، نہ فناء محض، اس حقیقت کو کلمہ سے کشف کر دیا اور کہیں اس لفظ کا اطلاق اپنے اصلی معنی سے جسد مع الروح کے وصول کرنے پر کیا۔

ترکیب وترتیب جیسے "وجعلوا للہ شرکاء الجن" ظاہر قیاس یہ تھا کہ عبارت یوں ہوتی "وجعلوا الجن شرکاء اللہ" لیکن مراد یہ ہے کہ اور وہ شریک بھی کون (جن) پس یہ مراد اسی ترتیب اور نشست الفاظ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

مقاصد سے میری مراد مخاطبین کو سبق دینا یا لینا ہے، جیسا علماء کرام نے اسماء حسنی کی شروح میں لکھا ہے، مقاصد قرآن حکیم کے ہونے چاہییں جن سے مبدا ومعاش ومعاد اور فلاح ونجاح دنیا وآخرت وابستہ ہو۔

حقائق سے میری مراد وہ امور غامضہ ہیں جن سے عقول وافکار قاصر رہے اور تجاذب جوانب اور نزاع عقلاً باقی رہا، جیسے مسئلہ ''خلق افعال عباد'' کہ عبد کا ربط اپنے فعل سے کیا ہے اور کیسے ہے؟ اور

اس فعل کا ربط قدرت ازلیہ سے کیا ہے؟ قرآن مجید ایسے مقام میں وہ تعبیر اختیار فرمائے گا کہ جس سے ادنی بالحقیقۃ طوق بشر سے خارج ہو۔''

صاحب بصیرت اور وجوہ اعجاز کے متعلق کاوشیں صرف کرنے والے شخص کو چاہئے کہ وہ وجوہ اعجاز کے متعلق قدماء ومتأخرین کی بیان کردہ آراء کو خوب غور وخوض سے سمجھے اور پھر ہمارے حضرت شیخ امام العصرؒ کے ان علمی افادات پر نظر کرے، یقیناً وہ واضح فرق محسوس کرے گا۔ اگر آپ عدل وانصاف کے دامن کو تھامیں گے اور بصیرت افروز نگاہ سے فیصلہ کریں گے اور اس راہ کی ہر پست ودرشت راہ کو ٹٹولیں گے تو رات اور دن کا فرق نمایاں طور پر ادراک کرلیں گے، ان ہر دو قسم کی آراء میں بہت تفاوت ہے اور بقول کسے: حلیمہ سعدیہ کا دن کوئی پوشیدہ تو نہیں ہے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ میں نے علمائے امت کے بیان کردہ اقوال کو خوب تلاش کیا، اللہ رب العزت ان علماء پر اپنی رحمت نازل فرمائے اور ہمیں ان کی برکات سے مستفیض فرمائے ۔ میں نے ان علماء کرام کی تالیف کردہ کتب ورسائل جو خاص وجوہ اعجاز کے موضوع پر رقم فرمائے گئے تھے، خوب دیکھا۔ ان کتب میں حضرت شیخ ابوبکر قلانی کی ''اعجاز القرآن'' ابوالحسن الرمانیؒ کا رسالہ ''اعجاز القرآن'' اسی طرح فاضل ادیب علامہ رافعی مصریؒ کی کتاب ''اعجاز القرآن'' کا مطالعہ کیا، نیز جن علماء نے دیگر موضوعات کے متعلق تحریر کردہ تصانیف میں اس مبحث کو ذکر کیا ہے، ان کی کتب میں بھی خوب غور وتفحص کیا، قاضی عیاض مالکیؒ کی کتاب ''الشفاء'' امیر یمنیؒ کی ''الطراز'' حضرت شیخ عبدالقاہر جرجانیؒ کی '' دلائل الاعجاز'' میں ذکر کردہ مضامین اور شیخ جلال الدین السیوطیؒ کے اپنی کتاب ''الاتقان'' میں ذکر کردہ قدماء ومتاخرین اکابر علمائے امت کے اقوال وآراء کو دیکھا ہے، باوجود اس بحث وتدقیق کے حضرت شیخ کے اس علمی افادے کے مانند جامع اور اعلیٰ طرز کی بحث مجھے کہیں نہیں مل سکی، شیخ اس میدان میں نمایاں اور سب سے سابق رہے اور اپنے اس افادہ میں کمال کر گئے، اللہ موصوف کو اس کا بدلہ عطا فرمائے اور ان کی اخروی ودنیوی عزت ومرتبت کو بڑھائے۔

شیخ کے ان علمی جواہر پاروں کی چمک دمک کو ذرا دیکھئے، کس شاندار پیرائے میں تعجب خیز کمال فرما گئے۔ حضرت شیخ کی ذکر کردہ ان انواع اعجاز میں کئی وہ جزوی وجوہ اعجاز بھی شامل ہوجاتی ہیں جو متقدمین ومتاخرین نے بیان فرمائی ہیں لیکن بہر حال جمیع جزئیات اعجاز کا حصر واستقصاء ناممکن ہے اور ان تمام پر اطلاع بھی صرف وہ ذات علیم وخبیر ہی رکھتی ہے جس نے اس قرآن کو اپنے علم سے نازل فرمایا اور وہی تمام مغیبات کو مکمل طور پر جانتا ہے، شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

و علی تفنن واصفیه بوصفه
یفنی الزمان وفیه مالم یوصف

ترجمہ:۔ ''اگر چہ اس کے وصف بیان کرنے والے اپنے بیان اوصاف میں مختلف ہیں لیکن رسالہ ختم ہوجائے گا اور پھر بھی اس کے ایسے اوصاف باقی ہوں گے جو بیان نہ کئے گئے ہوں گے۔''

البتہ میں نے سیوطیؒ کی ''الاتقان'' اور جزائریؒ کی ''توجیه النظر'' میں امام خطابیؒ کی ایک عبارت دیکھی ہے، اس عبارت سے زیادہ جامع مختصر عبارت میں نے دیگر علماء کی اس باب میں نہیں دیکھی ہے اور دیگر اقوال کی بنسبت خطابیؒ کی یہ عبارت حضرت شیخ کی مذکورہ رائے کے بہت قریب ہے۔

نیز بعض باتیں خطابیؒ کے کلام میں ایسی بھی ہیں جن پر کسی کو تنبہ نہیں ہوا ہے اور خطابیؒ ہی اس کے واقف کار رہیں اور اس پر مطلع ہوئے ہیں۔ میرے مقالے کے تتمہ کے لئے اس عبارت کا نقل کردینا بھی عظیم فائدہ سے خالی نہ ہوگا، چنانچہ ذیل میں میں ان کی جامع عبارت نقل کرتا ہوں، سیوطیؒ نے ''الاتقان'' میں امام خطابیؒ کے قول کو یوں نقل فرمایا ہے:

> ''اکثر اہل نظر علماء اس طرف گئے ہیں کہ قرآن کی وجہ اعجاز اس کی جہت بلاغت ہے لیکن اس جہت بلاغت کی تفصیل وتوضیح نہایت پیچیدہ ہے، ان علمائے کرام نے بھی اس کے متعلق ذوق کو حکم بنانے کی طرف میلان ظاہر کیا ہے۔ تحقیقی بات یہ ہے کہ کلام کی مختلف اجناس

وانواع ہیں اور بیان وبسط کے درجات میں کافی تفاوت پایا جاتا ہے۔ بعض کلام کمال بلاغت اور مضبوط الفاظ رکھتے ہیں بعض کلام میں فصاحت ہوتی ہے، الفاظ سہل اور قریب الفہم ہوتے ہیں اور بعض کلام فصاحت بہر حال رکھتے ہیں، لیکن ان میں سلاست اور اطلاق وارسال بہت ہوتا ہے، یہ تمام درجات کلام قابل تعریف وتوصیف ہیں، ان میں پہلا درجہ اعلیٰ کلام کا ہے۔ دوسرا درجہ اوسط کلام کا ہے اور تیسرا درجہ ادنیٰ کلام کا ہے۔

قرآنی بلاغت ان تمام اقسام سے حصۂ وافرہ لئے ہوئے ہے اور ہر نوع سے ایک شعبہ اخذ کرتی ہے، ان اوصاف کی ترتیب وتنظیم کے پیش نظر قرآن کریم ایک خاص نظم وطرز پیش کرتا ہے جو فخامت وعذوبت ہر دو صفت کا حامل ہوتا ہے اور فخامت وعذوبت فی ذاتہ دو مختلف ومتضاد انواع کے نام ہیں، اس لئے کہ عذوبت، کلام میں سہل اندوزی سے پیدا ہوتی ہے اور جزالت ومتانت کلام میں سنجیدگی اور شدت کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں، ان دو متضاد انواع کا ایک ہی نظم وطریق میں جمع ہونا بھی ایک خاص فضیلت ہے، جو قرآن کے ساتھ مختص ہے، تاکہ یہ قرآن کریم باتم الوجوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نمایاں معجزہ ہوسکے۔

بشری مقدرت اس طرح کا کلام پیش کرنے سے چند وجوہ کی بناء پر قاصر ہے:

جن میں سے ایک یہ کہ انسانی علم لغت عرب کے تمام اسماء واوضاع جو درحقیقت معانی کے ظروف ہیں کا احاطہ نہیں کرسکتا ہے، نیز انسانی فہم وفراست تمام اشیاء کے معانی اور اس کے لئے موضوع وموزوں الفاظ کا ادراک نہیں کرسکتی، اسی طرح بیان وکلام کی تمام وجوہ

جن سے کلام میں باہمی ربط وتعلق پیدا ہوتا ہے، انسانی معرفت کی ان تمام وجوہ تک رسائی ناممکن ہے، (جس کی بناء پر یوں کہا جا سکے) کہ انسان ان وجوہ میں سے احسن وافضل کا انتخاب کر کے ایسا کلام پیش کر سکے جو اس قرآن کے مثل ہو۔

کلام کا قوام تین اشیاء سے ہوتا ہے:

۱-الفاظ۔

۲-ان کے معانی جو الفاظ کے ساتھ قائم ہوں۔

۳-الفاظ اور معانی میں باہمی ربط اور تعلق جو ان دونوں کو درست نظم وترتیب پر پیش کر سکے۔

اور جب آپ قرآن کریم میں تأمل کریں گے تو یہ تمام امور آپ قرآن کریم میں انتہائی اعلیٰ واشرف پیمانے پر پائیں گے، حتی کہ آپ قرآن کریم میں پائے جانے والے الفاظ سے بڑھ کر فصیح وبلیغ اور مضبوط الفاظ جن میں عذوبت وفخامت دونوں پائے جائیں ہرگز نہ پا سکیں گے۔

اور قرآنی معانی تو وہ مرتبت ومنزلت رکھتے ہیں کہ ہر ذی عقل وفہم اس باب میں قرآن کے تقدم وسبقت اور اعلیٰ درجات پر فائز ہونے کی گواہی دے گا۔

اسی طرح قرآنی نظم سے بہتر اور بڑھ کر حسن تالیف اور شدت مناسبت کے ساتھ ساتھ نظم قرآنی کے باہمی مشابہت حسن وخوبی آپ کہیں نہ پائیں گے۔

اور کلام وبیان کے یہ تینوں فضائل ومحاسن مختلف انواع کلام میں تو علیحدہ علیحدہ پائے جاتے ہیں، البتہ ان سب کا بیک وقت ایک ہی نوع

کلام میں پایا جانا سوائے علیم وقدیر کے کلام عالیشان کے ناممکن ہے۔

ان مقدمات کے پیش نظر یہ بات ثابت ہوئی کہ قرآن کریم معجز اس وجہ سے ہے کہ وہ کلام کو حسن ترتیب وانتظام کے ساتھ، فصیح ترین الفاظ کے آئینہ میں استعمال کرتا ہے اور تمام ابواب عقائد واحکام میں مثلاً: توحید وتقدیس باری تعالیٰ، دعوت عمل وطاعت، حلت وحرمت اور حظر واباحت کی مختلف ومتعدد صورتوں میں خداوند تعالیٰ کی عبادت کے طریقے کا بیان، وعظ واصلاح، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اخلاق محاسن وفضائل کی دعوت، برے اخلاق سے زجر اوران پر تنبیہ وغیرہ میں قرآن کریم، کلام کو محل کلام وموضع بیان کی رعایت کرتے ہوئے دلنشین اور قابل اعتناء ولائق قدر معانی لئے ہوئے ایسی تعبیر پیش کرتا ہے کہ اس سے بہتر تعبیر نہیں پائی جاسکتی ہے اور عقل وادراک کے پردے پر بھی اس لائق داد نظم وترتیب سے زیادہ احسن وافضل صورت نہیں جھلک سکتی ہے، ساتھ ساتھ گذشتہ عہود کے واقعات اور گذشتہ اقوام پر نازل خدائی قہر وسزا اور آئندہ عذاب وسزا کی پیش گوئی، نیز آئندہ زمانے میں ہونے والے وقائع وحادثات کی بہترین طرز پر پیش گوئی، یہ قرآن کے وہ خواص ہیں جن سے ہرگز صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے اور پھر ان تمام مباحث میں قرآن کریم نے دعویٰ اور حجت، دلیل اور مدلول کو جمع فرمایا ہے، تاکہ اس دعوت ودعویٰ کے لزوم کے لئے تاکید وتائید حاصل ہو اور یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ ان تمام امور کی تالیف اور ان متفرق ومنتشر امور میں نظم ونسق کا قیام واہتمام ایسا پیچیدہ امر ہے کہ بشری قویٰ ایسا جامع ومانع کلام پیش کرنے سے عاجز ہیں اور یہ ان کی محدود ومحیط مقدرت سے بالا ہیں۔

چنانچہ تمام انسان اس کلام کے معارضہ ومقابلہ سے دور

رہے اور اس کے معارض یا مقابل کلام اسی صورت و ہیئت پر پیش
کرنے سے یکسر درماندہ رہے۔

کچھ آگے چل کر علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں:

''میں نے جو اعجاز قرآنی کی یہ وجہ بیان کی، محض خدا کا فضل
ہے کہ اس وجہ کو اس طرز پر کسی نے پیش نہ کیا تھا اور یہی وجہ دل کو بھی بھاتی
ہے اور نفوس میں بھی اثر پذیر ہے۔''

اعجازِ قرآنی کی ایک اور وجہ

حضرت امام العصر علامہ کشمیریؒ فرمایا کرتے تھے کہ: یہاں پر ایک اور وجہ اعجاز بھی شمار کی جاسکتی ہے جو مذکورہ وجوہ اعجاز کے علاوہ ہے، لیکن بہرحال میں پختہ طور پر یہ دعویٰ نہیں کرتا ہوں کہ اس کو وجوہ اعجاز میں ضرور شمار کیا جائے، اس وجہ اعجاز کی تفصیل یہ ہے کہ:

''قرآنی بیان کا ایک طور یہ بھی ہے کہ قرآن کسی امر کے لئے ایسے کلام سے استدلال پیش کرتا ہے جس کا ظاہر طرز خطابت کی مانند ہو (جو بے دلیل ہوا کرتا ہے) اور اس کا باطن ایک مضبوط دلیل و حجت لئے ہوئے ہو، یعنی کلام اپنی ظاہری عبارت و منطوق میں اور اپنے مدلول مطابقی میں کسی امر کے اثبات پر بصورت خطابت اور الزامی بیان کے دلالت کرتا ہو، اور اس کلام کا اشارہ اور اس کا مفہوم و مدلول التزامی، ایک مضبوط اور قطعی حجت اور دلیل لئے ہوئے ہو۔

جیسا کہ علمائے تفسیر نے باری جل شانہ کے اس پاک ارشاد: ''لو کان فیهما آلهة إلّا الله لفسدتا'' میں دلیل تمانع کے متعلق بحث فرمائی ہے، امام تفتازانیؒ نے اپنی کتاب ''شرح العقائد'' میں اس آیت مبارکہ کی ظاہری عبارت سے ماخوذ معنیٰ کو بیان فرما کر فرمایا کہ: یہ آیت الزامی جواب ہے اور اس آیت میں بیان کردہ تعدد الٰہ پر لزوم فساد یہ تلازم عادی ہے (مقصد یہ ہے کہ یہ تلازم قطعی نہیں ہے)۔

حضرت تفتازانیؒ کے معاصر علامہ شیخ عبداللطیف کرمانیؒ نے امام تفتازانیؒ کے اس بیان کی وجہ سے ان پر خوب طعن زنی فرمائی ہے، یہاں تک کہ امامؒ پر کفر کا فتویٰ [illegible]

تکفیر میں بطور سند یہ بات پیش کی ہے کہ شیخ ابو معین نسفیؒ نے رئیس المعتزلہ ابو ہاشم جبائی کی اپنی کتاب "تبصرة الأدلة" میں تکفیر اس سبب سے کی ہے کہ امام جبائی نے اس آیت میں تعدد الٰہ کی نفی اور اس کے بیان اثبات توحید کے متعلق طعن وقدح کی تھی، علمائے کرام نے علامہ تفتازانیؒ پر کی جانے والی تکفیر کا جواب اسی دلیل تمانع کی روشنی میں بیان کر دیا ہے، چنانچہ حضرت تفتازانیؒ کے شاگرد شیخ علاء الدین محمد بن محمد بن محمد حنفی بکاری نے ایک مستقل رسالہ اپنے شیخ کے دفاع میں تحریر فرمایا، جس میں شیخ تفتازانیؒ کے بیان کے سر وروح کو بیان فرما کر اطمینان بخش جواب تحریر فرمایا ہے، اس جواب کا خلاصہ وحاصل شیخ کمال بن ابی شریف نے اپنی کتاب "المسامرة" میں ذکر کیا ہے، جو صاحب کتاب "الفتح" و"التحریر" علامہ محقق ابن ہمام حنفی کی مشہور کتاب "المسایرة" کی شرح ہے، اسی طرح شیخ زین الدین قاسم بن قطلوبغا نے بھی "المسایرة" پر اپنی تصنیف کردہ شرح میں اس جواب کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ اب میں ان دو حضرات کی تلخیص کا خلاصہ کچھ تصرف وزیادتی کے ساتھ پیش کرتا ہوں:

"قرآن کریم میں پیش کردہ ادلہ وحجج بمنزلہ دوا کے ہیں، ایک ماہر طبیب ادویہ کو طبائع وامزجہ کے مواقع اور ان میں موجود قوت وضعف اور حرارت وبرودت کے تفاوت کے پیش نظر استعمال کرتا ہے اور جو طبیب اس تفاوت کی رعایت نہ کرے تو اس کی طبابت سے دوا بجائے اصلاح بدن اور نفع بخش ثابت ہونے کے جسم کے فساد کا سبب اور قوائے بدن کے لیے ضرر رساں ثابت ہوتی ہے، اسی وجہ سے ماہر طبیب مریض کی ذاتی نوعیت کو جانچ پرکھ کر اس کے مزاج کے موافق دوا تجویز کرتا ہے۔

بعینہ اسی طرح قرآن کریم خالق مختار کے اثبات اور توحید وتقدیس کے بیان میں ادلہ وحجج میں سے ان براہین کا انتخاب کرتا ہے جو بوقت نزول قرآن پائے جانے والے مخاطبین کی عقول کے موافق ہوا کرتی ہیں، چنانچہ بوقت نزول قرآن جمہور مخاطبین چونکہ منطقی براہین وادلہ سے ناآشنا اور قطعی حجتوں سے نابلد تھے، ایسی صورت میں ان کے ساتھ گفتگو میں وہ طرز اختیار کیا جاتا جس کے ادراک سے وہ قاصر ہیں تو یہ کلام ان کے لئے بجائے نفع مندی کے ضرر رساں

ہوجاتا، جیسا کہ گلاب کی مہک گبریلے کے لئے نقصان دہ ہے، اسی طرح آفتاب کی روشنی چمگادڑ کی آنکھ کے لئے ضرر رساں ہے۔ ٹھیک ہے کہ اصحاب ذکاوت وفطانت کے لئے محض الزامی جوابات کافی نہیں ہوا کرتے ہیں اور بہرحال ان عرب ناخواندگان میں ہوشمند ودانشمند حضرات بھی پائے جاتے تھے، اسی طرح قرآن کریم تو عرب وعجم، کالے، لال، سفید اور پیلے ہر ایک کے لئے ایک پیغام ہے تو اس کے پیش نظر مناسب تھا کہ قرآن کریم میں قطعی براہین وحجج کی طرف تنبیہ یا اشارہ ضرور کیا جاتا، لیکن کبھی کبھار الزامی واقناعی دلائل قلوب کی شفاء اور سینوں کے انشراح کا بنسبت قطعی براہین وحجج کے زیادہ باعث ہوجاتے ہیں، اسی وجہ سے قرآن کریم نے اکثر دلائل میں وہ طرز اختیار فرمایا ہے جو جمہور عرب کے لئے نفع مند ہو اور اصحاب فطانت اور فضلاء وحکماء بھی ان دلائل سے صرف نظر نہ کرسکیں اور ان دلائل میں باطنی طور پر براہین قاطعہ کا ایسا ذخیرہ ودیعت کر رکھا ہے جو عرب کے خواص عقلاء وحکماء کے لئے حجت کا لازم کردے۔" انتہی

یہ "المسایرۃ" کے دو شارحین کے ان ذکر کردہ مباحث کا خلاصہ ہے جو انہوں نے شیخ علاء الدین بخاریؒ سے تصرف وزیادت کے ساتھ نقل کئے ہیں، شیخ علاء الدینؒ کا کلام بہت طویل ہے جو شخص تفاصیل کا شوق رکھتا ہو، وہ اس تفصیل کو وہیں دیکھ لے، یہ تفصیل بھی خوب مفید ہے۔

مشہور فلسفی ابن رشدؒ کے کلام میں بھی شیخ کی ذکر کردہ وجہ اعجاز کی طرف اشارہ ملتا ہے اور اپنی کتاب "فصل المقال" میں مؤلف نے اس وجہ کو مستقل وجوہ اعجاز میں شمار کیا ہے، اسی طرح امام رازیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں کئی آیات کے ذیل میں اس وجہ اعجاز کی طرف اشارہ فرمایا ہے، البتہ حضرت شیخ کشمیریؒ نے اس کو وجہ اعجاز کیوں شمار نہ فرمایا تو اس کی راقم کے خیال میں دو وجہیں ہوسکتی ہیں، واللہ اعلم۔

۱- یا تو اس لئے کہ یہ وجہ اعجاز قرآنی بلاغت اور قرآن کے اسلوب بیان کے ذیل میں ملحق شمار کی جاسکتی ہے اور شیخ کا مقصد بھی انواع اعجاز کا بیان ہے نہ کہ افراد وجزئیات کو مستقل بیان کرنا، جیسا کہ میں گذشتہ صفحات میں اس کا تذکرہ کر آیا ہوں، چنانچہ اس وجہ اعجاز کو مستقل نوع شمار نہیں کیا گیا۔

۲- یا پھر اس وجہ سے کہ بعض اسلام امت نے تنبیہ فرمائی ہے کہ مقاصد کے اثبات اور اغراض کے بیان میں سب سے درست، مضبوط، محکم اور اعتراضات ومناقشات سے سالم طرز وطریق قرآن کریم کا ہے، یہی طرز وطریق سب کو شفا اور بصیرت کو جلا بخشتا ہے، اور جو فلاسفہ اپنے ایجاد کردہ قواعد پر مبنی اقوال وآراء ذکر کرتے ہیں ان میں سے اکثر یقینی اور قطعی فوائد کے لئے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ جیسا کہ قرآن کریم نے دوزخیوں کو پیش کردہ کھانوں کے متعلق کہا ہے: ﴿لا یسمن ولا یغنی من جوع﴾ (کہ نہ یہ موٹا کرتے ہیں اور نہ بھوک کے لئے نفع مند ہوا کرتے ہیں) ان ادلہ کا حال بھی اس سے چنداں دگرگوں نہیں ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ اپنی کتاب "العقل والنقل" (ج: ص:۹۱) پر جو "المنہاج" کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے، فرماتے ہیں:

"جو شخص نصوص قطعیہ کے متعارض ان فلسفی مباحث اور کلامی مناقشات میں غور وفکر کرے گا، جبکہ اس کو نصوص کے متعلق اور لوازم نصوص کے متعلق، نیز ان نصوص کی پیچیدہ ابحاث اور اس کے منافی آراء واقوال کے متعلق معرفت تامہ حاصل نہ ہو تو ایسا شخص ہرگز کسی طمینان بخش یقینی کلیہ تک نہیں پہنچ سکے گا۔

یہ فلسفی مباحث اس کو پیچ در پیچ مسائل میں شک اور حیرت کا سامان بہم پہنچائیں گے، بلکہ ان فلسفی فضلاء کو ہی لے لیجئے (ابن تیمیہؒ کی مراد ان فضلاء سے ابو حامد غزالیؒ، شیخ ابن عربیؒ، ابن سبعینؒ، ابن فارضؒ، صاحب "خلع النعلین" اور تلمسانی وغیرہ حضرات فلاسفہ ہیں) جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے اختراع کردہ بعض معقولات کو ان متعارض نصوص پر مقدم کرنا چاہیے، انہیں دعوے داراں کو آپ الٰہیات کے اصول ومسائل میں حیران وسرگرداں پائیں گے...... الخ"

نہایت طویل بحث یہاں حضرت امام ابن تیمیہؒ نے فرمائی ہے اور اس بحث سے

قبل فرمایا:

''ابوعبداللہ رازیؒ یعنی امام فخر الدین بن خطیب الری، اپنی مختلف کتب میں (مثلاً ان کی کتاب ''أقسام اللذات'' میں) ان اشعار کو بارہا ذکر فرماتے ہیں:

نهاية أقدام العقول عقال و أكثر سعى العالمين ضلال

وأرواحنا في وحشة من جسومنا وحاصل دنيانا أذى ووبال

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا سوى أن جمعنا فيه قال وقالوا

ترجمہ:۱- عقول کے غور وفکر کی انتہا آخر کار رکنا ہی ہے (عاجز آجانا ہے) اور (عقلی مباحث میں) لوگوں کی اکثر پیش رفت گمراہی پر ہی منتج ہوتی ہے۔

۲- ہماری ارواح ہمارے جسموں کی وحشت وتنہائی میں قید ہیں اور ہماری دنیا کا پیٹ ایذاء و وبال کا باعث ہے۔

۳- ہماری ساری عمر بحث کرنے سے ہمیں اس کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا کہ ہم نے قال اور قالوا جمع کرلیا (فلاں نے یوں کہا تو اس کا جواب انہوں نے یوں دیا)۔

اور حضرت ابوعبداللہ رازیؒ نے فرمایا کہ: میں نے کلامی مباحث اور فلسفی طرز وطریق کی خوب بحث اور جانچ پڑتال کی، جس کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ مباحث بیمار کو شفا نہیں بخش سکتے اور پیاسے کے لئے سیرابی کا سامان فراہم نہیں کر سکتے ہیں، اور سب سے بہتر طرز بیان واستدلال جو عقل وادراک کے قریب تر ہو، میں نے قرآن کریم کا پایا ہے۔ چنانچہ اثبات کے متعلق میں قرآن کریم کی یہ آیات پڑھتا ہوں: ''الرحمن على العرش استوىٰ'' اور ''إليه يصعد الكلم الطيب والعمل الصالح يرفعه'' اور نفی میں قرآن کریم کی یہ آیات پڑھتا ہوں: ''ليس كمثله شيئ''، ''ولايحيطون به علما''، ''هل تعلم له سميا'' اور جو شخص میرے تجربہ کے مانند تجربہ کرے گا تو جو میں سمجھ سکا ہوں، وہ وہی سمجھ لے گا''

انتهى ما حكاه ابن تيمية عن ابى عبد الله الرازیؒ.

قرآن کریم کے چند تفسیری نکات ولطائف امام العصرؒ کے فرمودات کی روشنی میں

قرآن محض نظریہ اور معلومات کا نام نہیں ہے

حضرت امام العصر کشمیریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ: قرآن کی کوئی بھی آیت محض نظریاتی یا معلوماتی حیثیت نہیں رکھتی ہے، جس کا انسان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو، بلکہ ہر آیت چاہے وہ ابواب احکام میں سے کسی حکم کے ضمن میں ہو یا کسی خاص واقعہ اور حادثے کا عنوان ہو، بہرحال کسی نا کسی مرتبہ اور کسی نا کسی صورت میں وہ ضرور معمولات سے متعلق ہوتی ہے۔

یہ ایک دقیق تشریعی نکتہ ہے، اس کی مثال اللہ جل شانہ کے اس پاک ارشاد سے سمجھیے: ارشاد باری تعالیٰ ہے: "فأینما تولّوا فثمّ وجه الله" اب اس آیت میں جس طرح کلی عموم مراد نہیں ہے کہ ہر وقت ہر جہت کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی جائے تو درست ہوگی، اسی طرح اس آیت سے محض علمی اور محض نظریاتی وعقلی فائدہ مقصود نہیں اور نہ قبلہ کے متعلق شک وشبہ اور شش وپنج میں مبتلا شخص کے دفع ارتیاب کو شانِ نزول ٹھہرا کر محض اس خاص نوعیت کے واقعے کے ساتھ مخصوص ہے، بلکہ یہ آیت بھی سوار شخص کے لئے نفل نماز کے حکم کے متعلق معمول بہ ہے (کہ وہ جس جہت پر سہولت سمجھے رخ کر کے نفل نماز پڑھ سکتا ہے)۔

اسی طرح باری جل شانہ کے اس فرمان گرامی کو ملاحظہ کیجئے: "أقم الصلوٰة لذكري" اب نماز فقط ذکر کا نام نہیں ہے، بلکہ نماز ایک حقیقت سے عبارت ہے جو شارع کی طرف سے مقرر کردہ خاص ارکان اور معین آداب پر مشتمل ہوا کرتی ہے، اس تفصیل کے باوجود نماز کا محض ذکر ہونا جو اس آیت کا محمل ومطلب ہے، یہ بھی بعض احوال میں معمول بہ ہے، چنانچہ یہ آیت بھی عقلی محض نہیں ہے، جو معمول بہ نہ ہو سکے، بلکہ اس آیت پر صلوٰۃ الخوف میں عمل کیا گیا

ہے۔خاص طور پر اگر یہاں امام زہریؒ کے مسلک کوملحوظ رکھا جائے،وہ فرماتے ہیں کہ: جب صلوٰۃ الخوف متعذر ہو جائے تو نماز کی جگہ صرف تکبیر کافی ہوا کرتی ہے،اسی طرح فقہاء کرام کے ذکر کردہ اس مسلک سے بھی اس آیت کا معمول بہ ہونا بخوبی واضح ہوتا ہے کہ حائضہ عورت کو مناسب ہے کہ وہ بوقت نماز وضو کر کے بیٹھ جائے اور اللہ کا ذکر کرے۔

اسی ضمن میں آیۃ الوضوء: "یا أیها الذین آمنوا إذا قمتم إلى الصلوٰة فاغسلوا وجوهكم" الخ کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے،جس میں سر اور پیروں کو علیحدہ اور چہرے اور ہاتھوں کو علیحدہ ذکر فرمایا ہے،چنانچہ تیمم میں ایک جانب ساقط ہو جاتی ہے،یہیں سے رجلین کو رأس کے ساتھ ذکر کرنے کا فائدہ ظاہر ہوا،اس لئے کہ رجلین اور رأس میں وظیفے کے اعتبار سے فرق ہے،اس لئے کہ''رجلین،،کا وظیفہ غسل یعنی دھونا ہے،جبکہ رأس کا وظیفہ مسح ہے،اسی طرح ''رجلین'' پر مسح کی بعض صورتیں مثلاً حالت تخفف (موزہ پہننے کی صورت میں) اور بلا حدث نماز کے لئے وضو کرنے کی صورت میں بھی داخل ہو جاتی ہیں،یہ قرآن کریم کا ایک معجزانہ اسلوب ہے، تفصیلات کے لئے حضرت شیخؒ کی تالیف منیف ''مشکلات القرآن'' (ص:۱۳۵-۱۳۶) کی مراجعت فرمالیجئے۔

حضرتؒ فرماتے ہیں: ہر آیت اگر چہ منسوخ ہی کیوں نہ ہو،کسی نہ کسی مرتبہ میں معمول بہ ضرور ہوتی ہے،مثلاً باری جل شانہ کا فرمان اقدس ہے: "**علی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین**" یہ آیت اگر چہ اپنے ظاہری عموم کے اعتبار سے منسوخ ہے،مگر حاملہ مرضعہ کے حق میں یہ آیت اب بھی معمول بہا ہے (مشکلات القرآن ص:۴۹)

آیت قرآن اور حدیث رسول میں ظاہری تعارض

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ: کبھی کبھی قرآن کریم کے ظاہری نظم ونسق سے ایک حکم مستفاد ہوتا ہے اور پھر اس آیت کے شان نزول کے متعلق وارد شدہ حدیث اس حکم کے مخالف ہوتی ہے،جس کی بناء پر قرآنی منطوق اور شان نزول میں تعارض واضطراب پیدا ہو جاتا ہے اور غرض اصلی اور مقصود ومطلوب میں التباس واشتباہ پیدا ہو جاتا ہے،حضرتؒ فرماتے ہیں کہ: میرے نزدیک اس تعارض کی

تطبیق یوں کی جاسکتی ہے کہ ایسے مواضع میں قرآن کریم کی دو مرادیں ہوا کرتی ہیں:

پہلی مراد اَولیٰ واعلیٰ ہوا کرتی ہے اور دوسری مراد ثانوی حیثیت رکھتی ہے، چنانچہ قرآن کریم کے ظاہری نظم کے مقتضیٰ کو مراد اَولیٰ وادلی شمار کیا جائے گا اور شان نزول کے متعلق وارد شدہ حدیث ثانوی مراد شمار ہوگی اور اسی ترتیب کے مطابق آیت کے دونوں محمل ومطلب معمول بہ ہوجائیں گے۔

حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ: اس دقیق نکتے کے مطابق اس طرح کے بہت سے مواضع پر وارد شدہ اشکالات دور ہوجاتے ہیں، جن کی چند امثلہ ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

۱- سورۃ القیامۃ میں باری جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿لاتحرك به لسانك لتعجل به﴾ اس آیت کے ماقبل ومابعد ربط ومناسبت کے متعلق عقول واذہان کافی تشویش کا شکار ہوجاتے ہیں:

نبی اکرم ﷺ چونکہ بوقت نزول قرآن حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھا کرتے تھے، اس لئے اس آیت میں اس سے منع فرمایا گیا ہے، اب ظاہری نظم قرآن (جو قیامت کی ہولناکیوں کے بیان میں چلا آرہا ہے) اور اس شان نزول میں (جس میں ایک خارج از بحث سیاق معاملہ یعنی جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ نہ پڑھنے کا حکم ہے) تعارض واضح ہورہا ہے اور روافض ملاعنہ کے لئے قرآن کریم کے نقص پر ایک دلیل ماخوذ ہورہی ہے، امام رازیؒ فرماتے ہیں: روافض ملاعنہ کا دعویٰ ہے کہ قرآن کریم کے تقریباً دس پارے کم ہیں، کلا وحاشا! کہ اس پاک کلام کے متعلق جس کی حفاظت کا وعدہ اللہ رب العزت نے فرمایا ہے، کسی نقص یا خدشہ کا دعوی باطلہ تسلیم کیا جائے۔

مذکورہ آیت کے عقدہ کا حل بھی میرے نزدیک یہی ہے کہ حدیث پاک میں جو شان نزول ذکر کیا گیا ہے، وہ قرآن کریم کی مراد ثانوی ہے، جس کو دوسرے مرتبہ میں ملحوظ رکھا جائے گا اور جو قرآن کریم کے ظاہری نظم کا مقتضیٰ ہے، اس کو مراد اولی شمار کیا جائے گا، جس مراد کی روشنی میں آیت مذکورہ کا ماقبل سے ربط وتعلق اور نظم ونسق واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے ماقبل ومابعد

میں احوال قیامت اور اس کی ہولناکیوں کا بیان ہے اور خداوند جل اسمہ نے احوال قیامت ذکر فرما کر پھر فرمایا: "لاتحرك به لسانك لتعجل به" جس کا مطلب ومعنیٰ یوں ہے کہ قیامت کے متعلق پوچھنے میں اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے کہ پھر آپ سوال کرنے لگیں کہ قیامت کا وقوع کب ہوگا؟ جیسا کہ یہ مشرکین، قیامت کے وقوع کے متعلق جلدی دکھلاتے ہیں اور آپ سے جا بجا سوال کرتے رہتے ہیں "لتعجل به" یعنی پھر آپ بھی ان مشرکین کی طرح اس کے وقوع کے متعلق جلدی دکھلائیں۔ "إنّ علینا جمعه و قرآنه" یعنی ہم پر ہے اس قیامت کے احوال کو جمع کرنا اور اس کو آپ کے سامنے بیان کر دینا، تاکہ آپ ان کو خوب سمجھ کر معرفت تامہ حاصل کرلیں۔ "فإذا قرأناه فاتبع قرآنه" پھر جب ہم ان کو آپ پر پڑھ کر سنادیں تو آپ بھی ان کی تلاوت وقراءت کیا کیجئے: "ثمّ إنّ علینا بیانه" اور پھر جب وہ وقت مقرر آ پہنچے گا تو ہم اس کا بیان ضرور کردیں گے۔

معلوم ہوا کہ قیامت کے وقوع کے متعلق بیان میں آپ کو بوجہ بشری تقاضا کے غم لاحق ہوسکتا تھا اور آپ کو اس کے متعلق مختلف خیالات آسکتے تھے، اس پر اس آیت میں ایک تسلی بخش مضمون وحی فرمایا گیا، چنانچہ ان خطرات کو، جن کا پیش آنا ممکن تھا، اس کو بمنزلہ واقع شمار فرما کر باری جل شانہ نے تنبیہ فرمائی اور خداوند جل شانہ جب اپنے خصوصی بندوں یعنی انبیاء سے مخاطب ہوا کرتے ہیں تو کلام کا یہی طرز اختیار فرماتے ہیں، اسی طرز کے مطلق آگے اللہ رب العزت فرماتے ہیں: "کلا بل تحبّون العاجلة" جس میں بشری فطرت وجبلت کا بیان ہے کہ انسان فطرۃً جلد باز واقع ہوا ہے اور جلد حصول یابی کا خواہاں رہتا ہے اور تاخیر میں جو فوائد ومنافع مضمر ہوا کرتے ہیں ان سے ناآشنا ہوا کرتا ہے۔ اس موقع پر مزید تفصیل بھی کی جاسکتی ہے، جس سے مکمل تسلی اور اطمینان ہوسکے، البتہ یہ اشارہ بھی عقلمند باہوش کے لئے کفایت کرسکتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا ایک بلند پایہ اعجاز ہے کہ کتنے ہی کثیر مطالب ومفاہیم کو قرآن کریم مختصر عبارات میں مکمل آشکارا کر دیتا ہے اور ان مطالب کی تمام جہات کا احاطہ کرلیتا ہے اور چنداں زیب نہیں کہ قرآن کریم کے مقصد ومطلب کو محض شان نزول میں منحصر سمجھا جائے، بلکہ سیاق وسباق اور غرض وسبب

کی رعایت بھی نہایت ضروری ہے جس سے بیش بہا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

اسی قاعدہ کی مثال میرے نزدیک باری جل شانہ کا یہ فرمان اقدس بھی ہے: "فإن طلّقها فلا تحلّ له من بعد" شوافع حضرات فرماتے ہیں کہ آیت کا یہ ٹکڑا صدر کلام "الطلاق مرتان" سے مربوط ہے اور یہاں تیسری طلاق کا بیان مقصود ہے اور جو کچھ ان دو ٹکڑوں کے درمیان بیان ہوا وہ گویا جملہ معترضہ کے طور پر بیان ہوا ہے، اس لئے کہ خلع طلاق نہیں، بلکہ فسخ نکاح سے عبارت ہے، اس بات کی تائید امام ابوداؤدؒ کی ذکر کردہ اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ "تسریح باحسان" تیسری طلاق کا بیان ہے، اگر "فإن طلقها" کو ماقبل جملہ کے ساتھ مربوط شمار کیا جائے تو یہ چوتھی طلاق کا بیان ہو جائے گا، اس بناء پر اس ٹکڑے کو صدر کلام کے ساتھ مربوط ماننا ہی مناسب ہے۔ میرے نزدیک اس محل کی توجیہ یوں ہے کہ: باری جل شانہ کے فرمان "تسریح باحسان" سے مراد رجعت کو ترک کرنا ہے، یعنی اب شوہر اس عورت کو اپنے نکاح میں رکھنے کا خواہاں نہیں ہے، یہ قرآن کریم کی مراد اوّلی ہے، اور اس کلیہ کے ضمن میں طلاق ثالث کو بحیثیت اس کے ایک فرد کے داخل شمار کیا جائے گا، اس لئے کہ طلاق کا حاصل ترک امساک ہے، اس کے پیش نظر باری جل شانہ کا ارشاد "أو تسریح" یہ طلاق ثالث سے عام ہوگا، بعد ازاں "فإن طلقها" سے جدید طلاق کا بیان نہیں ہے، جس کی وجہ سے اس کو طلاق رابع قرار دیا جائے، بلکہ یہ "أو تسریح" کی دو انواع میں سے ایک نوع کا بیان ہوگا، اب ایسی صورت میں حدیث پاک سے مستفاد کلام قرآن کریم کی مراد ثانوی کی حیثیت رکھنا شمار کیا جائے گا اور نظم قرآن کے ظاہری مستفاد کو ہم مراد اولی شمار کریں گے۔ میرے خیال میں جب حدیث اور قرآن کا تعارض ہو جائے تو یہی مسلک سب سے قوی ہے کہ قرآن کریم کے ظاہری مفہوم کو مراد اولی اور حدیث سے مستفاد مفہوم کو مراد ثانوی شمار کیا جائے، اسی بناء پر علمائے احناف پھر فرماتے ہیں کہ اس ٹکڑے کا تعلق متصل ماقبل سے ہے نہ کہ صدر آیت سے، اس لئے کہ اگر اس کو صدر آیت کے ساتھ مربوط مانا جائے تو کلام بے ہنگم و بے ربط ہو جائے گا، علمائے اصول نے بھی اس مقام پر بہت وقیع ابحاث فرمائی ہیں، ان علمائے اصول میں صرف "تلویح" کے

ایک محشی نے یہ تصریح کی ہے کہ قرآن کریم کی ظاہری عبارت میں دو مرادیں جاری ہوسکتی ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ: خمر کا اطلاق اس مشروب پر بھی ہوتا ہے جس کو احناف خمر شمار کرتے ہیں اور اس مشروب پر بھی ہوتا ہے جس کو جمہور علماء خمر شمار کرتے ہیں، البتہ احناف کی بیان کردہ تعریف قرآن کریم کی مراد اوّلی ہے، جبکہ جمہور علماء کی بیان کردہ تعریف قرآن کریم کی مراد ثانوی ہے یہاں تک (حضرت شیخ کشمیریؒ کا کلام مع بعض توضیحات جو راقم نے اپنی سمجھ کے مطابق بیان کیں، تمام ہوا)۔

راقم کہتا ہے کہ: شیخ کی مذکورہ رائے ایک وقیع اصولی رائے ہے، جس کی طرف ہم بہت سے مسائل واحکام میں محتاج ہیں اور اسی کے مانند اہل بلاغت، خصوصاً امام البلاغۃ حضرت شیخ عبدالقاہر الجرجانیؒ کا فصیح کلام کے تفاوت کے پیش نظر کلام کو دو مراتب: اوّلی اور ثانوی کی طرف تقسیم کرنا ہے اور اس بات کو بطور قاعدہ بیان کرنا ہے کہ فصاحت کے طبقات کی تقسیم کا مدار ان طبقات ومراتب کی وہ فضیلت اور خصوصیت ہے جو معنی ثانوی کے اعتبار سے کلام کو حاصل ہوتی ہے، انہی ثانوی معانی کے پیش نظر بلغاء کے کلام کی خصوصیت اور اس کا امتیاز نمایاں ہوا کرتا ہے۔

حضرت شیخ بھی اس قاعدہ کو اہمیت دیا کرتے تھے اور اس کو ان ضروری قواعد میں شمار کرتے تھے جن کا اہتمام واعتناء نہایت ضروری اور مہتم بالشان ہے۔ چنانچہ دو اعتبار اور دو مرادوں کے پیش نظر قرآنی قاعدہ کو اس بلاغت کے قاعدہ کی نظیر شمار کرنا اگرچہ اس تعدد کے محل وموضع میں دونوں مختلف ہیں، مگر مآلاً ان دونوں نظیروں کا نتیجہ وثمرہ ایک ہی ہے۔ پھر جس طرح معانی اوّلیہ اور معانی ثانویہ میں ربط ومناسبت کا اہتمام ضروری ہے، اسی طرح مراد اوّلی اور مراد ثانوی میں بھی مناسبت اور تعلق وربط کا پایا جانا ضروری ہے، وگرنہ ان دونوں مرادوں کو ایک کلام کے تحت داخل کرنا کیوں کر درست ہوگا، یہاں پر کلمات مفردہ کی طرح یوں نہ کہا جاسکے گا کہ اگرچہ ضدین ہی کیوں نہ ہوں، ان میں اشتراک پایا جاتا ہے، اور اسی طرح عموم مشترک بھی نہ کہا جاسکے گا، اس لئے کہ مفرد کا حکم مرکب سے مختلف ہوتا ہے اور ہماری بحث اس وقت مرکب کلام کے متعلق ہورہی ہے، اس بحث کو محفوظ کر لیجئے، اس لئے کہ یہ بڑی نفیس اور لطیف مبحث ہے اور ان شاء اللہ

بہت نفع بخش ثابت ہوگی۔

نظم قرآن کا مدار عام عربی محاورہ ہے

حضرت شیخ رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم میں اگر چہ ضمناً بہت سے لطیف دلائل وبراہین پائے جاتے ہیں جو فلسفیانہ ذوق ومزاج کے عین موافق ہیں، لیکن اس کے باوجود قرآن کریم نے اپنے ظاہری نظم میں ان لطیف دلائل کو مقصد وفائدہ کا معیار ومدار قرار نہیں دیا ہے، البتہ جو شخص خوب غور وفکر کرے گا اور قرآنی خفیہ اسرار ورموز میں غوطہ زن ہونا چاہے گا تو اس کو قرآن کریم میں ایسے روشن اور منور دلائل ملیں گے جس سے قرآن کریم پر اس کے ایمان ویقین میں پختگی اور قوت حاصل ہوگی، لیکن بہر حال قرآنی نظم کو عام ماحول میں جاری وساری عربی گفتگو کے مطابق بھی لایا گیا ہے جس میں مخفی براہین ودلائل کے بجائے ان مسلم قواعد وضوابط اور دلائل وحجج کو پیش کیا جاتا ہے جو اہل عرف میں مسلم ومقبول ہوں، یہ تعبیر گذشتہ پیش کردہ تعبیر کہ قرآن کریم کا ظاہری انداز خطیبانہ ہے اور باطنی طور پر قرآن کریم براہین کا خزینہ ہے سے بہتر ہے، اگر چہ ''ظہر'' اور ''بطن'' کا لفظ حدیث نبوی میں واردشدہ ہے، لیکن موضع بحث میں اس طرح ظہر وبطن کی تعبیر سے یہ واہمہ گذر سکتا ہے کہ اللہ جل شانہ نے ان دونوں کو اپنے کلام میں بطور مدار ومعیار پیش فرمایا ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ قرآنی مطالب ومعانی تو وہ ہے جو آیات قرآنی عام عرف میں عربی طرز گفتگو کے مطابق پیش کرتی ہیں اور اسی کو تفسیر قرآن کا مدار ٹھہراتی ہیں، ازاں بعد قرآنی معارف وعلوم کی تفسیر کے لیے نظم قرآنی میں پائے جانے والے اشارات وکنایات کی روشنی میں ان لطائف واسرار کا ادراک کیا جاتا ہے جو بحر ناپیدا کنار کی مانند قرآن کریم میں نہیں پائے جاتے ہیں اور بلا شک وشبہ استدلال واحتجاج میں اس انوکھے اسلوب کا پیش کرنا جو تمام طبائع کے موافق ہو اور جو ایک بلند پایہ حکمت دان اور ایک ادنی انسان کے فہم کے لیے وہ برابر ہو بہت ہی دشوار گذار اور پیچیدہ ہوا کرتا ہے اور بشری قدرت کے وسائل عقل ودانش اور فنی طور وطریق کے باوجود اس اسلوب کے مطابق کلام پیش کرنا انسانی دسترس سے بالاتر ہے۔

آیت توحید کا مدار ومقصد

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ باری جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لو كان فيهما ألهة إلّا الله لفسدتا﴾

اس آیت کا مدار جسے عموماً لوگ سمجھتے ہیں کہ تعدد آلہہ کی صورت میں ''نظر آنے والا یہ محکم ومضبوط کائناتی نظام فساد اور تباہی کا شکار ہوکر نیست ونابود ہوجائے گا'' وہ، بلکہ اس آیت کا مقتضی ومطلب یہ ہے کہ اگر اس کائناتی نظام کا چلانے والا خداوند برحق وقہار کے علاوہ کوئی اور ہوتا، عام ہے کہ ایک الہ ہوتا یا متعدد آلہہ ہوتے، یہ نظام فساد اور تعطل کا شکار ہوجاتا، یعنی اس تعطل کا سبب صرف خدائے برحق کے نہ ہونے پر منتج ہوجائے گا، برابر ہے کہ خدا تعالی کے علاوہ ایک معبود ہو یا متعدد، اس آیت کا حقیقی مدار اور اساسی فائدہ اسی غرض کا مستفاد ہے، حضرت کشمیری نے اپنے قصیدہ ''ضرب الخاتم علی حدوث العالم'' میں بھی اس معنی ومقصد کی طرف اشارہ فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

''اگر اللہ کے علاوہ اس نظام کا کوئی کارساز ہوتا تو آسمان وزمین کا نظام بے عدلی اور ظلم کا شکار ہوکر تباہ وبرباد ہوجاتا۔''

راقم الحروف عرض رسا ہے کہ یہاں ایک لطیفہ بھی پیش نظر رہے کہ علمائے نحو نے اس آیت میں پائے جانے والے ''إلّا'' کے بارے میں فرمایا کہ یہ استثنائیہ نہیں بلکہ صفت کے بیان کے لیے ہے جو کہ ''غیر'' کے معنی میں ہوتا ہے، اس میں بھی یہی راز مضمر ہے کہ اگر یہاں پر ''إلّا'' کے محمل کو استثناء کے لیے لینے میں ایک خرابی لازم آئے گی، اس لیے کہ استثنائی معنی کی صورت میں آیت کا مفہوم یوں ہوگا ''اگر آسمان وزمین میں متعدد الہ ہوتے اور ان میں سے اللہ جل شانہ نہ ہوتے تو فساد برپا ہوجاتا''، اس مفہوم سے ایک دوسرا پہلو بھی حاصل ہوگا اور وہ یہ کہ اگر اس متعدد آلہہ میں سے اللہ جل شانہ کا استثناء نہ کیا جاتا بلکہ اللہ رب العزت بھی ان میں بطور ایک الہ ہوتے اور ان کے ساتھ کارفرماتے ہوتے تو فساد برپا نہ ہوتا، ایسی صورت میں آیت کو توحید محض پر کیسے دلیل قرار دیا جاسکتا ہے، اس تقدیر پر تو تعدد آلہہ جب کہ اللہ رب

العزت ہی بھی انہیں میں کارفرما ہونے کے امکان کا ثبوت ہوگا جو کہ سراسر ایک باطل معنی ہے، لیکن اگر "إلّا" کو "غیر" کے معنی پر حمل کیا جائے تب معنی یوں حاصل ہوگا کہ اگر اللہ برحق بزرگوار کے علاوہ کوئی کارساز چاہے ایک ہو یا بہت سے ہوں، چاہے اللہ رب العزت ان کے ساتھ ہوں یا نہ ہوں، بہرصورت آسمان وزمین کا یہ نظام تباہ و برباد اور محض تعطل کا شکار ہوجائے گا اور کائنات کا یہ محیر العقول، محکم ومضبوط نظام درہم برہم ہوجائے گا، جیسا کہ باری جل شانہ کا فرمان اقدس ہے:

﴿وما كان معه من إله إذا لذهب كل إله بما خلق ولعلا بعضهم على بعض﴾

آیت کا ظاہری مقصد ومنشا اسی غرض ومطلب کا بیان ہے۔ البتہ آیت کے مفہوم سے تعدد کے بطلان کا بھی فائدہ حاصل ہو رہا ہے، اس نکتہ کو خوب سمجھ لینا چاہیے اور خوب یاد رکھنا چاہیے۔

پھر اس برہان تمانع جس کی طرف اس آیت کریمہ کے ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے، علمائے امت نے اس کے متعدد طرق ومحامل کی تحقیق وتشریح فرمائی ہے، انہی طرق میں سے ایک ظنی بھی ہے اور ایک قطعی بھی ہے، امام فخر الدین رازیؒ نے التفسیر الکبیر میں برہان تمانع کی بیس سے کچھ اوپر وجوہ بیان فرمائی ہیں، جن میں بعض طرق برہانی اور بعض اقتناعی ہیں، اس تفصیل کے متعلق سیرابی کے لیے تفسیر کبیر کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے، جو شخص اپنی پیاس بجھانا چاہے مراجعت کرلے، والله الموفق والهادي إلى سواء الطريق۔

قرآن کریم کی مقدارِ معجز

جان لینا چاہیے کہ علمائے امت کا اس بارے میں اختلاف رائے ہوا ہے کہ کتنی مقدار قرآن کریم کی معجز ہے، امام باقلانیؒ نے اپنی "إعجاز القرآن" (صفحہ ۱۹۸، مطبوعہ سلفیہ) میں چند آراء بیان فرمائی ہیں، ہمارے حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک قرآن کریم کی سب سے چھوٹی آیت معجز ہے، اس جہت سے غور کیا جائے تو واقعی اس مقدار میں اعجاز بہت ہی پوشیدہ ہے اور کبھی کبھار اس اعجاز کی تحقیق ماہر علماء پر بھی مخفی رہا کرتی ہے اور اصل ہدف اعجاز صرف

اس شخص پر نمایاں ہوتا ہے جس نے معانی ومفاہیم کی باریکیوں میں غور وخوض کیا ہو اور علم بیان ومعانی کے سمندر میں غور وفکر کا جسم لے کر غوطہ زن ہوا ہو، اور مسلک اعجاز کی تمام جہات کی رعایت رکھنے پر بھی مکمل مقدرت رکھتا ہو، حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ امام الائمہ، فقیہ الامت حضرت امام ابوحنیفہؒ سے منقول یہ مسئلہ کہ قرآن کریم کی ایک آیت نماز میں فرض قرأت کے لیے کافی ہے، اسی طرح یہ مسئلہ کہ جنبی شخص کے لیے ایک آیت سے کم تو بطور قرأت پڑھنا تو جائز ہے، البتہ ایک پوری آیت کو پڑھنا صرف بطور دعاء اور ثناء جائز ہے بطور تلاوت قرآن جائز نہیں، یہ دونوں مسائل عین ممکن ہے کہ اسی کلیہ پر مستنبط ہوں کہ قرآن کریم کی معجز مقدار ایک آیت ہے، اور اگر واقعی اسی کلیہ پر مبنی ہو تو یہ امام اعظم کی دقت نظر اور علوشان کی نمایاں مثال ہے، اور ان کو فقیہ الامت کہنا بجا ہے، اس لیے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کو قرآنی حقائق ومعارف اور دینی اسرار ورموز کے متعلق نمایاں کمال حاصل تھا، دیگر فقہاء میں سے کسی نے اس لطیفہ کی واضح تصریح نہیں کی ،البتہ بعض فقہاء نے اتنا ضرور فرمایا ہے کہ امام موصوفؒ نے اس مسئلہ کے لیے استدلال اس طور پر کیا ہے کہ ایک آیت سے کم مقدار پر قرآن کریم کا اطلاق ہی نہیں ہوتا ہے، حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ایک طویل آیت میں سے کتنی مقدار معجز ہے اس کی تعیین میں نہیں کرسکتا ہوں۔

خاتمہ کلام

جیسا کہ قاری کو بخوبی معلوم ہے کہ میں نے گذشتہ چند اوراق میں حضرت شیخ کے علمی افادات اور اس مقدمہ کے مناسب وموافق مباحث کی اپنی فکر کی رسائی کے بقدر شرح وتفصیل رقم کر دی، شاید کہ ان مباحث کے پیش نظر آپ کو حضرتؒ کے قرآنی مشکلات کے متعلق شرح وبسط کی بھر پور مقدرت، قرآنی معارف میں رسوخ اور اعجاز قرآنی کے متعلق حضرتؒ کے وسیع افکار وخیالات کا علم ہوا ہوگا، اسی رسوخ کی بنا پر حضرتؒ بطور تحدیث بالنعمۃ فرمایا کرتے تھے کہ:

> ''اللہ رب العزت نے میری طبیعت میں فصاحت وبلاغت کا
> وہ معیار ودیعت فرمایا ہے جس کی بنا پر فصیح کلام، غیر فصیح سے اور بلیغ کلام،
> غیر بلیغ سے نمایاں طور پر آشکارا ہوجاتا ہے اور میرے ذوق ووجدان

کے پیش نظر میں فصیح وبلیغ کلام کی امتیازی خصوصیات اور بلند پایہ مراتب کا ادراک بخوبی کرلیتا ہوں ، اس معیار ومقیاس میں کسی کی تقلید نہیں کرتا ہوں ، علمائے ادب نے کتنے ہی اشعار کی فصاحت میں طعن وقدح فرمایا جبکہ وہی اشعار میرے خیال میں فصیح ہوا کرتے ہیں اور کتنے ہی مفردات وکلمات ہیں کہ ان کی بلاغت کے متعلق علمائے ادب نے جرح فرمائی ہے اور وہی کلمات میرے نزدیک بلیغ ہیں۔''

راقم الحروف کہتا ہے اسی باب کی ایک مثال ابو الطیب المتنبی کے اس شعر کا دوسرا مصرعہ ہے:

و تسعدني في غمرة بعد غمرة
سبوح لها منها عليها شواهد

ترجمہ: میری ہر مشکل میں وہ گھوڑا مدد کرتا ہے جو گویا کہ تیراک گھوڑا ہے، اس گھوڑے کی عمدگی کے لیے اسی کے خصائل اس پر گواہ ہیں۔

علامہ باقلانیؒ کی اعجاز القرآن اور شیخ کشمیریؒ

بعض علمائے فن کا دعوی ہے کہ یہ دوسرا مصرعہ بوجہ کثرت تکرار ضمائر غیر فصیح ہے، حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ اس مصرعہ میں کوئی وجہ نہیں کہ جس کی بنا پر اس کی فصاحت پر تنقید کی جاسکے بلکہ یہ مصرعہ میرے نزدیک فصیح ہے، چونکہ حضرت شیخؒ علوم فصاحت و بلاغت میں نہایت بلند مرتبہ پر فائز تھے اسی بنا پر ان کو حضرت امام باقلانیؒ کی کتاب ''إعجاز القرآن'' کا طرز تالیف کچھ زیادہ پسند نہ تھا اور فرماتے تھے کہ امام باقلانیؒ تو ائمہ متکلمین کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اعجاز القرآن موصوف کا فن نہیں تھا، یہ فن تو حضرت شیخ عبدالقاہر جرجانیؒ اور حضرت شیخ زمخشریؒ کا ہے، اللہ رب العزت نے ہر فن کے لیے علیحدہ رجال کار پیدا فرمائے ہیں، چنانچہ علم بلاغت کے رجال علیحدہ اور علم کلام کے رجال علیحدہ مرتبت ومنزلت رکھتے ہیں۔

راقم کہتا ہے کہ حضرت شیخ کا یہ کلام بالکل اسی طرح ہے جس طرح امام ابن اثیر جزریؒ

نے ''المثل السائر'' صفحہ ۱۴۸ پر امام ابوالفتح ابن جنیؒ کے متعلق فرمایا ہے:

ابوالفتح ابن جنیؒ کے متعلق یہ بات پہنچی ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب ''المفسر'' میں جو ابو الطیب کے اشعار کی شرح ہے، ابوالطیب کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

تبل خدی کلما ابتسمت

من مطر برقه ثنایاها

ترجمہ: محبوبہ میرے رخسار کو جب بھی وہ ہنستی ہے ایسی بارش سے تر کر دیتی ہے جس کی بجلی محبوبہ کے اگلے دانت ثنایا سے نکلا کرتی ہے۔

کی شرح یوں فرمائی ہے کہ محبوبہ ابوالطیب کے منہ پر تھوکا کرتی تھی، پھر ابن جنیؒ نے یوں اظہار خیال فرمایا ہے کہ ابوالطیب اس تھوک پھینکنے کو اس طرح بیان کر رہے ہیں کہ وہ ہنستی ہے جس کی وجہ سے تھوک اس کے منہ سے نکل کر ابوالطیب کے چہرے پر پڑ جاتی ہے، چنانچہ ابو الطیب نے تھوک کو بارش سے تشبیہ دی ہے، ابن اثیر فرماتے ہیں کہ میرا نہیں خیال کہ کسی عام شخص کا بھی وہم وگمان وہاں تک پہنچ سکتا ہے، جہاں تک ابن جنیؒ کا خیال پہنچا ہے، باوجودیکہ امام ابن جنیؒ علمائے عربیہ میں امام تسلیم کیے جاتے ہیں جن کی طرف طلبا رخت سفر باندھا کرتے تھے، اب دیگر کے متعلق کیا کہا جائے گا جو اس طرح کے امام بھی نہ ہوں اور پھر کسی فن میں کلام کریں، اس لیے کہ فصاحت وبلاغت کا فن، فن نحو واعراب سے بالکل علیحدہ فن ہے۔

پھر صفحہ ۱۱۳ پر یوں فرماتے ہیں کہ فصاحت کے اسرار ورموز علمائے عربیت سے نہیں لیے جاسکتے ہیں، ان سے تو صرف نحوی یا صرفی مسائل لیے جاسکتے ہیں، یا لغوی کلمہ وغیرہ کے متعلق دریافت کیا جاسکتا ہے، فن فصاحت کے اسرار ورموز کے لیے ایک الگ قوم ہے جو اس کے علم میں نمایاں کارکردگی کے ساتھ مخصوص ہے۔

راقم الحروف کہتا ہے ۱۳۴۶ھ سے میں حضرت شیخؒ کا علامہ باقلانیؒ کی اعجاز القرآن پر یہ تبصرہ سن رہا تھا، اور حضرت شیخ کے فن بلاغت میں رسوخ اور کمال کے پیش نظر میں قلبی طور پر اعجاز القرآن کے متعلق حضرت شیخؒ کی رائے ہی کا معتقد رہا، پھر جب کچھ عرصہ بعد بتوفیق خداوندی مجھے باقلانیؒ کی اس کتاب کے مطالعہ کا موقعہ میسر آیا اور موصوف کی اس عالی شان کتاب

کی مجھے کچھ معرفت ہوئی تو میں حضرت شیخؒ کے اس کتاب کے متعلق تبصرہ پر بہت تردد کا شکار ہو گیا اور جو میں اس کتاب کے متعلق معتقد تھا وہ اعتقاد یکسر تبدیل ہو گیا، اللہ حضرت شیخؒ کا مرتبہ بلند فرمائے، بہرحال ازاں بعد میں نے باقلانیؒ کی اس کتاب کا مطالعہ دوبارہ بصد غور و فکر کیا اور حضرت شیخ کے کلام کے متعلق منتشر افکار کو جمع کیا اور اعجاز قرآنی کے باب کے متعلق شیخ کے فرمودات کے متعلق جانچ پڑتال کی، پھر حضرت شیخ او امام باقلانیؒ کے کلام میں تقابل کیا اور ان میں امتیاز و اختصاص کو جانچا پرکھا، تب مجھے یقینی طو پر معلوم ہو گیا کہ حضرت شیخ کا تبصرہ اس کتاب کے متعلق برحق ہے، اس لیے کہ فن اعجاز کے متعلق حضرت شیخ کی معرفت بہت زیادہ ہے، جس کی بنا پر حضرت شیخ جیسی شخصیت کو امام باقلانیؒ کے کلام پر اعتراض کا حق بجا ہے، پھر ان امور کے متعلق میں نے غور و فکر کیا جن کی بنا پر اس کتاب پر تنقید کی گئی ہے تو خدا کا فضل ہوا کہ مجھے اطمینان بخش وجوہات مل گئیں، ذیل میں ان وجوہ کی طرف میں اجمالی طور پر اشارہ کرتا ہوں:

امر اول: امام باقلانیؒ کی کتاب سامنے رکھیے اور بصیرت افروز، گہری نظر سے اس کا مطالعہ کیجیے اور اس کی مختلف، منتشر ابحاث میں غور و فکر کیجیے تو آپ پر یہ بات نمایاں ہو گی کہ امام موصوف نے اعجاز القرآن کے متعلق کوئی ایسی جدید بات تحریر نہیں فرمائی ہے جو ان سے پہلے نہ واضح کی جا چکی ہو، اور قرآنی اعجاز کے متعلق کوئی ایسا بند دروازہ نہیں کھولا ہے جو ان سے پہلے کسی نے نہ کھولا ہو اور دیگر علماء ان کے اختراع کردہ افکار و آراء میں ان کے خوشہ چین بنے ہوں، بلکہ امام خطابیؒ، امام واسطیؒ اور علامہ جاحظؒ وغیرہ جہابذہ علم بلاغت علامہ باقلانیؒ کی پیش کردہ آراء ان سے پہلے پیش فرما چکے ہیں، البتہ اتنی بات ضرور مسلم ہے کہ علامہ موصوف نے ان حضرات کے کلام کی تفصیل، مبہم مقامات کی تفسیر اور ہر بحث کو اس کے مناسب موقع و مرتبہ دیا ہے، لیکن علامہ باقلانی جیسی باکمال شخصیت کے لیے یہ کوئی کارنامہ شمار نہیں کیا جا سکتا ہے اور اس کتاب کے پیش نظر ان کی یہ تحریر کوئی قابل تعجب بات ہرگز نہیں ہے، یہ بھی ممکن نہیں کہ یوں کہا جا سکے کہ موصوف کو متقدمین علماء کی اس باب کے متعلق آراء کی اطلاع نہ ہو اس کے ساتھ ساتھ علامہ باقلانیؒ نے چند ایسے امور میں تفصیل و تطویل سے کام لیا ہے، جن کا وجوہ اعجاز سے کوئی تعلق نہیں اور قاری اس

طویل توضیح سے کافی تنگ دلی کا شکار ہوجاتا ہے، اس کے بالمقابل آپ حضرت شیخ کے کلام میں بار بار غور کیجیے اور خوب جانچیے! آپ ان شاء اللہ ایسے امور کی بحث پائیں گے جو اس باب میں بالکل جدید ہوں گے۔ اور یقینا آپ ان کو ان کے تحقیق کردہ امور میں اس وسیع میدان کا جس میں آراء وافکار کی سواریاں تھک کر نڈھال ہوجاتی ہیں سب سے سابق شخص پائیں گے۔

امر دوم: حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم کا اعجاز میرے لیے مشرق سے طلوع ہونے والے آفتاب سے بھی زیادہ روشن اور نمایاں ہے، اس کی وجہ گذشتہ صفحات میں بیان کی جاچکی ہے اور قرآن کریم کی سب سے چھوٹی آیت حضرت کے ہاں معجز تھی، حضرت شیخ کا معاملہ اس طرح نہ تھا کہ بعض آیات میں ان کے لیے اعجاز واضح ہو اور بعض میں پوشیدہ ہو، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ مراتب اعجاز و بلاغت کے درجات میں حضرت شیخ ہاں بھی تفاوت مسلم تھا، لیکن یہ ایک علیحدہ بحث ہے جس کا اعجاز کے پوشیدہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں، دوسری جانب امام باقلانیؒ صفحہ ۱۶۵ پر یوں فرماتے ہیں کہ ہمارا اعتقاد تو یہ ہے کہ بعض قرآن کا اعجاز بہت واضح ہے جبکہ بعض قرآن کا اعجاز نہایت پوشیدہ اور دقیق الادراک ہے، اور صفحہ ۱۶۳ پر یوں تحریر فرماتے ہیں بعض قرآن میں تو اعجاز پر دلالت بہت واضح اور آشکارائے عامۃ الخلق ہے اور آیت بھی بالکل واضح ہوتی ہے۔

پھر صفحہ ۱۹۹ پر رقم طراز ہیں آپ غور فرمایے تو آپ کو بخوبی معلوم ہوجائے گا کہ بعض سورتوں اور آیات میں قرآنی اعجاز نمایاں تر ہے اور بعض میں پوشیدہ تر ہے، اس بنا پر بعض سور و آیات کے اعجاز کی معرفت کے لیے بہت زیادہ غور وخوض اور شدید بحث وتمحیص کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ادنی تامل سے اعجاز واضح ہوجاتا ہے اور بعض میں نظر وبصیرت کی گہرائی درکار ہوتی ہے، پھر لطیف وعمیق بحث وتفتیش کے بعد اعجاز واضح ہوتا ہے اور غور وخوض کرنے والا اعجاز کا ادراک حاصل کرتا ہے، اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ بعض سورتوں میں وجہ اعجاز واضح ہی نہ ہو ایسی صورت میں اجماع کی طرف لوٹنا پڑتا ہے اور قرآن کریم کو بلا شک وشبہ معجز کہنا پڑتا ہے، یا پھر توقیفی اعجاز کا مسلک اختیار کرنا ہوتا ہے یا پھر اعجاز پر اس دلیل سے احتجاج کیا جاتا ہے کہ اگر یہ

سورت معجز نہ ہوتی تو تمام عرب اس جیسا کلام لانے عاجز نہ ہوتے۔

وجوہ اعجاز اور اس سے متعلق قابل قدر مباحث جو مجھے میسر ہوئیں میں نے اس مقدمے میں پیش کردی ہیں اور محض اللہ کے فضل اور حسن توفیق سے اس باب کا گویا ایسا وقیع خلاصہ میں نے پیش کردیا ہے کہ اہل عقل و دانش کو اس باب کے متعلق اب علیحدہ کتاب کے مطالعہ سے گویا مستغنی کردیا ہے، واللہ ولي التوفيق والإعانة، وصلى الله تعالى على أفصح العرب العرباء وعلى اله وصحبه وبارك وسلم تسليما كثيرا۔

متشابہ آیات والفاظ کے متعلق لطیف بحث

اعجاز کے متعلق اس بحث کے اختتام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام جلال الدین سیوطیؒ کی "الاتقان"، "النوع الثالث والستين" (۶۳ بحث) میں ذکر کردہ مباحث کا خلاصہ پیش کردیا جائے، اس نوع میں آیات متشابہات کے متعلق بحث کی گئی ہے، یعنی وہ آیات جن میں ایسے کلمات پائے جاتے ہوں جن کے معانی ایک جیسے ہوں اور الفاظ مختلف ہوں، امام سیوطیؒ فرماتے ہیں:

"اس موضوع کے متعلق متقدمین نے علیحدہ تصانیف تحریر فرمائی ہیں، جن میں سب سے اول میرے خیال میں امام کسائیؒ ہیں، پھر اس فن کو امام سخاویؒ نے منظوم صورت میں بیان فرمایا، اس کی شرح امام کرمانیؒ نے اپنی مستقل کتاب "البرهان في متشابه القرآن" میں فرمائی، اس سے بہتر شرح ابوعبداللہ رازیؒ نے "درة التنزيل وغرة التأويل" میں فرمائی ہے اور پھر اس سے بڑھ کر شرح ابوجعفر بن زبیرؒ کی "ملاك التأويل" ہے (مجھے اس کتاب کے متعلق معلوم نہیں ہوسکا ہے) قاضی بدرالدین بن جماعہؒ نے بھی اس فن کے متعلق باقاعدہ ایک کتاب تالیف فرمائی ہے، جس کا نام موصوف نے "كشف المعاني عن متشابه المثاني" تجویز فرمایا ہے۔

کتاب "أسرار التنزيل" جو کہ "قطف الأزهار في كشف الأسرار" کے نام سے معروف ہے، اس کتاب میں اس کی بہت سی مقدار ہے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قرآن

کریم میں ذکر کردہ قصص جو مختلف سورتوں میں بیان کئے گئے ہیں اور ایک ہی قصہ کے متعلق جو علیحدہ علیحدہ طرز اپنائے گئے ہیں، اور ان میں کیا معارف ودقائق مضمر ہیں ان جیسے مباحث سے تعرض فرمایا گیا ہے۔

کبھی کبھار قصہ کا ایک جز ایک آیت میں مقدم اور دوسری آیت میں وہی جز مؤخر بیان ہوتا ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں باری جل شانہ کا فرمان ہے "وادخلوا الباب سجدا و قولوا حطة" اور سورۂ اعراف میں یوں فرمایا: "وقولوا حطة وادخلوا الباب سجدا" اسی طرح سورۂ بقرہ میں ہے "وما أهل به لغير الله" اور دیگر پورے قرآن میں "وما أهل لغير الله به" ہے۔

اسی طرح بعض مواضع میں ایک آیت زیادتی حروف کے ساتھ ہے، اور اسی مضمون کی حامل آیت دوسری جگہ بغیر زیادتی واقع ہوئی ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ہے: "سواء عليهم أ أنذرتهم" اور سورۂ یٰسین میں "وسواء عليهم أ أنذرتهم" اسی طرح سورۂ بقرہ میں ہے "و يكون الدين لله" اور سورۂ انفال میں ہے "كله لله"۔

ایک جگہ ایک لفظ معرفہ ہے اور دوسری جگہ نکرہ ہے یا ایک جگہ مفرد اور دوسری جگہ جمع ہے یا ایک جگہ ایک حرف کے ساتھ ہے اور دوسری جگہ دوسرے حرف کے ساتھ ہے یا ایک جگہ مدغم ذکر کیا گیا ہے اور دوسری جگہ بلا ادغام۔

اس نوع (۶۳) کا تعلق دراصل نوع المناسبۃ سے ہے لیکن وضاحت کی غرض سے اس نوع کو علیحدہ ذکر کیا جارہا ہے، ذیل میں اس نوع کی چند مثالیں توجیہات کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں ملاحظہ ہوں:

۱-سورہ بقرہ میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: "هدى للمتقين" اور سورہ لقمان میں فرمایا: "هدى ورحمة للمحسنين" چونکہ سورہ بقرہ میں مجموعہ ایمان بیان ہوا، اس لئے وہاں متقین کا ذکر مناسب تھا، اور یہاں رحمت کا ذکر فرمایا گیا، اس لئے یہاں محسنین کا ذکر مناسب تھا۔

۲-اسی طرح سورہ بقرہ میں ارشاد فرمایا: "وقلنا يا آدم اسكن انت وزوجك

الجنة و کلا" اور سورہ اعراف میں فرمایا "فکلا" یعنی فاء کے ساتھ، اس کی توجیہ میں یوں کہا گیا ہے کہ سورہ بقرہ میں ''سکنی'' سے مراد ''سکنی'' اقامت اور سورہ اعراف میں مراد اتخاذ مسکن ہے، چنانچہ جب باری تعالیٰ شانہ کی طرف قول کی نسبت تھی تو سورہ بقرہ میں صراحت ہوئی اور فرمایا گیا "وقلنا یا آدم" تو اکرام کی زیادتی کے لئے مناسب تھا کہ ''واؤ'' لایا جائے جو سکنی اور ماکل دونوں کے جمع پر دلالت کرے، اسی بناء پر اس آیت میں مزید اکرام کے لئے ''رغدا" اور "حیث شئتما" بھی ہے، تاکہ کلی عموم پر دلالت واضح ہو، جبکہ سورہ اعراف میں فرمایا گیا "و یا آدم" یعنی صراحتاً قول کی نسبت اللہ جل شانہ کی طرف نہیں فرمائی گئی، چنانچہ یہاں ''فا'' لاکر اکل کے سکنی پر جس کا حکم دیا گیا ہے مرتب ہونے کا بیان ہو، اس لئے کہ کھانا، جائے اقامت کی تعیین کے بعد ہی ہوا کرتا ہے، اسی طرح یہاں "من حیث شئتما" فرمایا، جو "حیث شئتما" کی مانند نہیں ہے۔

۳-باری تعالیٰ کا ارشاد ہے "تنفعها شفاعة" آیت کا یہ ٹکڑا کچھ رد و بدل کے ساتھ اسی سورہ بقرہ میں دوبارہ آیا ہے، یہ رد و بدل یوں ہوا ہے کہ " العدل " ایک آیت میں مقدم اور دوسری آیت میں مؤخر آیا ہے اور "شفاعة" کی طرف ایک مرتبہ قبول کی نسبت کی گئی ہے اور دوسری مرتبہ نفع کی، اس کے متعلق پر حکمت توجیہ یوں کی گئی ہے کہ پہلی آیت میں ''منها" کی ضمیر سے مراد شفاعت کرنے والا نفس ہے، جبکہ دوسری آیت میں مراد مجرم نفس ہے، چنانچہ پہلی آیت کی تفسیر وتوضیح یوں ہے کہ شفاعت کرنے والے نفس جو غیر کی طرف سے بدلہ دینے کے لئے پیش ہوا ہے، اس سے شفاعت قبول نہ کی جائے گی اور نہ ہی اس نفس شافعہ سے کوئی فدیہ اور تاوان قبول کیا جائے گا۔ اور اس آیت میں شفاعت کی تقدیم کی وجہ بھی یہی ہے کہ شفاعت کرنے والا شفاعت کو فدیہ و تاوان ادا کرنے پر مقدم کرتا ہے، دوسری آیت کی تفسیر یوں بیان کی گئی ہے کہ مجرم نفس سے اس کے جرم کے بدلہ میں نہ فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ اس کی طرف اس کے حق میں سفارش کرنے والے کی سفارش ہی قبول ہوگی، اور آیت میں "العدل" کی تقدیم اس لئے ہے کہ شفاعت کی ضرورت تاوان کے قبول نہ کرنے کی صورت میں پیش آتی ہے، اس کی تائید

یوں بھی ہوتی ہے کہ پہلی آیت میں ”لا تقبل منها شفاعة “ فرمایا اور دوسری آیت میں ”لا تنفعها شفاعة“ فرمایا، اس لئے کہ شفاعت کی قبولیت شفاعت کرنے والے کے لئے ہوتی ہے اور شفاعت کا فائدہ جس شخص کے لئے سفارش کی جارہی ہے، اس کو پہنچتا ہے۔

۴-باری جل جلالہ کا فرمان ہے: ”و إذ نجيناكم من آل فرعون يسومونكم سوء العذاب يذبحون “ اور سورۂ ابراہیم میں اسی مضمون کی متعلقہ آیت میں ”و يذبحون“ یعنی واؤ کی زیادتی کے ساتھ فرمایا، توجیہ اس کی یوں بیان کی گئی ہے کہ پہلی آیت خدا تعالیٰ کا خطاب ہے، جس میں ان پر پیش آمدہ مصائب ومشکلات کا شمار کرانا نہ فرمایا اور دوسری آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی حکایت ہے جس میں ان مصائب کی گنتی فرمائی گئی ہے اور سورہ اعراف میں جو ”و تقتلون“ فرمایا ہے تو الفاظ کے اس رد وبدل کو ہی علم بلاغت میں اسلوب تفنن کہا جاتا ہے جو بلیغ کلام کا ایک نکتہ اور لطیفہ ہے۔

۵-اللہ جل جلالہ ارشاد فرماتے ہیں: ”و إذ قلنا ادخلوا هذه القرية“ اور سورہ اعراف میں یہی مضمون چند الفاظ کے اختلاف کے ساتھ مذکور ہوا ہے، یہاں پر پائے جانے والے لطیفے کی تشریح یہ ہے کہ سورۂ بقرہ والی آیت ”منعم عليهم“ کے متعلق تذکرہ کے ذیل میں واقع ہوئی ہے، سورۂ بقرہ میں ارشاد گرامی ہے: ”يبني اسرائيل اذكروا نعمتي“ چنانچہ اس مناسبت سے اس آیت ”وإذ قلنا ادخلوا“ میں قول کی اللہ جل شانہ کی طرف نسبت کرنا مناسب ہے، اور اسی طرح ”رغدا“ کا لفظ بھی بجا ہے، اس لئے کہ اس سے منعم بہ کے کمال کا علم ہوتا ہے، اسی طرح ”وادخلوا الباب سجدا“ کی تقدیم اور ”خطاياكم“ کا صیغہ (جو جمع کثرت کے لئے موضوع ہے) کا ذکر بھی مناسب ہے، اسی طرح ”وسنزيد“ میں ”واو“ کی زیادتی بھی بجا ہے، اس لئے کہ واؤ ماقبل ومابعد میں جمعیت پر دلالت کرتا ہے اور اسی مذکورہ لطیفہ کی بناء پر ”فكلوا“ میں فاء بھی موقع ومحل میں ہے، اس لئے کہ ”اکل' دخول قریہ پر مرتب ہے، جبکہ سورہ اعراف میں اس قضیے کا سیاق ان کو توبیخ وتشنیع کرنا ہے، باری جل شانہ کا ارشاد ہے: ”اجعل لنا الها كما لهم آلهة“ پھر ان بنی اسرائیل کے ایک اور طغیان گاؤ کی پوجا پاٹ کرنے

کا بیان بھی ہوا ہے، اس بناء پر مناسب تھا کہ صیغہ قول کو مجہول ذکر کیا جائے، چنانچہ ارشاد ہوا: "وإذ قيل لهم" اسی طرح "رغدا" کا ترک مناسب مقام ہوا، اور چونکہ سکنی کے ساتھ اکل بہرحال جمع ہوگا، اس لئے فرمایا "وکلوا" اسی طرح گناہوں کی بخشش کا ذکر اور "سنزید" کا بغیر "واؤ" ذکر کرنا برمحل ہوا، اسی طرح جب سورۂ اعراف میں بعض لوگوں کے ہدایت یافتہ ہونے کا یوں بیان کیا گیا: "ومن قوم موسٰى أمة يهدون بالحق" تو مناسب یہی تھا کہ ظالمین کو بھی بصورت تبعیض بیان کیا جاتا، چنانچہ ارشاد ہوا "الذين ظلموا منهم" اور چونکہ سورہ بقرہ میں اس طرح بعض ہدایت یافتگان کا یوں بیان نہ ہوا تھا، اس لئے وہاں ظالمین کے متعلق بھی بلاتبعیض یوں فرمایا گیا: "فبدّل الذين ظلموا قولا غير الذى" اور سورۂ بقرہ میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ جنہوں نے ظلم نہ کیا تھا وہ عذاب و بلا سے سلامت رہے، اس لئے کہ نزول عذاب کو صرف ظالمین کے ساتھ خاص فرمایا گیا ہے، جبکہ "ارسال" شدت وقوع کے معنی میں "انزال" سے زیادہ مبالغہ وتاکید کا حامل ہے، اس لئے سورہ بقرہ کے مضمون بیان انعامات کے مناسب ذرا خفیف تعبیر یعنی انزال ہی مناسب تھی، لفظ فسق سے ظلم لازم نہیں آتا ہے (اس لئے کہ لفظ فسق خاص اور لفظ ظلم عام ہے) جبکہ لفظ ظلم سے فسق لازم آتا ہے، اس طرح ہر تعبیر کا اپنے سیاق مضمون کے مناسب اور لائق ہونا واضح ہوا۔

۶-اسی طرح سورہ بقرہ میں فرمایا "انفجرت" اور سورہ اعراف میں فرمایا: "انبجست" اس لئے کہ "انفجار" سے پانی کی کثرت میں مبالغہ بیان کیا جاتا ہے، چنانچہ نعمتوں کے بیان کے سلسلے میں یہ لفظ ہی موقع کے مناسب ہے۔

۷-سورۂ بقرہ میں اللہ جل شانہ کا ارشاد پاک ہے: "وقالوا لن تمسّنا النّار إلّا أيّاما معدودة" اور سورہ آل عمران میں فرمایا: "معدودات"، امام ابن جماعۃؒ اس کی توجیہ کے متعلق فرماتے ہیں، اس قول کے قائل یہودیوں کے دو فرقے تھے، ایک کا عقیدہ تھا کہ دنیا کے ایام کے بقدر سات دن جہنم کا عذاب بھگتنا پڑے گا، اور دوسرے فرقہ کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم اپنے آباء واجداد کے چالیس دن گاؤ کی پرستش کرنے کی وجہ سے چالیس دن تک عذاب دیئے جائیں

گے، اب سورہ بقرہ کی آیت میں دوسرے فرقے کے عقیدہ کے مطابق جمع کثرت سے تعبیر کی گئی ہے اور سورہ ال عمران میں پہلے فرقہ کے عقیدہ کے مطابق جمع قلت سے تعبیر کی گئی ہے، امام ابوعبد اللہ رازیؒ اس کی توجیہ میں فرماتے ہیں کہ یہ فرق صنعت تفنن کی بنا پر ہے۔

۸-باری تعالیٰ ارشادفرماتے ہیں: "ان هدَى الله هو الهدٰى "اور سورہ ال عمران میں فرمان اقدس ہے:" ان الهدٰى هدى الله"اس لئے کہ سورہ بقرہ میں ہدایت سے مراد تحویل قبلہ کا بیان ہے اور سورہ ال عمران میں ہدایت سے مراد دین اسلام ہے، اس لئے کہ سورہ ال عمران میں اس آیت کے ماقبل میں باری عزاسمہ کا یہ فرمان ہے:"لمن تبع دينكم"آیت کا مقصد ومطلب یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول دین، دین اسلام ہی ہے۔

۹-باری تعالیٰ کا فرمان اقدس ہے:"رب اجعل هذا بلدا أمنا" اور سورۂ ابراہیم میں فرمایا"هذا البلد أمنا"اس لئے کہ پہلی آیت میں جو دعا ہے، وہ مکہ کے شہر سے قبل اس وقت مانگی گئی ہے جبکہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو اس بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑ کر جا رہے تھے، تب دعا کی کہ اللہ اس شہر کو بسا دے اور دوسری آیت میں موجود دعا اس وقت کی ہے جب کہ دوبارہ مکہ تشریف لائے تھے، اس وقت جرہم قبیلہ مکہ میں آباد ہو چکا تھا اور مکہ باقاعدہ ایک شہر کی صورت اختیار کر چکا تھا، تب حضرت ابراہیم علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس شہر کے لئے امن وآشتی کی دعا مانگی۔

۱۰-باری عزاسمہ کا ارشاد ہے: "قولوا أمنا بالله وما أنزل إلينا" جبکہ سورہ ال عمران میں فرمان اقدس یوں ہے: "قل أمنا بالله وما أنزل علينا" اس لئے کہ پہلی آیت میں تمام مسلمین سے خطاب فرمایا گیا ہے، جبکہ دوسری آیت میں صرف نبی اکرم ﷺ سے خطاب فرمایا گیا ہے۔ پھر حرف جار "إلٰى" کے ذریعے تمام جہات سے انتہاء کا بیان کیا جاتا ہے، اور حرف جار "علٰى" سے جہت علو سے انتہاء کا بیان ہوتا ہے، چونکہ مسلمانوں کو قرآن کریم ہر جہت سے پہنچ جایا کرتا تھا، اس لئے ان کے متعلق ذکر کے وقت "إلٰى" مناسب تھا اور حضور ﷺ پر صرف جہت علو سے پہنچتا تھا، اس لئے وہاں "علٰى" کے ساتھ ذکر مناسب تھا، چنانچہ "علينا" فرمایا گیا،

اسی لطیفے کے پیش نظر آپ ﷺ تک پہنچنے والی اشیاء کے ساتھ اکثر "علی" اور پوری امت تک پہنچنے والی اشیاء کے ساتھ "إلی" مستعمل ہوا کرتا ہے۔

۱۱-باری جل وعلا ارشاد فرماتے ہیں: "تلك حدود الله فلاتقربوها" اور بعد والی آیت میں فرماتے ہیں "فلاتعتدوها" اس لئے کہ پہلی آیت چند منہیات کے تذکرہ کے بعد آئی ہے، لہذا مناسب تھا کہ ان منہیات کے قرب سے روکا جائے، اور دوسری آیت چند اوامر کے تذکرہ کے بعد آئی ہے، اس دوسری آیت میں مناسب یہی تھا کہ ان حدود کے تجاوز وتعدی سے نہی وارد کی جائے، جس کے ضمن میں یہ امر پایا جاتا ہے کہ ان حدود کے آتے ہی وقوف اختیار کیا جانا چاہئے۔

۱۲-اللہ جل شانہ کا فرمان عالیشان ہے: "نزل عليك الكتاب" اور تورات وانجیل کے متعلق فرمایا "وأنزل التوراة والإنجيل" اس لئے کہ کتاب اللہ العظیم یعنی قرآن کریم تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے، چنانچہ "نزل" بصیغہ تفعیل جو تکرار پر دلالت کرتا ہے، لایا گیا، اس کے برخلاف تورات اور انجیل یک دم ویک دفعہ نازل ہوئی ہیں، اس لئے ان کے ساتھ "انزل" جو یکبارگی نزول کا معنی رکھتا ہے، ذکر فرمایا گیا۔

۱۳-خداوند کریم کا ارشاد ہے: "لاتقتلوا أولادكم من إملاق" اور سورۂ اسراء میں فرمایا "خشية إملاق" ذکر کیا گیا، اس لئے کہ اول آیت میں خطاب مفلس فقراء کو ہے، اس کے مناسب تعبیر فرمائی گئی: "نحن نرزقكم" کہ ہم تم کو روزی دیں گے جس سے تمہارے فقر کا ازالہ ہو جائے گا، پھر فرمایا "وإياهم" یعنی تمہاری ان اولاد کو بھی ہم رزق دیں گے، دوسری آیت میں خطاب ان مالداروں اور صاحب وسعت افراد کو ہے جو تنگدستی کے خوف سے اولاد کو قتل کیا کرتے تھے، آیت کا مفہوم یوں ہے کہ: "اپنی اولاد کو تنگدستی کے ڈر سے کہ مبادا تم کو ان کے سامان عیش مہیا کرنے کی وجہ سے فقر واملاق لاحق ہو جائے" اسی مفہوم اور توجیہ کے پیش نظر اس آیت کے ساتھ "نحن نرزقهم وإيّاكم" کی تعبیر مناسب ہے۔

۱۴-اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "فاستعذ بالله إنّه سميع عليم" اور سورہ

فصلت میں ارشاد فرماتے ہیں: "إنّه هو السميع العليم" ابن جماعہؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ سورہ اعراف کی آیت پہلے نازل ہوئی ہے اور سورہ فصلت کی بعد میں، اس لئے سورہ فصلت میں ان صفات کو معرفہ لانا برمحل و بجا تھا، چنانچہ سورہ فصلت کی آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ: وہی سننے والی جاننے والی ذات جس کا تذکرہ شیطان کے وساوس کے متعلق ہدایت کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

۱۵- باری تعالیٰ کا فرمان عالی قدر ہے: "المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض" مؤمنین کے حق میں یوں فرمایا کہ: "بعضهم أولياء بعض" اور کفار کے حق میں فرمایا "والذين كفروا بعضهم أولياء بعض" یہ تعبیروں کا اختلاف اس لئے ہے کہ چونکہ منافقین کی آپس میں مدد اور معونت کسی معین دین اور مقرر شریعت پر نہیں ہوتی ہے بلکہ ان میں سے بعض یہودی تھے اور بعض مشرک، اس لئے فرمایا گیا ہے "من بعض" یعنی اس شک ونفاق میں یہ منافقین بعض بعض سے ہیں، جبکہ مؤمنین کی آپس میں ولایت ونصرت دین اسلام پر اور کفار کی باہمی امداد واستعانت اس کفر پر تھی جس کا وہ اعلان کیا کرتے تھے، مؤمنین وکفار دونوں فریق اس باہمی ولایت ومدد میں ایک مجتمع امر پر تھے، اس لئے ان کے متعلق اولیاء کے کلمہ سے تعبیر فرمائی گئی، برخلاف منافقین کے، جن کے متعلق باری جل وعلا کا فرمان ہے "تحسبهم جميعا وقلوبهم شتى" اس لئے ان کے لئے علیحدہ طرز کی تعبیر ارشاد فرمائی گئی۔

ان چند مذکورہ امثلہ کے ذکر سے ان کے مانند دیگر آیات میں مناسبات پر روشنی پڑتی ہے، اس باب کی بہت سی مثالیں تقدیم وتاخیر، اور فواصل وغیرہ کے متعلق فصول میں بھی گذر چکی ہیں۔

حضرت شیخ کشمیریؒ کے چند منتشر فرمودات

جان لینا چاہئے کہ حضرت شیخ کے قرآنی علوم کے متعلق کئی منتشر قیمتی ملفوظات ہیں جن کی روشنی میں قرآن کریم کی مختلف ابحاث میں نظم وربط پیدا ہو جاتا ہے، یہ مباحث عمدہ جواہر پاروں اور قیمتی لعل ویاقوت سے ہرگز کم نہیں، پر حکمت اور بصیرت افروز مضامین کا خزینہ ہیں، جن کو اسلوب قرآنی کے متعلق اساسی اصول قرار دیا جانا زیبا اور لائق ہے۔ میں ان منتشر فرمودات کو ذیل میں ترتیب وار بیان کرتا ہوں اور ساتھ ساتھ بغرض وضاحت کچھ تشریح بھی قلمبند کرتا ہوں۔ و باللہ التوفیق والعصمة.

قرآنی طرز بیان اور عام طرز تالیف

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم کی گفتگو فقہی فتاویٰ کی کتب کی مانند نہیں، جس میں جزئیات در جزئیات کو جا بجا بیان کیا گیا ہے، نہ ہی ان جزئیات کو شمار کردہ مواد ومضامین پر تقسیم کیا گیا ہے، جیسا کہ آجکل علماء کا اپنی مؤلفات میں طرز وطریق رواج پذیر ہے۔

قرآن کریم عام عربی گفتگو کے مطابق بعض مضامین کو بعض مضامین پر عطف کرتے ہوئے بیان کیے جاتا ہے، اسی بناء پر ایک ہی سیاق میں ذکر کردہ بالترتیب آیات کے عنوان وموضوع کے متعلق علمائے قرآن کے درمیان اختلاف رائے ہوا ہے، کبھی کبھی یہ بات پوشیدہ ہو جاتی ہے کہ دوسری آیت کا بھی موضوع وہی ہے جو پہلی آیت کا ہے یا پھر اس دوسری آیت کا موضوع اس سے عام ہے یا اس سے خاص ہے یا پھر ان دونوں آیات کے باہمی تعلق کی نوعیت دوسری ہے اور اس بحث کی اہمیت واضح ہے اور اس بحث کے متعلق ضرور اہتمام کیا جانا چاہیے۔

ایک ہی واقعہ کے اجزاء میں تقدیم وتاخیر

امام العصر حضرت کشمیریؒ فرمایا کرتے تھے کہ: قرآن کریم کا اساسی موضوع علم تاریخ

کا استیعاب اور حوادث وسوانح کا تمام جزئیات کے ساتھ بیان کرنا ہرگز نہیں ہے، اسی بناء پر قرآن کہیں ایجاز واختصار سے کام لیتا ہے اور کہیں تطویل وتفصیل کو بروئے کار لاتا ہے۔ اسی طرح ایک واقعہ کے اجزاء میں کہیں تقدیم اور کہیں تاخیر ہوتی ہے، یہ تقدیم وتاخیر کا اختلاف امتیاز وافتراق کی لطیف حکمتوں اور دقیق اسرار کا حامل ہوتا ہے، ان معارف وخزائن کے ادراک سے بلند فکر خرد ودانش بھی کبھی عاجز وقاصر ہورہتے ہیں، قرآن کریم کے اس طرز وانداز میں کئی خصوصیات ہیں جو بوجہ اپنی دقت ولطافت کے دلجمعی اور طبیعت کی جاگزینی کی محتاج ہوا کرتی ہیں۔ معارف کی معرفت کے لئے آپ سیوطی کی ''الاتقان'' کی متعدد انواع کی طرف مراجعت کرسکتے ہیں۔

مشکلات قرآن، مشکلات حدیث سے بڑھ کر ہیں

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ: مشکلات القرآن مشکلات الحدیث سے زیادہ ہیں، مگر صد افسوس کہ علمائے امت نے قرآن کریم کی اس قدر خدمت نہیں فرمائی جتنی خدمت حدیث کے متعلقہ علوم کی فرمائی ہے، حالانکہ قرآن کا اہتمام حدیث سے کہیں زیادہ ہونا چاہئے تھا، حضرت کشمیریؒ کا یہ ارشاد بھی ماقبل میں گذر چکا ہے کہ قرآن کی مطبوعہ تفاسیر کے ذخیرہ میں کوئی تفسیر مرتبہ ووقعت میں ابن حجرؒ کی صحیح بخاری کی شرح ''فتح الباری'' کے مانند نہیں ہے اور جیسا کہ حدیث کی تشریح وتوضیح کے متعلق اس کی نمایاں خصوصیات ہیں اور اس میں مخفی لطائف ونکات کا بیان ہے، ایسی کوئی تفسیر قرآن کی نہیں جس میں ایسی نمایاں خصوصیات اور قرآن کے مخفی لطائف کا اس طرح بیان ہو۔

قرآنی تعبیر میں احاطہ واستیعاب کا خاص مقصد

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ: قرآن کریم کے نظم میں الفاظ کا استیفاء واستیعاب محض عبارت کے استیفاء کے لئے نہیں ہوا کرتا، بلکہ جب غرض مطلوب کا بیان بھی ہوچکا ہو اور مقام ومحل کا مقصود بھی بخوبی سمجھ لیا گیا ہو اور پھر الفاظ میں استیفاء کے پیش نظر تطویل آجائے تو یہ تطویل وتفصیل خاص مقصد کے حصول کے لئے ہوا کرتی ہے، کبھی کبھار قرآن کریم ایسے لفظ کو چھوڑتا ہے جس کی طرف ظاہراً عبارت کا احتیاج محسوس ہوتا ہے، لیکن مقصود ومطلوب واضح ہوجانے کے بعد

اس ظاہری احتیاج سے استغناء واضح ہوجاتا ہے۔

کلمات کے انتخاب میں قرآن کریم کا طرز

حضرتؒ نے فرمایا: جس شخص کو اللہ رب العزت نے قرآن کریم کے متعلق اعلیٰ مذاق اور علوم عربیہ کا کچھ حصہ بخشا ہو وہ جان لے گا کہ قرآن کریم اپنی گفتگو میں عام عرف میں رائج حقیر و مستعمل الفاظ کے بجائے ایک نمایاں طرز و طریق کے مطابق عمدہ کلمات کا چناؤ کرتا ہے، جس میں قرآن کریم وضع اصلی کے ساتھ ساتھ معنی موضوع لہ کی حقیقت کی بھی نمایاں رعایت کرتا ہے، اسی بناء پر قرآن کریم میں کسی بھی کلمہ کی تغییر و تبدیلی ناممکن ہے، اس لئے کہ انسانی عقل کی بساط اس قدر وسیع نہیں کہ وہ تمام اشیاء کی مکمل حقیقت جاننے اور موقع و مقام کے مناسب ایسے کلمات سے تعبیر پیش کرنے پر قادر ہو جو اس مقام کا مکمل حق ادا کر سکے۔

تکرار مضامین وقصص کی حکمت

حضرتؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ: قرآن کریم میں مضامین کا تکرار کبھی تو قدر مشترک اور کبھی قدر مغایر کے طرز پر واقع ہوا ہے، محض تکرار مضمون بہت ہی کم ہوا ہے اور واقعۃً قدر مشترک کے پیش نظر تکرار مضامین کی ہم کو حاجت بھی ہوا کرتی ہے، اس لئے کہ اگر اس قدر مشترک کے ساتھ مضامین کا تکرار زیادہ واقع نہ ہوا ہوتا تو قرآن کی قرآن ہی سے تفسیر بیان کرنا آسان نہ ہوتا اور احکام و فوائد کا اس کثیر مقدار میں اخذ و استنباط میسر نہ آسکتا۔ اسی طرح حضرت شیخ فرماتے ہیں: اس کلام سے میرا مقصد یہ ہے کہ ایک لفظ سے حکم کا استنباط کیا جاتا ہے اور اسی مکرر مضمون میں دوسرے لفظ سے دیگر حکم اسی مشترک موضوع کے متعلق مستفاد ہوتا ہے۔ جس کی بناء پر گویا کہ متن اور شرح دونوں حاصل ہو جاتے ہیں اور اگر اس طرح تکرار نہ لایا جاتا تو صرف متن محض باقی رہ جاتا پھر اسی تکرار مضامین سے مطلوبہ غرض و مقصد کے قابل اہتمام ہونے کو بھی بیان کیا جاتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ: قرآن کریم میں نماز کا تذکرہ نوسو (۹۰۰) سے زائد مرتبہ فرمایا گیا ہے۔

قرآن کریم کی آیات کا باہمی نظم ونسق

حضرتؒ فرماتے ہیں: قرآن کریم کے بعض مقامات پر آیات میں جو بظاہر عدم ارتباط

وعدم مناسبت نظر آتی ہے، یہ بھی ایک خاص علمی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ: جن امور کے متعلق ہمارے عقول ومدارک مناسبت کے اظہار وبیان سے قاصر ہیں، ان امور میں بھی ارتباط ومناسبت ضرور ہے جن کا احاطہ سوائے علام الغیوب کے اور کوئی نہیں کرسکتا، اس کی نظیر یہ ہے کہ ایک فقیہ مجتہد کسی فقہی باب کے متعلق مسلسل ومتواتر ایسے احکام ذکر کرتا جاتا ہے، جن احکام کے متعلق مناسبت سمجھنے میں ہماری عقول کامیاب نہیں ہوتی ہیں، یہ جزئیات ہماری نظر میں تو منتشر اور پراگندہ ہوا کرتی ہیں لیکن یہی جزئیات اس فقیہ مجتہد کی نظر میں ایک قاعدہ اور اصل کے تحت باقاعدہ منضبط ہوتی ہیں۔

حضرتؒ فرماتے ہیں: اس مناسبت وتعلق کے پہچاننے میں سب سے زیادہ اہتمام ایک آیت کے اپنے اجزاء میں باہمی نظم وضبط پہچاننے میں کیا جانا چاہئے، بسا اوقات ایک آیت کے اپنے اجزاء باہم مرتبط نہیں ہوا کرتے، چنانچہ بہت سی آیات میں باہمی ارتباط کی جستجو کے بجائے ایک آیت کے اجزاء کے آپس میں نظم وربط کو تلاش کرنا زیادہ قابل التفات ہونا چاہئے۔

اس کی مثال میں باری تعالیٰ کا یہ فرمان ملاحظہ کیجئے:

﴿فاعتزلوا النساء فی المحیض و لا تقربوهنّ حتی یطهرن فإذا تطهّرن فآتوهنّ من حیث أمرکم الله﴾

اب اس آیت مبارکہ میں "فإذا تطهرن" میں تشدید ہاء کی قراءت کے مطابق "حتی یطهرن" کی تخفیف ہاء کے ساتھ قراءت کا باہمی ربط کافی مشکل ومجمل معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ بات تو واضح ہے کہ "طهور" خون کے محض منقطع ہوجانے سے عبارت ہے، جبکہ "تطهر" سے انقطاع دم کے بعد غسل طہارت کا قصد کیا گیا ہے، چنانچہ تشدید کی قراءت تخفیف کی قراءت کے ساتھ کیسے موافق ٹھہرے گی؟ بلکہ قرآنی نظم سے گویا اس طرح کا معنی مستفاد ہوگا کہ آپ یوں کہیں: فلاں شخص کو کچھ نہ دینا یہاں تک کے وہ گھر میں داخل نہ ہوجائے، پس جب مسجد میں داخل ہوجائے تو اس کو دے دینا۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اسی آیت کے پیش نظر یہ مسلک اختیار فرمایا ہے کہ: اکثر مدت

حیض سے انقطاع کے بعد بغیر غسل کے بیوی سے قربت جائز ہے۔ اب اس صورت میں جبکہ ''طہر'' سے فقط انقطاع دم حیض مراد لیا گیا ہے، باوجودیکہ اس طہر میں انقطاع اور اس کے بعد غسل طہارت کا معنی بھی محتمل ہے۔ اسی طرح تطہر سے انقطاع حیض کے بعد غسل طہارت کر لینے کا بیان مراد ہے، باوجودیکہ یہاں دیگر وجوہ کا بھی احتمال تھا کہ انقطاع دم کے بعد موضع نجاست دم دھولیا ہو یا انقطاع حیض کے بعد وضوء کی طہارت حاصل کر لی ہو، ایسی صورت میں یہ جواب دیا جائے گا کہ یہاں آیت مبارکہ میں حکم قربت و جماع کے دو مراتب بیان فرمائے گئے ہیں:

پہلا مرتبہ: نفس جواز اور رخصت وسہولت کا ہے۔

اور دوسرا مرتبہ: عزیمت کا اور احوط موقف کا اور احوط طریق ہی اولیٰ ہوا کرتا ہے، اب مرتبہ اول کی طرف ''تخفیف طہر'' کی قراءت سے اشارہ فرمایا اور مرتبہ دوم کو ''فإذا تطهرن'' سے ضمنی طور پر بیان فرمایا گیا۔ جس میں اولیٰ واعلیٰ اور شارع تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے عین مطابق صریح اجازت اور واضح وشافی بیان کی صورت میں بتلا دیا گیا ہے، لیکن بہرحال انقطاع کا تیقن چونکہ اکثر مدت حیض پر انقطاع سے حاصل ہوگا، اس لئے اس کی بھی رعایت حضرت امام اعظمؒ نے بجا طور پر فرمائی۔ یہ بسیط اور گرانمایہ نکتہ ایسی صورت میں ہرگز حاصل نہ ہوسکتا تھا جب دونوں قراءتیں ایک ہی طرح ہوتیں یا ان دونوں کے اختلاف کے باوجود ان کے مفاہیم ایک ہی طرح لئے جاتے۔

راقم عرض گذار ہے کہ: سید مفتی آلوسی بغدادیؒ کی روح المعانی میں اس اختلاف قراءت کے متعلق انتہائی جامع ومانع کلام ہے، چنانچہ اس کی مراجعت فائدہ مند ثابت ہوگی۔ حضرت آلوسیؒ نے کتاب ''الکشف'' سے نقل کرتے ہوئے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ: تشدید کی قراءت' قربت جماع کی غایت ناقصہ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور حرف ''حتی'' جب افعال میں استعمال ہوتا ہے تو وہ ''إلی'' کی نظیر ہوا کرتا ہے، اس لئے کہ ''إلی'' مابعد کے ماقبل میں دخول واندراج کا مقتضی نہیں ہوا کرتا، چنانچہ ''حتی'' بھی افعال میں داخل ہوکر مابعد کے ماقبل میں دخول کا تقاضہ نہیں کرے گا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ غایت کاملہ وہ ہوا کرتی ہے جو اپنے جمیع اجزاء کے ساتھ غایت بنے اور وہ غایت مغیا سے قطعاً خارج ہو اور ناقصہ وہ غایت ہوا کرتی ہے جو اپنے آخر مفہوم کے اعتبار سے غایت بنے، اسماء پر داخل ہونے والا "حتی" غایت نہ ہونے کی صورت میں تقاضہ کرتا ہے کہ مابعد غایت مغیا میں داخل ہو اور افعال پر داخل ہونے والا "حتی"، "إلی" کی مانند یہ تقاضہ نہیں کرتا کہ مابعد غایت ماقبل کا جزء ہو، چنانچہ انقطاع دم حیض حرمت کے لئے غایت ہے اپنے ثانوی مفہوم کے اعتبار سے جس کی بناء پر وقت انقطاع اس حرمت کی غایت میں داخل ہوگا اور "غسل طہارت" باعتبار اول مفہوم کے اس حرمت کی غایت ہوگی، اب "حتی یطھرن" اور "فإذا تطھرن" یعنی تخفیف وتشدید کہ یکجا جمع ہو جانے کی بناء پر قراءت کے اختلاف کے باوجود تعارض باقی نہ رہا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دو غایات لاکر اس طرف اشارہ مقصود ہو کہ قربت جماع کے مراتب حرمت میں تفاوت ہے، اس لئے کہ یہ حرمت بنسبت انقطاع حیض کے بعد کے انقطاع دم سے پہلے زیادہ شدید تر ہے۔

تنبیہ

یہ جواب جو ماقبل میں میں نے ذکر کیا یہ حضرت شیخ کے درس کے دوران دیئے گئے جواب کی ایک جانب ہے، پھر میں نے شیخ کی "مشکلات القرآن" کی طرف رجوع کیا کہ اس میں حضرتؒ کیا تحریر فرماتے ہیں۔ چنانچہ وہاں میں نے حضرتؒ کے کلام میں وہ دقت نظر اور غوض فکر پائی جو جواب کے متعلق مختلف اطراف کو اور اس طرف کو بھی جو میں نے بیان کر دی ہے، شامل تھی اور اختلاف قراءت کے متعلق تمام پیچیدہ اغراض کا مکمل شافی وکافی جواب وہاں تحریر فرما دیا ہے۔ اسی طرح حنفیہ پر وارد ہونے والے اشکالات کا بھی بخوبی جواب ذکر کر دیا ہے جس سے قلب کو سکون واطمینان حاصل ہوتا ہے اور علمی پیاس واقعی بجھ جاتی ہے، چنانچہ ان تمام تفصیلات کی مراجعت کر لینا نہایت سودمند ہوگا۔ یہاں پر بھی میں چند باتیں ذکر کر دیتا ہوں تا کہ یہاں بھی یہ فائدہ اور مبحث ناقص نہ رہے، بہرحال جواب کے سلسلہ میں میں نے جس قدر وضاحت کی ہے، میرے خیال میں حضرتؒ نے اس وضاحت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

''علمائے احناف کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں اختلاف قراءت کو وجوب اور استحباب کے عموم بتلانے پر محمول کریں اس طور پر کہ قرآن کی غرض شاید یہ ہے کہ: چونکہ ''تطھر'' یہ بندہ کا اختیاری فعل ہے جس کو وہ ادا کرسکتا ہے، اس بناء پر یہاں دو مراتب ہیں: پہلا مرتبہ وجوب کا اور دوسرا مرتبہ استحباب کا، ریوں کہا جائے گا کہ اقل مدت میں انقطاع دم ہونے کی صورت میں قربت جماع کے لئے غسل واجب ہے اور اکثر مدت پر انقطاع دم کی صورت میں مستحب ہے''۔

حضرت کشمیریؒ کی یہ بحث میری ذکر کردہ تحریر کے قریب معنی ومقصد رکھتی ہے، ہاں! معمولی تغایر بہر حال ہے کہ وہاں پر اقل واکثر کی تفصیل نہیں ہے۔ ہاں اگر وہاں بھی اقل واکثر کو انقطاع دم کے تیقن کے ساتھ مقید کرلیں تو اکثر مدت میں بغیر غسل کے تیقن انقطاع ہوجاتا ہے، اس لئے غسل واجب نہ ہوگا اور اقل مدت میں غسل کے ساتھ تیقن انقطاع ہوتا ہے، لہذا غسل واجب ہوگا۔ اب دونوں مباحث کا مقصد ومطلب ایک ہوگیا۔ پھر حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ: ''فإذا تطھرن'' یہ ''حتی یطھرن'' پر تفریع اور اس پر مرتب نہیں ہے اس لئے کہ اس تفریع وترتب کو تسلیم کرنے کی صورت میں ہی نظم قرآنی میں عدم ربط ومناسبت کا اشکال ہوگا، اسی لئے اس قطعہ ''فإذا تطھرن'' کو ''فاعتزلوا النساء'' پر عطف شمار کریں گے۔

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ: پھر ''تطھر'' سے مراد پانی کے ساتھ موضع نجاست کو دھونا یا وضو کرنا یا غسل طہارت کرنا مراد نہیں، جیسا کہ بعض علماء کی رائے ہے بلکہ مراد طہارت کا عمل کرنا ہے اور ''باب تفعل'' کے سترہ خاصیات میں سے ایک خاصیت یہ بھی ہے جیسا کہ ''البحر المحیط'' جلد نمبر ۱ صفحہ ۱۶۵ پر بھی بیان کیا گیا ہے۔

حضرتؒ کی اس عبارت کا مقصد یہ ہے کہ ''تطھر'' کے جو تین معنی بیان کئے گئے ہیں یہ اس کے حقیقی معانی نہیں ہیں بلکہ اس کا حقیقی معنی ''عمل في الطھارۃ'' (طہارت سے متعلق کام کرنا) ہے اور یہ فعل اختیاری ہے اور یہ ایسا عام معنی ہے جو کلی کے افراد وجزئیات کو شامل ہونے کے مانند ان تمام معانی کو شامل ہے اور یہ معنی تفعل کی سترہ خاصیات میں سے ایک خاصیت ہے،

جیسا کہ صاحب "البحر المحیط" نے باری جل شانہ کے اس ارشاد گرامی "فتلقی آدم من ربه" الخ کے ذیل میں ذکر فرمائے ہیں۔ پھر حضرتؒ فرماتے ہیں کہ: جب ترکیبی ومعنوی اعتبار سے آیت کا معاملہ اس طرح واضح ہوا تو جان لیجئے کہ آیت مبارکہ میں دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں: فعل اختیاری، جو عمل فی الطہارۃ ہے، اور دوسری بات: فعل غیر اختیاری جو انقطاع دم سے حاصل ہونے والا طہر ہے۔

اس شرح وبسط کے پیش نظر "بدایة المجتهد" میں جو عدم ربط ومناسبت کا اشکال علمائے احناف کے موقف پر اٹھایا گیا ہے وہ بھی وارد نہ ہوگا اور کلام کی صورت اب یوں ہو جائے گی کہ: ''تم اس فلاں شخص کو اس وقت تک نہ دینا جب تک کہ وہ گھر کے قریب نہ آ جائے، اچھا جب داخل ہو جائے تو دے دینا'' یا اس طرح ہو جائے گی کہ: اس کو درہم مت دینا تا آنکہ وہ گھر میں داخل ہو جائے، پس جب داخل ہو جائے تو دے دینا، اس قیمتی بحث کو ضرور محفوظ کر لیجئے، واللہ اعلم بالصواب۔

قرآن کریم میں وقوع نسخ اور اس کی تحقیق

علمائے کرام کا آیات واجزاء منسوخہ کی تعداد کے بارے میں باہمی اختلاف رہا ہے، متقدمین علماء نے نسخ کے بہت سے افراد شمار کئے ہیں، اس لئے کہ ان کے ہاں نسخ کے مفہوم میں بہت وسعت تھی، یہ حضرات عام کی تخصیص، خاص کی تعمیم، مطلق کی تقیید اور مقید کے اطلاق، استثناء کے وقوع وعدم وقوع، حکم کے کلیتاً منسوخ ہو جانے اور اس کی علت کے بے اثر ہو جانے سب پر نسخ کا اطلاق کیا کرتے تھے، جبکہ ان کے برعکس متاخرین علماء کی یہ سعی وکوشش رہی کہ نسخ کے باب میں کمی کی جائے، حتی کہ شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے تو اس قدر تقلیل کی صرف بیس مواضع میں نسخ ثابت کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ جو ہند کی نابغۂ روزگار شخصیات میں سے ہیں اور خاص وعام میں حجت شمار کئے جاتے ہیں انہوں نے تو تقلیل میں اس قدر سعی کی ہے اپنی کتاب ''الفوز الکبیر'' میں صرف پانچ مواضع کو منسوخ شمار کیا ہے۔ ہمارے حضرت شیخ کشمیریؒ فرمایا کرتے تھے: ''قرآن متلو میں کوئی بھی ایسی آیت نہیں جو حکماً منسوخ ہونے کے ساتھ ایسی ہو گئی ہو کہ اس سے کسی جہت

وطریق سے کوئی بھی حکم مستفاد نہ ہو یا اس کا کوئی عملی محمل نہ بن سکے، بلکہ بیشک یہ منسوخ آیت بھی کسی نا کسی مرتبہ میں اور کسی نا کسی حالت میں اور کسی نا کسی زمانے میں حکم شرعی کا فائدہ دیتی ہے''۔

حضرت شیخ کی اس تحقیق سے ایک بہت اہم بات مستفاد ہوتی ہے اگر آپ اس کے اہل ہیں تو اس ''امر مہم'' کے استفادے کی لذت کو چکھ لیجئے، اس لئے کہ بغیر چکھے انسان کسی شئ کی عمدگی اور نا عمدگی کا تعین نہیں کر سکتا، اور یہ محاورہ تو کافی مشہور ہے کہ جو شخص چکھتا رہتا ہے وہ اس چکھی چیز کے متعلق حکمت وبصیرت بھی اسی قدر حاصل کر لیتا ہے۔ واللہ الموفق والہادی الی الحق۔

قرآن کریم میں کوئی حرف زائد نہیں ہے

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ: ''قرآن کریم میں کوئی حرف اس طرح زائد ہو کہ جس کا معنی ومطلب کی منظر نگاری میں کوئی اثر نہ ہو، ایسا ممکن ہی نہیں ہے''۔ راقم کہتا ہے کہ: ابن الاثیرؒ ''المثل السائر'' ص:۱۴۵ پر باری جل شانہ کے ارشاد گرامی : ''فبما رحمة من الله لنت لهم'' کے ذیل میں یوں تحریر فرماتے ہیں کہ:

لفظ ''ما'' اس آیت مذکورہ میں زائد نہیں ہے' بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کو عطا کردہ اس نعمت کی تفخیم وتعظیم بیان کرنے کے واسطے ہے جس کے ذریعے رسول اللہ ﷺ نرم گفتار ونرم گستر ہوئے ہیں' اور اس طرح کی زیادتی کو محض فصاحت ہی کہا جا سکتا ہے اگر لفظ ''ما'' سے یہ کلام خالی ہو تو اس قدر تفخیم وتعظیم کا معنی حاصل نہ ہوگا۔ اسی طرح کی زیادتی زباء کے کلام میں بھی واقع ہوئی ہے: ''اما انه ليس من عوز المواس ولا من قلة الاواس ولكنه شيمة ما اناس'' معنی کلام ولكنه شيمة اناس سے بھی مکمل ہو سکتا تھا لیکن یہاں لفظ ''ما'' اس صاحب خصلت کی فخامت وعظمت کو نمایاں اجاگر کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ اگر ''ما'' اس کلام سے حذف کر دیا جائے تو اس کلام میں وہ فخامت وجزالت باقی نہیں رہے گی، اس فخامت وعظمت کو اس کے اہل علمائے فصاحت وبلاغت ہی پہچان سکتے ہیں، نحویین کا یہ کہنا کہ: ''یہ حرف ''ما'' لفظ زائد ہے ان کی مراد یہ ہوا کرتی ہے کہ یہ حرف زائد ماقبل کو عمل کرنے سے مانع نہیں ہے، جیسا کہ ایک دوسری جگہ پر وہ اس ''ما'' کو ''كافة'' بھی کہتے ہیں یعنی یہ ما ''حرف عامل'' کو

اس کے عمل سے روک دیتی ہے، اسی طرح اس آیت "فبما رحمة من الله" میں "ما" نے باء جارہ کے عمل کو موقوف نہیں کیا ہے، انتہی ملخصاً۔

علامہ رافعیؒ اعجاز القرآن ص:۳۰۵ طبع ثالث میں تحریر فرماتے ہیں: وہ کلمات جن کے متعلق گمان کیا جاتا ہے کہ وہ زائد ہیں اور قرآن میں واقع ہوئے ہیں، جیسا کہ نحویین حضرات باری جل شانہ کے اس فرمان گرامی "فبما رحمة من الله" اور اس ارشاد اقدس "فلما ان جاء البشير" میں "ما" پہلی مثال میں اور "ان" دوسری مثال میں زائد ہیں یعنی اعراب کے اعتبار سے' تو ایک بے بصیرت شخص یہ گمان کر بیٹھتا ہے کہ جس طرح یہ اعراباً وترکیباً زائد واقع ہیں تو معنیً ومقصد پر بھی نظم قرآن میں زائد واقع ہوئے ہیں، حالانکہ اس زیادتی میں تصویر کشی کا وہ رنگ مضمر ہوا کرتا ہے کہ اگر اس زیادتی کو حذف کر دیا جائے تو کلام کا حسن اور اس کی جاذبیت جاتی رہتی ہے۔ اب پہلی آیت میں آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی اپنی قوم کے متعلق نرم خوئی کی منظر کشی کی جارہی ہے اور یہ بیان کیا جارہا ہے کہ یہ نرم خوئی خداوند برتر وبالا کی نعمت ہے، اس بیان میں نرم خوئی کے معنی کی تاکید اور اس کی فخامت وعظمت کے بیان کو لفظ "ما" کے ذریعے لفظی وصف لاکر مزید بڑھایا جارہا ہے اور اس نکتہ سے بڑھ کر یہ ملاحظہ کیجئے کہ اس "ما" کی ادائیگی سے جو اللہ کریم کے لطف وعنایت کا احساس ہوتا ہے وہ احساس' سیاق وسباق کی بلاغت کی رعایت رکھتے ہوئے اس لفظ "ما" کے بغیر ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا ہے۔

پھر یہاں آیت مذکورہ میں باء جارہ اور اس کے مجرور جو لفظ "رحمة" ہے کے مابین اس فصل کی وجہ سے نفس معنی ومقصد میں تدبر کی طرف التفات ہوتا ہے اور رحمت خداوندی کی بلندی کے لطیفہ پر فکر ونظر کو متنبہ کرتا ہے، یہ تمام تر شعور واحساس ایک فطری امر ہے جو آیت بالا کی بلاغت میں جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا واضح ہوجاتا ہے۔ دوسری آیت "فلما ان جاء البشير" میں حرف "ان" زائد کے ذریعے اس فصل کی منظر کشی مقصود ہے جو فصل وتاخر یوسف علیہ السلام کی قمیص کے ذریعے خوشخبری سنانے اور یوسف علیہ السلام اور ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے درمیان بوجہ دوری مسافت کے اس خوشخبری سنانے والے کے آنے اور

پہنچنے کے درمیان واقع ہوا ہے اس طور پر کہ گویا حضرت یعقوب علیہ السلام اسی "بشیر" کے منتظر ہیں اور اسی خبر کے سننے کے لئے مضطرب ہیں، اس اضطراب وقلق کو مؤکد کرنے اور خوشخبری سنانے والے کے آنے پر خوشی وسرور کی کیفیت کی توصیف کلمہ فاصل "ان" کے نون کا غنہ ہے۔ اسی طرز تاویل پر جہاں بھی یہ کہا جائے گا اور گمان کیا جائے گا کہ یہ حرف زائد ہے، وہاں اسی قسم کے زائد معانی ومقاصد ہوا کرتے ہیں، اس لئے کہ محض زیادتی کا پایا جانا اور محض زیادتی بے معنیٰ کا اقرار واعتراف کرنا قرآن کریم میں نقص وعیب کا موجب ہے، جبکہ قرآن کریم ہر نقص وعیب سے برتر وبالا ہے۔ انتہی۔

قاعدہ "العبرۃ لعموم اللفظ" اپنے عموم پر نہیں ہے

حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ: علمائے اصول میں مشہور یہ قاعدہ واصل کہ: "العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب" (اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سبب کے خصوص کا) یہ قاعدہ اپنے عموم پر نہیں ہے، اس قاعدہ کے متعلق سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ متکلم کی غرض ومقصد کی جستجو کی جائے اور اس کو آشکارا کیا جائے، یہ لازم نہیں کہ تمام احوال میں اس کے کلام کا منطوق اس کی غرض ومقصد کے عین موافق ومطابق ہوگا، بلکہ کبھی منطوق کلام متکلم کی غرض سے اخص بھی ہوتا ہے اور کبھی اعم بھی ہوتا ہے اور گاہ گاہ مساوی بھی ہوتا ہے۔ اب محض الفاظ کے عموم کا اعتبار اس وقت ہوگا جبکہ شارع کی غرض کا تعین نہ ہوجائے اور شارع کے مطلوب ومراد معنی پر کوئی واضح دلیل نہ قائم ہوجائے، اس قاعدہ کا عموم لیا بھی کس طرح جاسکتا ہے، دیکھئے باری جل شانہ کا ارشاد ہے: "فاقرؤوا ما تیسر منه" کیا اس آیت سے مراد یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کی قراءت کئے بغیر صرف ایک آیت پر اکتفاء کرلینا نمازی کے لئے وظیفہ صلاۃ کو ادا کرلینے کے لئے کافی ہوگا؟ اور کیا ایک شخص نماز میں قرآن کی ایک آیت کے تلاوت کرلینے سے قرآن کے حکم کو پورا کرنے والا شمار ہوگا، جب تک کہ وہ ان امور کی رعایت نہ رکھے جو ہمیں خارج سے معلوم ہوئے ہیں؟ اور کیا قرآن کے حکم پر اس قدر عمل کافی ہوگا کہ نماز سورہ فاتحہ اور دیگر واجبات قراءت کی تعیین کے بغیر ادا کرلی جائے؟ پس جب یہ بات ظاہر ہوئی تو بظاہر یوں معلوم ہوا کہ قرآن کریم ہمیں اس چیز کا حکم

کر رہا ہے جو شریعت میں معہود نہیں بلکہ شریعت میں اس کے علاوہ حکم دیا گیا ہے اور ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا کہ قرآن کچھ اور حکم بیان کرے اور شریعت میں کچھ اور حکم جاری ہو۔ جو شخص اس طرح کا خیال فاسد رکھے گا وہ طریق مستقیم سے بھٹکا ہوا اور مقصود شریعت سے بے بہرہ ہوگا، بلکہ قرآن کریم کا مقصد اس امر قراءات سے' قراءت میں مریضوں اور مجاہدین کا خیال رکھتے ہوئے تخفیف برتنے کا بیان مقصود ہے اور ان خواص حضرات کے پیش نظر چونکہ قیام اللیل کا حکم مشقت و تکلیف سے بھر پور تھا، اس لئے باری تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے تخفیف مرحمت فرمادی۔

جہاں تک سورہ فاتحہ کی رکنیت اور اس کے وجوب کا مسئلہ ہے تو یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے جو ایک دوسری اصل جس کا عنوان ''الزیادة علی القاطع بالظني کأخبار الآحاد'' (یعنی قرآن کریم کے قطعی حکم پر ظنی ماخذ مثلاً خبر واحد سے زیادتی کرنا جائز ہے یا نہیں؟) پر متفرع ہے، چنانچہ حنفیہ کے نزدیک مرتبہ ظنیت میں یہ زیادتی روا ہے یعنی قطعی حکم پر زائد ہونے والا یہ حکم امر ظنی بھی ہوگا، اس کو قطعی کے حکم میں شمار نہ کیا جائے گا، اور اس پر عمل بہرحال واجب ہوگا اور شافعیہ کے نزدیک یہ زیادتی مرتبہ قطعیت میں ہوگی۔ حنفیہ نے قطعیت وظنیت کے مراتب میں فرق و امتیاز کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر ایک کو اس کے مستحق مرتبہ بحسن و خوبی عطا کیا ہے۔ حنفیہ کے ہاں یہ عمومی تعبیر کہ: ''خبر واحد کے ذریعے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں ہے'' یہ تعبیر کچھ نامناسب سی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ احناف کے ہاں بھی سورہ فاتحہ کے بغیر نماز ادا کرنے والے کو اگرچہ قرآن کریم کے قطعی حکم کی بجا آوری کرنے والا شمار کیا جائے گا لیکن یہ شخص بہرحال گناہ گار ضرور ٹھہرے گا اور اگر یہ ترک فاتحہ اس نے عمداً و بالقصد کی ہے تو اس پر نماز کا اعادہ بھی واجب ہوگا، جب کہ عمومی تعبیر کے پیش نظر اس زیادتی کو بھی' قرآن کریم کے بیان کردہ حکم کے مصداق میں ایک مکروہ زیادتی شمار کرنا لازم ہوگا، حالانکہ یہ کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ ٹھیک ہے کہ امر سے مراد کے اخذ کرنے میں آمر کی غرض مدنظر رکھی جائے لیکن ان دو مراتب منطوق قطعی اور معہود ظنی کے تفاوت کا خیال بھی از بس ضروری ہے، قطعیات میں اجمال کئی وجوہات: مثل وسعت وسہولت اور حکم کی بجا آوری میں آسانی پیدا کرنے کے لئے کی بناء پر ہوتا ہے، اس اصل کو محفوظ کر لینا

چاہئے۔ حضرت شیخ کے کلام بالالہام سے میں یہی سمجھا ہوں۔

راقم نے امام حافظ علامہ ابن دقیق العیدؒ کی کتاب "احکام الاحکام" میں بھی ایک مضمون دیکھا ہے جو ہمارے حضرت شیخ کے بیان کردہ فائدے کی مانند نکات پر مشتمل ہے۔ ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں: یہ قاعدہ کافی مشہور ہے کہ "العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب" (اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سبب کی خصوصیت کا) لیکن ایسے امر میں جہاں سیاق وسباق اور دیگر خارجی قرائن عموم کی تخصیص اور متکلم کی واضح مراد تخصیص پر دلالت کررہے ہوں اور ایسے امر میں جو محض سبب پر وارد ہوا ہو کے مابین فرق وامتیاز ملحوظ رکھنا بھی نہایت ضروری ہے، ان ہر دو قسم کے امر کو ایک ہی طرز کا نہ سمجھ لینا چاہئے، اس لئے کہ مطلق عام کا کسی سبب کے تحت واقع ہونا یہ اس سبب کے ساتھ اس عام کی تخصیص کا متقاضی نہیں ہوتا۔ مثلاً باری جل شانہ کا یہ ارشاد: "والسارق والسارقة فاقطعوا أيديهما" حضرت صفوانؓ کے چادر چوری ہوجانے کے سبب نازل ہوا لیکن بدیہی اور اجماعی طور پر اس عموی قاعدہ کی اسی خاص سبب کے ساتھ تخصیص کا کوئی تقاضا ومطالبہ نہیں ہے، البتہ سیاق وسباق متکلم کی اپنے کلام سے غرض ومقصد پر دلالت کیا کرتے ہیں اور یہی قرائن مجملات کی توضیح اور مختلف احتمالات کے تعین کی راہ ہموار کرتے ہیں اور ان کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ [احکام الاحکام]

"حروف سبعہ" کے متعلق تحقیقی کلام

علامہ ابوعبید فرماتے ہیں کہ: ان دو ابواب گذشتہ میں ہم نے جو حروف ذکر کئے ہیں وہ روائد کہلاتے ہیں، علمائے قراءت نے ان حروف کو اس حیثیت سے نقل اور روایت نہیں فرمایا کہ یہ حروف بھی اسی حرف کی مانند ہیں جو قرآن کریم کے ان دوگتوں کے درمیان ہے اور اسی بناء پر نماز میں قرآن اسی حرف پر پڑھتے ہیں اور اس خاص معروف حرف قرآن کے منکر پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا جاتا ہے، یہ معروف اور خصوصی حرف وہی ہے جو اس مصحف امام میں ثبت ہے، جس کو حضرت عثمانؓ نے مہاجرین وانصار کے اجماع کے ساتھ نسخ وتالیف فرمایا اور اس حرف کے علاوہ دیگر حروف کو ساقط فرمایا، پھر امت کا اسی حرف خاص پر اجماع واتفاق ہوگیا اور کسی حرف میں کوئی

اختلاف باقی نہ رہا، اب اس قرآن کو جاہل عامی بھی ویسا ہی پہچانتا ہے جیسا کہ ایک عالم پہچانتا ہے اور صدیوں سے یہ قرآن کریم متوارث چلا آ رہا ہے، بچے مکتب و مدرسہ میں اسی قرآن کریم کو سیکھتے چلے آ رہے ہیں، یہ جمع ونسخ حضرت عثمانؓ کے مناقب میں سے ایک عظیم منقبت ہے، بعض گمراہ لوگوں نے اس تالیف پر رد وقدح بھی کیا ہے لیکن تمام لوگوں پر ان کی گمراہی اور بے راہ روی ظاہر ہوگئی ہے۔

جو مصحف حضرت عثمانؓ نے جمع فرمایا تھا وہی قرآن آج بھی مسلمانوں کے ہمراہ موجود ہے، اس کے منکر پر وہی حکم لگایا جائے گا جو کہ مرتد پر حکم لگایا جاتا ہے، اولاً اس کو توبہ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اور توبہ سے انکار کرنے پر اس کو قتل کر دیا جاتا ہے، اس کے علاوہ وہ حروف جن کا علم اسناد وروایات کی صورت میں منقول نہیں ہے، جنہیں خاص علماء ہی پہنچانتے ہیں، عوام الناس ان حروف سے واقف نہیں ہیں، ان حروف سے اہل علم کا مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ اس معروف قرآن کے حرف خاص کی تاویل وتفسیر میں ان حروف سے استشہادات ودلائل حاصل کریں اور ان کے ذریعے ان کو قرآن کریم کے معانی ومطالب اور وجوہ ومحتملات کے پہنچاننے میں راہنمائی ملے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کی قراءت: ''حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطی صلاۃ العصر'' حضرت ابن مسعودؓ کی قراءت: ''والسارقون والسارقات فاقطعوا أیمانھم'' حضرت ابی بن کعبؓ کی قراءت: ''الذین یؤلون من نسائھم تربص أربعة أشھر فإن فاءوافیھن'' ابن عباسؓ کی قراءت: ''لاجناح علیکم أن تبتغوا فضلا من ربکم فی مواسم الحج'' اسی طرح حضرت جابرؓ کی قراءت: ''فإنّ اللہ من بعد إکراھھن لھن غفور رحیم''۔

یہ مختلف قرأت اور اسی قسم کی دیگر کی قرأت قرآن کریم کے بیان کی ہی تفسیر کرتی ہیں، اسی قسم کی تفاسیر بعض تابعین کرامؒ سے بھی منقول ہیں اور اس طرح تفسیر بیان کرنا مستحسن شمار کیا گیا ہے، جب تابعینؒ کی تفاسیر پسندیدہ کہی گئی ہیں تو پھر جو تفاسیر کبار صحابہؓ سے منقول ہوں اور پھر یہ تفاسیر واقع بھی نفس قرأت کے درمیان ہوں وہ تو تفاسیر میں مزید بلند مرتبت اور قوی ترین

تفاسیر شمار کی جائیں گی۔ نیز تاویل وتفسیر کی درست پہچان کے لئے ان مختلف حروف سے مستنبط فوائد مزید برمحل اور بجا واقع ہوں گے اور یہ وہ علم ہے جس کی قدر ومنزلت عوام نہیں پہچان سکتے' خاص علمائے کرام ہی اس کے فضل کو پہچان سکتے ہیں، اس نوع کی تفاسیر کثرت سے ہیں اور اگر ان میں آپ غور وتدبر فرمائیں گے تو ایک زکی فطین شخص کے لئے اس میں وسیع بیش بہا علمی خزانہ پایا جاتا ہے۔ احرف سبعہ کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ صرف سات طریقوں پر پڑھا جاسکتا ہو، اس طرح تو قرآن میں کہیں موجود نہیں ہے بلکہ ہمارے نزدیک مطلب یہ ہے کہ قرآن مجموعی طور پر عرب کی مختلف لغات میں سے سات مختلف لغات پر نازل ہوا ہے جن میں ایک قبیلہ اپنی لغت پر قرآن کے حروف کی ادائیگی کرتا ہے، دوسرے قبیلے کے افراد اپنی لغت کے موافق جو پہلی لغت سے مختلف ہوا کرتی ہے اور تیسرے قبیلے والے ان دونوں لغات کے برخلاف اپنی لغت پر تلاوت کرتے ہیں اسی طرح یہ سات لغات پائی جاتی ہیں پھر بعض قبائل ان حروف کے متعلق زیادہ خوش نصیب ہوا کرتے ہیں اور ان کی لغت بنسبت دوسرے قبیلے کے زیادہ جاری ہوا کرتی ہے، یہ اختلاف لغات احادیث سمجھنے میں بھی معاون ہوتا ہے اور حاصل یہ کہ ان احرف سبعہ سے مراد یہی مختلف لغات عرب ہی ہیں۔ (ماخوذ از فضائل القرآن ابو عبید قلمی مخطوطہ)

فائدہ

یہ حدیث مبارک: "أنزل القرآن علی سبعة أحرف" حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبداللہؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت ہشام بن حکیمؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انسؓ وغیرہ کئی حضرات سے مروی ہے اور ان کے رواۃ صحابہؓ کی تعداد ۲۱ تک پہنچتی ہے اور علامہ ابو عبید القاسم بن سلامؒ کے مطابق یہ حدیث متواتر ہے اور ان روایات کے طرق کے سیاق وسباق سے واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ اس اختلاف قرأت سے غرض ومقصد آسانی اور سہولت پیدا کرنا ہے اور ان لوگوں کے لئے جو صرف اپنی لغت اور اپنے لہجے کے عادی ہوا کرتے ہیں ایک خاص لغت کی بندش وتنگی کو زائل کرنا ہے اور جب وہ اسی خاص حرف کے عادی ہوگئے اور خوب

مشق آور ہو گئے تو یہ ''احرف سبعہ'' منسوخ ہو گئے اور صرف ایک حرف' جو لغت قریش تھی باقی رہ گیا اور اصل نزول بھی اسی لغت قریش پر ہوا تھا اور بقیہ حروف پر ابتداء میں تخفیف اور سہل انگاری کے پیش نظر وہ اجازت مرحمت فرمائی گئی تھی بعد ازاں منسوخ ہو گئے۔

امام ثعلبؒ، علامہ ابو عبیدؒ، امام ازہریؒ اور دیگر علما قرآن کے نزدیک ان سے مراد لغات سبعہ ہیں۔ پھر ان ''لغات سبعہ'' کا اختلاف یا تو کلمات کے اختلاف پر مبنی ہے جیسا کہ: حتی اور عتی میں' الأثیم الفاجر میں' اقبل اور تعال میں' ھلم اور تعجل میں اور اسی طرح دیگر کلمات میں اختلاف مراد ہے یا مراد' حرکات واعراب کا اختلاف ہے یا پھر لہجوں اور بوقت تلاوت کیفیت نطق کا اختلاف ہے، جیسا کہ ادغام واظہار میں' تفخیم و ترقیق میں' تسہیل وتحقیق میں' امالہ اشمام وغیرہ میں۔ چنانچہ مشق اور عادت بن جانے کے بعد کلمات کا اختلاف تو باقی نہ رہا' البتہ حرکات لہجوں اور کیفیت نطق کا اختلاف بہر حال برقرار رہا لیکن اس قسم کے اختلاف کو حرف واحد مخصوص یا پھر رسم الخط میں داخل کر لینا ممکن تھا، چنانچہ حرف واحد ہی پر سب کا اجماع ہو گیا لیکن بہر حال ان احرف سبعہ سے قرأت سبعہ ہرگز مراد نہیں ہیں، علامہ ابو شامہؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، کیونکہ یہ قرأت تو خود نبی کریم ﷺ سے متواتر منقول ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گی (ان شاء اللہ) یہ بحث جو میں نے گذشتہ سطور میں بیان کی، ابن قتیبہؒ اور ابو عبیدؒ کی آراء کا مجموعی خلاصہ ہے، علامہ ابن قتیبہؒ نے اپنے مذہب کی تفصیل اپنی کتاب ''تأویل مشکل القرآن'' میں بیان کی ہے، ص:۲۶ سے اس بحث کی ابتداء ہوتی ہے وہیں مراجعت کی جا سکتی ہے۔

قرآن کریم کی آیات وسور کی ترتیب

قرآن کریم کی آیات مبارکہ کی ترتیب کے توقیفی ہونے پر امت کا اتفاق ہے، البتہ ترتیب سور کے متعلق اختلاف ہے' بعض حضرات جن میں ابو جعفر النحاس ابو بکر بن الانباری بھی شامل ہیں نیز علامہ بیہقی کا بھی یہی رجحان ہے، اس مسلک کی تائید بی روایات سے ہوتی ہے، اور مصحف عثمانیؓ پر تمام صحابہ کرام کا اجماع اگرچہ سکوتی ہی ہے لیکن بہر حال اس موقف کی تائید کرتا ہے جبکہ بعض دیگر حضرات اہل علم فرماتے ہیں کہ یہ ترتیب سور اجتہادی ہے، اس پر اجماع نقل کیا

گیا ہے یا کہئے کہ جمہور علماء کی رائے یہی ہے جن میں امام مالکؒ' قاضی ابوبکر باقلانیؒ اور دیگر کئی حضرات شامل ہیں، بعض دیگر اہل علم حضرات کی رائے یہ ہے کہ بعض سور کی ترتیب تو توقیفی ہے۔ اور بعض کی اجتہادی ہے، مختلف روایات اور بیشتر قرائن اس موقف کی تائید میں پائے جاتے ہیں، اولی یہی ہے کہ یوں کہا جائے: ترتیب سور بالفعل توقیفی ہے' بالقول توقیفی نہیں ہے اور بالفعل توقیفی ہونا' رسول کریم ﷺ کے فعل اور مصاحف عثمانیہ کی ترتیب پر مبنی ہے، اسی بناء پر بعض صحابہؓ کے درمیان اسی ترتیب میں اختلاف بھی منقول ہے، جیسا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے اپنے مصحف کو ایک خاص طرز پر مرتب فرمایا، بہرحال چونکہ کوئی واضح ارشاد نبوی اور نص صریح آیات مبارکہ کی ترتیب کے مانند' سورتوں کی ترتیب کے متعلق نہیں تھی، اس لئے اس ترتیب سوری میں کچھ اختلاف رائے رہا ہے، غور وتدبر کے بعد راقم کے قلب کا میلان اسی موقف کی طرف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اس مبارک رسالہ کی تالیف سے فراغت شب جمعہ ۱۸/رجب ۱۳۵۶ھ کو حاصل ہوئی، اسی سال جمادی الاولی کے اواخر میں اس رسالہ کی تالیف شروع کی گئی تھی۔

اے اللہ تو اس رسالہ کو میری طرف سے قبول فرما اور اس کو محض اپنی رضا کا وسیلہ بنا، اس رسالہ کو اے میرے مولی! اپنے مسکین اور عاجز بندے پر اپنے پاک کلام اور اپنی بابرکت کتاب مبین کے اسرار کی فتحیابی کا ذریعہ بنا اور غمگین بندے کے واسطے اپنے خفیہ خزانے سے بار بار کتاب کے علوم کی طرف راہنمائی کا ذریعہ بنا۔

اے اللہ کریم! قرآن عظیم کو میرے قلب کی بہار میری بصارت کے لئے نور، میرے غموں کی دوری اور میری پریشانیوں کا ازالہ بنا۔

اے اللہ میں تجھ سے تیری اس رحمت کا طلبگار ہوں جس کے ذریعے تو میرے قلب کی ہدایت فرمائے' میرے منتشر اور پراگندہ امور کو یکجا فرمائے، میرے خفیہ مقاصد کی تکمیل فرمائے، میری الفت مجھ کو لوٹائے اور مجھے ہر برائی سے محفوظ و مامون فرمائے۔

وصلى الله تعالى على سيّد المرسلين و إمام المتّقين
محمّد وآله وصحبه أجمعين آمين .يارَبّ العالمين ربّ
السّماوات والأرضين وربّ الأوّلين والآخرين.